مصورة

الامارات اللاتینیة فی سوریة

(بعد)

الحروب الصلیبیة الاولی

رسمہ الشیخ محمد فخر الدین المدرس بمدرسة المعلمین الناصریة

شام میں پہلی صلیبی جنگوں کے بعد لاتینی نشانات

پیش لفظ

ڈاکٹر زکی عبدالسلام مبارک (مرحوم) کم و بیش بیس بائیس کتب کے مؤلف و مترجم ہیں "الاخلاق عندالغزالی" جس کا اردو ترجمہ "غزالی کا تصورِ اخلاق" کے نام سے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے ان کا مقالۂ فضیلت ہے جسے انھوں نے جامعہ مصریہ میں پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی، چوں کہ اس کتاب میں انھوں نے غزالی کے فلسفۂ اخلاق پر نہایت شدید اور کڑی تنقید کی تھی لہٰذا علماء مصر کو جب اس کتاب کی تالیف کا علم ہوا تو وہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف بہت برہم ہوئے بالخصوص علماء ازہر کو انھیں یہ دیکھ کر نہایت سخت قلق اور رنج ہوا کہ ایک نوجوان جو برسوں تک ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کرتا رہا ہو اور طویل عرصے تک وہ بھی دوسرے ازہری طلبہ کی طرح غزالی کا شیفتہ و شیدا رہا ہو، حیرت ہے کہ جامعہ مصریہ میں پہنچ کر اس کے افکار اور آرا میں یکسر اتنی بڑی تبدیلی آجائے کہ وہ غزالی جیسی مقدس اور پرشکوہ و پرعظمت شخصیت کے خلاف نبرد آزما ہو جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف پر لاجیسا کہ کتاب کے آخر میں انھوں نے خود بیان کیا ہے، ڈاکٹریٹ کے لئے انٹرویو کے دن کئی علماء نے طرح طرح کے اعتراضات کئے اور ہر چند کوشش کی کہ وہ کسی صورت غزالی کے باب میں اپنے نظرئیے کی اصلاح کر لیں لیکن ڈاکٹر صاحب اپنی بات پر بضد رہے اور وہاں بھی غزالی کی تالیفات میں سے کئی ایسے جستہ جستہ اقتباسات پیش کئے جو ان کی رائے میں محلِ اعتراض تھے۔ آخر میں علماء نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اس کتاب کے طبع کرتے وقت ایسے مقامات حذف و خارج کر دیں جن میں انھوں نے غزالی پر شدید لب و لہجہ میں تنقید کی تھی نیز باقی کتاب کا عام لہجہ و انداز بھی مناسب و معتدل بنا لیں لیکن ڈاکٹر صاحب اس امر کے معترف

ہیں کہ وہ اُن کے مشورہ پر عمل نہ کر سکے بلکہ کچھ عرصہ کے بعد مزید اضافوں کے ساتھ کتاب کو بجنسہٖ شائع کر دیا۔

ہم اس بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتے کہ فریقین میں حق بجانب کون تھا ڈاکٹر زکی صاحب کہ جو ہر قدیم رائے و نظریہ کے مخالف اور ہر جدید کے پرستار و شیدا ہیں یا ازہری علماء کہ جن کے اذہان پر غفلت و جمود کی مہر لگی ہوئی ہے اور جو ہر قدیم فکر و نظر کے عاشق و شیدا اور ہر جدید نظریے کے قائل دشمن ہیں بلکہ یہاں ہم صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ غزالی کی تعلیمات پر نقد و تبصرہ کا اہل تنہا وہی شخص ہو سکتا ہے جس کا کام و دہن فلسفہ کے ساتھ مذہب و تصوف سے بھی لذت آشنا ہو، کتاب و سنت کے وہ احکام کہ جن پر مذہب کی بنیاد قائم ہے اُن سے کماحقہ آگاہ و باخبر ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن احکام کی تعمیل کی ایک گونہ جھلک بھی اُس کی ذات اور کردار میں موجود ہو کیونکہ مذہب کے وہ احکام جن کا تعلق علم سے زیادہ عمل سے ہے یا یوں کہئے کہ جن کا تقاضا صرف علم نہیں بلکہ اُن پر عمل پیرائیگی ہے اُن کے دروازے عمل ہی سے کھل سکتے ہیں اور ان کے صحیح معنی و مفہوم کا تعین بھی اُن پر عمل کرنے ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ایک چھوٹی سی بدی بڑی بدی تک اور ایک چھوٹی سی نیکی بڑی سے بڑی نیکی تک پہنچاتی ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ عمل کا دروازہ عمل ہی سے کھلتا ہے کسی مسافر کو سفر کے دوران و اثنا میں جن جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اُن کا علم اُسے اُن لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ ہوگا جنھوں نے گھر میں بیٹھ کر جغرافیہ کی بڑی بڑی ضخیم کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور جو جانتے ہیں کہ فلاں مقام کہاں واقع ہے اور اُس تک پہنچنے کے لئے کن کن دریاؤں اور کن کن بیابانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

غزالی تنہا فلسفی نہیں ہیں کہ ان کے آراء و نظریات کو پرکھنے کے لئے فلسفہ کی کسوٹی کام میں لائی جائے وہ تنہا صوفی نہیں ہیں کہ ان کی متصوفانہ موشگافیوں کو ناپنے کے لئے تصوف کا پیمانہ کام میں لایا جائے بلکہ وہ بیک وقت صوفی بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے تصوف اور فلسفہ کا باہم ایسا کیمیاوی امتزاج کیا ہے کہ ان کے مکتب میں تصوف کو فلسفہ سے یا فلسفہ کو تصوف سے جدا اور ممیز کرنا انتہائی مشکل امر ہے انھوں نے المنقذ من الضلال میں متعدد جگہ اس امر کی تصریح کی ہے کہ سینتیس یا اڑتیس برس کی عمر تک وہ حیرت و شک کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے رہے، انھوں نے حقیقت کی تلاش و جستجو میں تمام مذاہب و ادیان کا نہایت گہرا اور عمیق مطالعہ کیا سچ کی تلاش میں وہ شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ اور کو بہ کو پھرے اُس زمانے کے مکاتب فکر میں سے کوئی ایسا مکتب نہیں جس کا انھوں نے کمال دیانت داری اور صدق قلب سے

جائزہ نہ لیا ہو۔ اس تلاش و جستجو میں اُنھوں نے اپنی صحت تک خراب کر لی یہاں تک کہ معالجوں نے علاج
سے پوری مایوسی کا اظہار کیا لیکن آخر میں بقول اُن کے بارقۂ جذب الٰہی نمودار ہوا جس نے حقیقت کی
تلاش میں اُن کی اعانت و دست گیری کی وہ قدم جو منزل کے سراغ سے مایوس ہو کر ایک جگہ جم گئے تھے
ان میں دوبارہ حرکت کی لہر دوڑ گئی اور وہ منزل جس کے وجود و عدمِ وجود کا کل تک یقین نہ تھا آج دیکھا کہ وہ
بہ ہزار دلکشی و رعنائی کچھ تھوڑے ہی فاصلے پر جلوہ گر ہے اور مسافر کو دعوتِ وصول بلکہ کہنا چاہیئے کہ دعوتِ
وصال دے رہی ہے۔ ڈاکٹر زکی صاحب غزالی کے بارقۂ جذب الٰہی کا ہزار مذاق اڑائیں لیکن ہم سمجھتے ہیں
کہ غزالی کی یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور بالکل درست ہے اور ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ بعض اوقات
علوم ظاہری کے پشتاروں کے پشتارے کسی کی پیٹھ پر لدے ہوتے ہیں لیکن وہ جادۂ حق میں ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔

از منطق و حکمت نکشاید درِ محبوب　　اینہا ہمہ آرائشِ افسانۂ عشق است

بلکہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس راہ میں قدم اٹھانے کے لئے شرط اول یہ ہے کہ انسان فلسفہ و حکمت کے بارِ گراں
کو اپنے کاندھوں سے اتار پھینکے تاکہ سبک اور ہلکا ہو کر منزل کی طرف قدم بڑھا سکے۔

حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا　　ساقیا! از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

اگر ہمیں ان امور کا علم یا تجربہ و مشاہدہ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم ان کے وجود کا ہی
سرے سے انکار کر دیں۔ کیونکہ کسی شئے کے باب میں ہمارا عدم علم، عدم شئے کو مستلزم نہیں ہے۔ جب تک ہم
کسی کوچے سے واقف نہیں ہیں، اُس کی رسم و راہ ہماری سمجھ میں آنا محال ہیں۔

تا ترا باشد نہ حالے ہمچو من　　حالِ من باشد ترا افسانہ پیش

مگر معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کو مسلمانوں میں بالعموم جو عزت اور عظمت حاصل ہے وہ ڈاکٹر صاحب کو ایک
آنکھ گوارا نہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزالی کے فلسفۂ اخلاق پر تنقید کی بجائے ہر جگہ اُس کی تنقیص پر
زیادہ زور صرف کیا ہے مختلف ابواب میں غزالی کی تعلیمات سے ایک آدھ اقتباس نقل کرنے کے بعد آپے سے
باہر ہو کر ان پر برسنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ غزالی کے وضع کردہ تمام آداب تمام لوگوں کے لئے نہیں
بلکہ ان میں ہر گروہ اور ہر طائفہ کے لئے الگ الگ اور جداگانہ آداب ہیں۔ ان میں سے ایک ادب اگر ایک گروہ کے لئے
تریاق اور اکسیر کا حکم رکھتا ہے تو بعینہٖ یہی ادب دوسرے گروہ کے لئے زہر ہلاہل کا۔ میری رائے میں ڈاکٹر صاحب
کی ساری تنقید کا مدار اسی غلط فہمی پر ہے مثلاً جب وہ دیکھتے ہیں کہ غزالی بار بار توکل میں متوکل کو اس امر کی تلقین

کرتے ہیں کہ وہ گھر سے سفر کے لئے نکلتے وقت گھر میں ایک سوئی تک چھوڑ کر نہ جائے اور فرض کیجیے کہ کچھ چھوڑ کر گیا تھا اور واپس آکر دیکھا کہ وہ سب کا سب غائب ہے تو اُسے چور کو بجائے بددعا دینے کے دعا دینی چاہئے کیونکہ اُس نے متوکل کو اپنی اس حرکت کی بدولت صبر و شکر جیسی عمدہ فضیلت پر عمل کرنے کا موقع دیا ہے" تو جھنجھلا جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ کہاں کے اخلاق ہیں یہ کہاں کے آداب ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کو ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرنا چاہئے تھا کہ یہ ادب ہر مسافر کے لئے نہیں بلکہ مخصوصاً بلند پایہ متوکل مسافر کیلئے ہے ظاہر ہے کہ جہاں دونوں کے مقامات و درجات اور اخلاق و عادات میں بیّن اور واضح فرق و تفاوت ہے وہاں دونوں کے آداب و شروط بھی الگ الگ ہیں لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب صوری اور حسی زندگی سے ماورا کسی معنوی اور روحانی زندگی کے سرے سے قائل ہی نہیں وہ ایک لمحہ اور ایک ثانیہ کے لئے بھی اُن آداب و ظائف کا تصور نہیں کر سکتے جو صرفائے طریق نے سالکینِ راہ اور رہ سپارانِ جادۂ طریقت کے لئے وضع کئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے صدیوں قبل علامہ ابن رشد امام ابن تیمیہ حرانی اور امام ابن قیم جوزی وغیرہ نے بھی حجۃ الاسلام غزالی کے فلسفہ پر شدید نقد و جرح کی بلکہ اول الذکر نے تو ان کے فلسفی اور کلامی نظریات کے رد و ابطال میں تہافۃ التہافۃ تک لکھ ڈالی لیکن سبحان اللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم کے مقابلے میں علم صف آرا ہے لیکن ڈاکٹر زکی صاحب کو غزالی کے مقابلے میں دیکھ کر کیا کہوں کیا گمان گذرتا ہے۔ بہرکیف غزالی پر ڈاکٹر صاحب کی مفصل تنقید آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جہاں اس جام تلخ کو میں نے گوارا کر لیا ہے وہاں امید رکھتا ہوں کہ اس کا ایک جرعۂ تلخ آپ کا حلق بھی گوارا کر لے گا۔ اگر اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کو اور کوئی فائدہ نہ ہو تو کم سے کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ غزالی کے اخلاقی نظریات جو اُن کی مختلف تالیفات میں پھیلے اور بکھرے ہوئے ہیں وہ اس کتاب میں ایک جا اور مجتمع ہو کر آپ کے سامنے آجائیں گے۔

آخر میں میں اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "غزالی کا تصورِ اخلاق" کے آخری ابواب نہایت مفید اور بیش قیمت ہیں بالخصوص وہ ابواب جن میں ڈاکٹر صاحب نے غزالی اور جدید مغربی فلاسفہ کے فلسفیانہ نظریات کے مابین موازنہ و تقابل دکھایا ہے اور اس کے بعد مصر کے جدید اور روشن خیال علمائے کے غزالی کے بارے میں مؤیدانہ اور مخالفانہ نظریات کو نہایت بسط و تفصیل سے قلمبند کر دیا ہے۔ واللہ ولی التوفیق

نور الحسن خاں

پنجاب یونیورسٹی لاہور

pp 95, 143, 144-147

فہرستِ مضامین

ساتواں باب
فضیلت کی تعریف

آٹھواں باب
رذائل سے اجتناب

نواں باب

علوم و فنون اور تربیت

دسواں باب

حقوق و واجبات

گیارھواں باب

اپنے زمانہ و دور اور بعد میں غزالی کی شخصیت کا اثر

بارھواں باب

غزالی کے موافقین اور مخالفین

تیرھواں باب

غزالی اور جدید فلاسفہ کے مابین موازنہ

چودھواں باب

غزالی کے متعلق جدید علمار کی آرار

مقدمہ

از

(جناب ڈاکٹر منصور فہمی صدرِ شعبۂ فلسفہ جامعہ مصریہ (قاہرہ)

میں ابھی یہ کتاب لکھ کر کامیابی کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل بھی نہ کرنے پایا تھا کہ بعض خودغرض لوگوں نے میرے خلاف طرح طرح کی افواہیں اور غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلانا شروع کر دیں پہلے تو میرے بھی جی میں آیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دوں لیکن اُستاذِ فیلسوف ڈاکٹر منصور فہمی نے مجھے ایک خط لکھا جس میں معاندین کے ساتھ نرمی و شرافت اور عفو و درگذر سے کام لینے کی نصیحت و تلقین کی تھی۔ میں نہایت تشکّر و امتنان کے جذبات کے ساتھ ڈاکٹر صاحب قبلہ کا وہ گراں قدر اور قیمتی خط بجنسہٖ یہاں نقل کرتا ہوں اور اپنے خدا کے ساتھ عہد کرتا ہوں کہ جن امور کو میں حق و صواب سمجھوں گا، ساری زندگی صرف انھیں پر عمل پیرا رہوں گا۔ (مؤلف)

برادرِ عزیز!

آراء و افکار کی تاریخ میں بڑی بڑی شدید تنقیدیں ہماری نگاہ سے گذری ہیں۔ علما و فلاسفۂ اسلام نے ایک دوسرے پر نقد و جرح میں بعض اوقات اتنے غلو اور مبالغے سے کام لیا کہ یہ تنقید اپنے دائرے سے نکل کر مذمت اور ہجو کی المناک حد میں داخل ہو گئی لیکن بتائیے کہ اس تنقید سے منتقد علیہ

کو کوئی نقصان پہنچا؟ کیا اُس کے علم و فضیلت پر کوئی خفیف سے خفیف حرف بھی آیا؟ کیا واقعی لوگوں نے اس تنقید کی وجہ سے منتقد علیہ کو اپنی نگاہوں سے گرادیا؟ یاد رکھو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کیوں کہ تنقید بجز اس کے اور کیا ہے کہ حقائق کے واضح اظہار و بیان کا ایک نہایت عمدہ ذریعہ و وسیلہ ہے۔ اگر ناقد و باحث کی خوبی و کمال یہ ہے کہ اُس نے منتقد علیہ کی کچھ خامیوں اور لغزشوں پر لوگوں کو مطلع و آگاہ کیا ہے تو منتقد علیہ کی بڑی خوبی و فضیلت یہ ہے کہ وہ اس ناقد سے پہلے علم کے سرچشموں تک پہنچا اور اُن اُن مسائل کو اپنے غور و خوض اور نظر و فکر کا موضوع بنایا جو اس باحث و محقق کی بیداری کا موجب و سبب بنے۔

وہ متقدمین کہ جن کا اسلوبِ بحث و تحقیق اور اندازِ فکر و نظر ہم سے مختلف ہے ان کی تصنیفات کا مطالعہ کرتے وقت ہمارے لئے مناسب یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اُن ہی کے زمانہ و عہد اور ان ہی کے ماحول و گرد و پیش میں فرض کریں اور حقائقِ امور کی جستجو اور کھوج لگانے کے لئے جو جو وسائل انھوں نے اختیار کئے اُن پر نہایت عمیق اور غائر نگاہ ڈالیں تاکہ ہم اس امر کا صحیح اندازہ کر سکیں کہ وہ کیا کیا عوائق و موانع تھے جن کی وجہ سے حق و صواب کے چشمۂ صافی تک اُن کی رسائی ممکن نہ ہوئی۔

مجھے یہ تسلیم ہے کہ اگر کوئی شخص موجودہ زمانے میں بھی تیر و کمان یا گذشتہ زمانے کے دوسرے آلاتِ جنگ لے کر لڑائی کے لئے نکلتا ہے تو اس میں اور اس شخص میں یقیناً بہت بڑا فرق ہے جو موجودہ زمانے ہی کے مخترعہ آلاتِ حرب سے لیس ہو کر میدانِ جنگ کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ میں اس امر کو بھی مانتا اور تسلیم کرتا ہوں کہ تیل کے دیئے کی مدھم روشنی اور برقی قمقموں کی خیرہ کن اور ظلمت شکن روشنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن اے برادرِ عزیز! ستائش و نکوہش کا معیار آلات کی جدت و قدامت ہی نہیں بلکہ شجاعت و جراٴت مندی یا ثابت قدمی و پامردی بھی ہے۔ بجلی کے لطیف و شفاف قمقموں کی نسبت مٹی کے کثیف اور مدھم دیئے بھی ہمیں کچھ کم عزیز نہیں ہیں۔ کیا

کبھی غور نہیں کیا کہ آخر دونوں تاریکی کے پردے چاک کرتے اور دونوں نور کی چادریں
بچھاتے ہیں۔

اگر غزالی کا ہاتھ کسی حقیقت کے دامن تک پہنچنے سے قاصر رہا، اگر وہ اُن مسائل کے حل
کرنے میں عاجز رہے جنھیں ہم آج چٹکیوں میں حل کر لیتے ہیں، اگر ہمیں اُن کے نظریات میں کوئی
نقص یا بودا پن معلوم ہوتا ہے۔ تو قبل اس کے کہ ہم اُن پر مذمت و ملامت کی بوچھاڑ کرنا شروع
کریں ہمارا فرض ہے کہ اُن کے ظروف و احوال کا بغور مطالعہ کریں اور فہم و ادراک کے جو ذرائع
ان کو اس زمانے کے لوگوں کو میسر تھے اُن کا پورا پورا جائزہ لیں۔

متقدمین کا اکثر و بیشتر مدار و انحصار حافظہ و مذاکرہ پر تھا اور پھر مزید برآں یہ کہ وہ ایک ہی
وقت میں کئی موضوعات پر پڑھتے اور لکھتے تھے۔ کیوں کہ فنی تخصص یا تقسیم کار جو آج کے زمانے میں
عام اور رائج ہیں، ان کا گزشتہ زمانوں میں کہیں وجود و رواج نہ تھا۔ ساتھ ہی چونکہ وہ طلب علم
کو عبادت و طاعت سمجھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے لکھا پڑھا تو بہت لیکن چونکہ وقت بہت کم تھا اور
نیز اُن کے قوٰی بہت کمزور اس لئے انھوں نے جو کچھ مدوّن و مرتب کیا اس پر نظرثانی کا انھیں
موقع نہ ملا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں میں رطب و یابس اور کھری کھوٹی ہر طرح کی چیزیں
نظر آتی ہیں۔

موجودہ دور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ و مہذب نوجوانوں کی اس سے بڑھ کر اور کیا خدمت ہو سکتی ہے
کہ متقدمین کی کتب کا محنت سے مطالعہ کریں اور ان کی تعلیمات و مندرجات کا دقیق تجزیہ و
تحلیل کرنے کے بعد خطا و صواب کو ایک دوسرے سے الگ اور متمیز کر دیں۔

اس کام کا اہل اس جامعہ مصریہ کے فارغ التحصیل طلبہ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے جس کی بنیاد
جدید و قدیم کے وصل و ربط پر رکھی گئی ہے اور جس کا منتہائے مقصود اسی یہی ہے کہ خلف کو
سلف کے گنجینہائے علم سے تمتع و استفادہ پر آمادہ کیا جائے اور قدیم زمانے کے لوگ جن راہوں
میں ٹھوکروں کا شکار ہوئے ہیں اُن راہوں سے موجودہ نسل کو محفوظ و مصون بنایا جائے۔

جس شخص نے متقدمین کی کتب کے مطالعہ وبحث پر کمر باندھی اس نے یقیناً کچھ برا نہیں کیا
ر میں کہوں گا کہ وہ ایک حقِ واجب کی ادائیگی کے لئے کمر بستہ ہوا، کیوں کہ زندہ افکار و آرار کو
ندگی دوام بخشنے اور مردہ افکار کو موت کی ابدی نیند سلانے کا یہی واحد ذریعہ ہے اور نقدِ صحیح ہی
کا دگر آلہ و تدبیر ہے جس سے مشاعر و مدرکات کی تہذیب و اصلاح ہوتی اور عقول و ضمائر کو
شنی اور جِلا ملتا ہے۔

جو لوگ متقدمین کے ایسے دلدادہ و قتیل ہیں کہ فرطِ محبت وعقیدت میں ان کی لغزشوں
ر خامیوں کے سرے سے قائل ہی نہیں، وہ بھی حق وصواب سے اتنے ہی دور ہیں گا نہیں
نے کہ وہ لوگ، جو ان کو خامیوں اور عیبوں کا مجموعہ و پیکر سمجھتے ہیں کیوں کہ متقدمین بھی بہر حال
ری طرح انسان ہی تھے۔ اُن میں جہاں خوبیاں تھیں وہاں کچھ عیوب ونقائص بھی ضرور تھے
الح اور صحت مند تنقید کی نگاہ صرف ایک ہی پہلو پر نہیں بلکہ تمام پہلوؤں پر ہوتی ہے، اس کے
تھ میں ظلم وجور یا جنبہ داری وتعصب کی مہلک اور اندھی تلوار نہیں ہوتی بلکہ عدل وانصاف
ایک صحیح پیمانہ اور آنکھ پر ایک بے رنگ اور صاف عینک ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات
صنفین کی جن آرا میں بظاہر ایک تناقض واضطراب محسوس کرتے ہیں۔ ایک ناقد کی دقیقہ شناس
ر ہمہ گیر نگاہ اول وہلہ ہی میں ان سب آرا میں ایک گونہ تطبیق وتوفیق کی صورت نکال لیتی ہے
ر جو چیز ہیں کچھ دیر پہلے تک عام نگاہ میں بے جوڑ اور بے ربط معلوم ہوتی تھی اب منظم ومرتب
نداز سے کر ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ بنا بریں جو لوگ تنقید کے دشمن ہیں وہ فی الواقع تنہا
بینِ آرا ہی کے دشمن نہیں بلکہ تطبیق وتوفیق کے قیمتی اعمال وعواطف کے بھی دشمن و مخالف ہیں۔

عزیزِ محترم   مجھے علم ہے کہ تم نے غزالی کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا ہے، ان کی تعلیمات
نہایت عمدہ اور دقیق تحلیل وتجزیہ کیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے خطا کو صواب سے
ور غلط کو صحیح سے الگ اور تمیز کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مجھے حیرت اس امر پر ہے کہ

لوگ تم سے اس بارے میں الجھتے ہیں تو کیوں اُلجھتے ہیں؟ حالانکہ غزالی جہاں تعریف کے مستحق تھے تم نے ان کی تعریف کی جہاں ملامت اور مذمت کے لائق تھے تم نے اُن کی مذمت کی۔ کیا لوگوں کا خیال ہے کہ غزالی ایسے معصوم تھے کہ اُن سے کبھی کوئی لغزش ہو ہی نہیں سکتی تھی؟ یا تم ایسے نالائق اور پست ہمت تھے کہ غزالی جیسی ذات و شخصیت کی کسی لغزش و خطا پر مطلع و آگاہ ہونے کی اہلیت ہی نہ رکھتے تھے۔

میں جانتا ہوں کہ لوگ تمہارے خلاف جز بز اس لیے ہوتے ہیں کہ تم نے اُس ذات پر تنقید و تبصرہ کیا ہے جس کے گرد لوگوں نے حرمت و تقدس کا ایک حصارِ بلند قائم کر رکھا ہے۔ کاش وہ تم پر برسنے سے پہلے اس بات پر غور کرتے کہ تم نوجوان ہو اور نوجوان کا قلم بڑا منہ زور ہوتا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ جس نرمی و ملائمت کا انھوں نے تمھیں درس دیا ہے کاش وہی نرمی اور ملائمت وہ خود تمھارے بارے میں برتتے اور جتنا بُرا بھلا انھوں نے تمھیں کہا ہے اُس سے یکسر اور بالکلیہ باز رہتے۔

تمھاری کتاب نے ایک بہت بڑی جنگ کی بنیاد رکھی لیکن اللہ جانتا ہے کہ ہمیں اس سے ذرا بھر بھی ملال نہیں ہوا۔ کیوں کہ ہم حقیقت کے دوست اور خادم ہیں اور ظاہر ہے کہ حقیقت بجز بحث و تحقیق کے وجود میں نہیں آسکتی تمھیں یاد ہوگا کہ ہم نے تمھیں ہمیشہ حقیقت ہی کی خدمت و چاکری کی تلقین کی تھی پس جب تک تم محسوس کرتے ہو کہ تم حق و صداقت کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو تو زنہار اس سے کبھی نہ ہٹنا اور حق کی طرف سے دفاع میں ہمیشہ مصروف و مشغول رہنا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا کہ نرمی و شرافت کا سر رشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ پائے کیونکہ حق کی خدمت گذاری کے لئے حسن سلوک اور شرافت اخلاق سے بڑھ کر کوئی موثر و کارگر تدبیر نہیں۔

جس طرح تمہارا فرض ہے کہ جس بات کو حق و صحیح سمجھتے ہو اس پر سختی سے اڑ جاؤ اسی طرح تمہارا یہ بھی فرض ہے کہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ باطل سے الگ ہو جاؤ۔ کیوں کہ حق کی طرف عود و رجوع جہاں بہت بڑی خوبی اور فضیلت کی بات ہے وہاں باطل پر ضد و اصرار بہت بڑی گمراہی اور ضلالت کی بات ہے ولیس بعد الحق الا الضلال

دوسرے امور و ابحاث کے پہلو بہ پہلو تمھاری کتاب کے مطالعہ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ حریت رائے و فکر کی راہ میں بحمداللہ ہم کئی منازل طے کر چکے ہیں۔ اگرچہ ہمیں اس کے ساتھ اس امر کا رنج اور افسوس بھی ہے کہ ابھی تک دنیا میں ایسے تنگ اور گھٹے ہوئے سینے بھی موجود ہیں جن کو اہل علم کی کھلی اور صاف ہوا ہرگز راس نہیں۔ لہذا بہتر یہی تھا کہ تم ان لوگوں کی تنگ حوصلگی اور تنگ ظرفی پر رحم کھا کر ان سے نرمی ہی کا سلوک کرتے کیوں کہ تم جانتے ہو کہ دنیا میں پرانی لکیر کے فقیر زیادہ اور آزاد و روشن خیال لوگ بہت کم ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی و مسرت ہوئی کہ تمھاری یہ گراں قدر کتاب دنیائے نقد و تحلیل میں وہ پہلی کتاب ہے جس نے اسلامی آرا و نظریات کی تاریخ کو مناسب نقد و تنقیح کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا۔ اور مجھے قوی امید ہے کہ جس راہ میں تم نے قدم اٹھایا ہے اس پر ہمیشہ چلتے رہو گے اگرچہ مجھے اس امر کا دلی رنج ہے کہ جس درسگاہ نے تمھیں جامعہ مصریہ میں داخل ہونے کے لیے تیار کیا تھا، وہی آج تمھاری دشمن ہو گئی ہے لیکن عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کریں کہ اہل ازہر کی یہ پہلی بے ہودگی نہیں بلکہ اُن کا ہمیشہ سے یہ وتیرہ و شعار رہا ہے کہ جس شخص نے بھی کبھی آزاد آرار و افکار کا اظہار کیا اُسے اُنھوں نے ہمیشہ کافر و ملحد کہا ہے لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ جدید آرا کے متبعین و پرستار ازہریوں کو جہل اور قدامت کا طعن دیتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دونوں گروہ جادۂ وسط و اعتدال سے بمراحل بعید دور ہیں۔

جب مجھے اس کا حق پہنچتا ہے کہ تمھیں مشورہ دوں بلکہ میرا فرض ہے کہ ایسا کروں تو میں تمھیں اس بات کی نصیحت و تلقین کروں گا کہ جہالت و گمرہی کے خلاف ہمیشہ جہاد کرتے رہو لیکن اپنے اساتذۂ ازہر کا ہمیشہ احترام کرو کیوں کہ تم سب علم و دانش کے طالب و جویا ہو، حق کے خادم و چاکر ہو۔ اور تمھاری جدت و قدامت میں صلح و صفائی ہو جانا کوئی مشکل اور محال امر نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ ترقی پسندوں اور جدت پرستوں کو اس بات کی ہمت و توفیق کبھی نہ ہوئی کہ وہ قدامت پرستوں کو حسنِ سلوک اور نرمی و شرافت سے اپنے ساتھ ملانے اور متحد کرنے کی کوشش و

سعی کریں لیکن تم بحمد اللہ ازہر اور دوسری دینی درس گاہوں کے تربیت یافتہ و خوشہ چین ہو۔ تمہارا فرض تھا کہ ازہر کے علماء و اساتذہ اور ازہری احباب و رفقاء سے کبھی نہ بگاڑتے، اگر تمہیں اُن سے کہیں اختلاف رائے تھا تو نہایت سنجیدگی اور متانت اخلاق سے اس کا اظہار کرتے تاکہ جدید و قدیم کے مابین تطبیق و توفیق اور وصل و ربط پیدا کرنے کے لئے تم سب لوگوں کا برابر حصہ ہوتا۔

اے عزیز! ـــــ تمہارے بارے میں میں ہمیشہ خائف رہتا ہوں تمہاری تصنیف کے بعض حصے پڑھ کر عوام نے جو تمہارے خلاف ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا کیا تھا، اس کا سارا منظر اب تک میری نگاہوں کے سامنے پھر رہا ہے لیکن یاد رکھو ان مخالفتوں سے کبھی نہ گھبرانا، تمہاری علمی زندگی کا آغاز ایک بہت بڑے حزنیئے سے ہوا ہے، جو اس امر کی قوی اور بیّن دلیل ہے کہ تم تہذیب و اصلاح کے داعی ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کے سامنے سُرخ رو ہونے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔

والسّلام
منصور فہمی

مؤلف ـــــ میں یہاں حضرت استاذ جناب ڈاکٹر منصور فہمی کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں اور انہیں اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ علمائے ازہر اور میرے درمیان محبت و مودت کا جو مضبوط رشتہ قائم ہے اُسے زمانے کا ہاتھ کبھی فنا نہیں کر سکتا۔ میں جب تک زندہ ہوں اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ جناب شیخ وجوی، جناب شیخ لبان، جناب شیخ ظواہری جناب شیخ زنکلونی، جناب شیخ حسین نوالی اور جناب شیخ سید مرصفی جیسے اساتذۂ کرام کا میری ذات پر بہت بڑا احسان ہے اگر کبھی خدانخواستہ وہ تمام رشتے جو میرے اور ازہر کے مابین ہیں وہ سب منقطع ہو بھی جائیں، تو بھی نہ میں اس کو بھول سکتا ہوں نہ دنیا فراموش کر سکتی ہے کہ میں اساتذۂ ازہر کے احسانات کا زیر بار ہوں اور میرا اُن کی مخالفت کرنا ایک گونہ نافرمانی اور

حسد و کید کی کوئی قیمت و وقعت سمجھتے یا حقیر و بیمار دل و دماغ کے لوگوں کی یاوہ گوئی اور ژاژ خائی کو خاطر میں لاتے ہوں مجھے اگر رنج و غم ہے تو صرف اس بات کا کہ اس قسم کے جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے سے میرے احباب و رفقاء کو تکلیف اور اذیت پہنچتی ہے۔

لیکن بحمد اللہ میں پہلا شخص نہیں جس کو کفر و الحاد کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا نشانہ ہدف بننا پڑا ہو، بلکہ غور کیجیے خود غزالی رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم شخصیت کو بھی اسی مرحلے سے دوچار ہونا پڑا تھا! اور جتنی تکالیف و مصائب اس راہ میں مجھے پہنچیں اُس سے کئی گنا زیادہ خود غزالی کو سہنا پڑی تھیں، چنانچہ ایک مقام پر اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں :۔

برادر مشفق اسرار معاملات دین میں میری بعض تصانیف پر لوگ جو گرفت و طعن کرتے اور کہتے ہیں کہ ان میں بعض باتیں متقدمین و ائمہ متکلمین کے مسلک و مذہب کے خلاف ہیں اور ان کی رائے میں اشعری کے مذہب سے سرِ مو تجاوز و انحراف گمراہی و خُسران کے مرادف ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کی بے سر وپا اور بے بنیاد باتوں سے تم مغموم اور کبیدہ خاطر رہتے ہو، لیکن عزیز گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہر حال میں صبر اور برداشت سے کام لینا چاہیئے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ قابل ذکر شخصیتوں پر ہر زمانہ و ہر دور میں طرح طرح کی تہمتیں لگائی گئی ہیں، اور حاسدوں نے ان کے خلاف کفر و الحاد اور معلوم نہیں کن کن باتوں کے احکام و فتاویٰ صادر کیے ہیں، تم غور کرو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حق و صداقت کا داعی و علمبردار کون ہو سکتا ہے لیکن آپ کے متعلق بھی العیاذ باللہ لوگوں نے کہا دیوانہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام سے بڑھ کر کون سا کلام سچا ہو سکتا ہے لیکن اس کے متعلق بھی کہا گیا "پرانے لوگوں کے قصوں اور کہانیوں کا مجموعہ و مرقع ہے"۔ تم ان معاندین سے ہرگز نہ الجھو۔ اگر تم نے انھیں منوانے اور قائل کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھو اپنا وقت ضائع کرو گے۔ تمہاری نیکی کی ہر آواز ان کے معاملے میں صدا بصحرا ثابت ہوگی، کیا تم نے شاعر کا یہ قول نہیں سنا۔

كل العداوة قد ترجى ازالتها الا عداوة من عاداك عن حسد[۵]

اگر کسی داعی کو ان لوگوں کی ہدایت و نیکی کی تھوڑی سی بھی توقع و امید ہوتی تو حق و صداقت کے داعیوں کے سرتاج و سرخیل پر یاس و ناامیدی کی آیات کبھی نہ اتریں۔ کیا تم نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ قول کبھی نہیں پڑھا۔ (وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ) اور (وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ لَقَالُوْا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ) اور (وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ) اور (وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝)

لیکن اس کے بعد غزالی حجۃ الاسلام قرار پائے۔ ہم نہیں چاہتے کہ غزالی کی طرح لوگوں کے امتحان و آزمائش کا موضوع و عنوان بنیں۔ ہمارے لئے تو فقط اتنا ہی غنیمت ہے کہ مفسدہ پردازوں کی زد سے بچ کر نکل جائیں۔

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ۔

محمد زکی عبدالسلام مبارک

---

[۵] ہر عداوت کا علاج ممکن ہے الا عداوتِ حسد کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔

پہلا باب

غزالی کا عصر و دور

میں چاہتا ہوں کہ غزالی کے زمانہ و عہد کے متعلق ابتدا ہی میں چند ضروری ضروری باتیں بیان کر دوں اس لئے نہیں کہ غزالی اپنے زمانے کی سچی اور ہو بہو تصویر ہیں بلکہ اس لئے کہ تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ وہ اپنے زمانے سے کس حد تک متاثر ہوئے اور کس حد تک اپنی ذات و شخصیت سے اُس کو متاثر کیا کیوں کہ کسی دور کا صرف اس لئے مطالعہ کرنا کہ اُس میں کون کون فلاسفہ، ادبار یا شعرار گذرے ہیں محض بے کار ہے۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ سب سے پہلے کسی دور کی کسی خاص شخصیت کو بحث و مطالعہ کے لئے مخصوص و منتخب کرلیں اور اس کے بعد اُن موثرات و عوامل کی تلاش و جستجو میں نکلیں جنھوں نے اس شخصیت کی تکوین و تعمیر کی۔ ممکن ہے کہ یہ موثرات بعض اوقات نزدیک کے ہوں اور بعض اوقات دُور کے۔

اس امر کی مزید وضاحت و تفصیل کے لئے میں عرض کروں گا کہ جناب محترم ڈاکٹر طٰہٰ حسین صاحب نے ابوالعلار کے زمانہ و دور کا اس غرض اور اس مقصد سے مطالعہ کیا کہ تاکہ اُن اصول و کلیات کا پتہ و سراغ لگا سکیں جنھوں نے ابوالعلار کو زندگی کے بارے میں ایک خاص نقطہ نگاہ

اختیار کرنے کے لئے مجبور کیا۔ پھر ڈاکٹر صاحب موصوف نے جب ابو نواس کا مطالعہ شروع کیا تو اس میں بھی بعینہٖ یہی طریق کار برتا لیکن ان تمام امور کے باوجود غالباً ڈاکٹر صاحب کو اس امر سے انکار نہ ہوگا کہ ابوالعلا ہی کے دور نے بعض ایسی شخصیتیں بھی پیدا کیں جن کا اسلوب زندگی اور انداز فکر دونوں ابوالعلا سے یکسر اور بالکل مختلف تھے۔ اسی طرح ابو نواس کے دور میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو ہزل وابتذال اور البیلے پن کو شدید نفرت وحقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ سب سے پہلے فلاسفہ، ادبا اور شعراء کے آثار و باقیات کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد اس بات پر غور و توجہ کریں کہ ان آثار و باقیات کے اسباب وعوامل کیا کیا ہو سکتے ہیں جس طرح ممکن ہے کہ یہ ایسے مطالعہ کا نتیجہ وحاصل ہوں کہ جس کو مبحوث عنہ دور سے دور کا بھی تعلق وربط نہ ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بعینہٖ اسی دور کی پیداوار ہوں ورنہ غور فرمائیے کہ باوجودیکہ شیخ محمود خطاب سبکی ہر برس طلبہ کی ایک ایسی بڑی کھیپ تیار کرتے ہیں جن کا کسی کو علم تک نہیں لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ شیخ موصوف موجودہ زمانے کی صورت ومثال ہیں۔ شیخ سبکی کی طرح کے دوسرے لوگوں کی بھی کچھ کمی نہیں لیکن ہم نے ان کی تخصیص صرف اس لئے کی ہے کہ کثرتِ تصنیفات کی وجہ سے یہ معاصرین میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں اگر کل کوئی باحث ومحقق تاریخ کے گوشوں میں ان کا مطالعہ کرتا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سبکی کے زمانہ و دور کا مطالعہ اس لئے کر رہا ہے کہ اُن مؤثرات وعوامل کے او پر سے پردہ اُٹھا سکے جنھوں نے شیخ موصوف کے عقل وذہن کی تعمیر کی یقین جانیئے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ خود سبکی کے سامنے اگر آپ اُن ہی کے زمانے کی باتیں کریں تو وہ دنگ رہ جاتے ہیں۔

زمانہ و دور اور ماحول وگرد وپیش کے اثرات بلا شبہ مسلّم ہیں لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ ہر زمانے میں بعض لوگ صرف جسم وصورت کے اعتبار سے اس زمانے کے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ روح ومعنی کی وجہ سے نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کے احساسات ومیلانات اپنے زمانے کے

لوگوں سے زیادہ اُن لوگوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ جو ان سے صدیوں پہلے گزر چکے ہیں مثلاً جس طرح مصر میں آج ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو اپنے آرار وافکار کی وجہ سے ٹھیک اسی دور کے معلوم ہوتے ہیں وہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ جو اپنے عقائد ونظریات کی وجہ سے تیسری یا ساتویں صدی کی مخلوق میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ اتنا صاف اور واضح ہے کہ اس کے لئے مزید مثالوں کی ضرورت وحاجت نہیں۔

غزالی کے زمانے کے حالات کو میں نہایت اجمال واختصار کے ساتھ بیان کروں گا اور صرف اُن ہی باتوں کے ذکر وبیان پر اکتفا کروں گا جن کی وجہ سے آپ کو اُس زمانے کا عام نقشہ معلوم ہو جائے تاکہ آپ غزالی کے زمان ومکان کو بآسانی متعین کر سکیں اور اُن کی فکری زندگی میں ہم جن امور کا حوالہ دیں وہ بآسانی آپ کے ذہن نشین ہو سکیں۔ کیونکہ اس کتاب سے مقصود صرف اخلاق کے باب میں غزالی کی آرار کو بالتفصیل بیان کرنا ہے اُن کے زمانے کی مفصل تاریخ مرتب کرنا نہیں۔

پہلی فصل

دَولتِ سلجوقیہ

(۱)

یہاں ہمارا مقصود اس ترک خاندان کے اکثر ممالکِ اسلامیہ پر غلبہ واستیلا کے وجوہ و اسباب کو بیان کرنا نہیں ہے اس لیے کہ یہ امر یہاں بالکل بے کار اور بے ضرورت ہے ہمیں یہاں اس عظیم الشان حکومت کا فقط ایک مجمل ومختصر سا خاکہ آپ کے سامنے رکھنا منظور ہے، کیونکہ غزالی اسی حکومت ومملکت کے زیر سایہ پیدا ہوئے، پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔

جنابِ محترم محمد خضری بک نے جامعہ مصریہ کے لیکچروں میں بیان کیا ہے کہ سلاجقہ کا خاندان

پانچ مختلف شاخوں میں منقسم ہوا۔ اول سلاجقۂ عظمیٰ جن کے زیر نگیں خراسان، رے، جبال، عراق جزیرۂ فارس اور اہواز آئے۔ دوم سلاجقۂ کرمان، سوم سلاجقۂ عراق، چہارم سلاجقۂ شام پنجم سلاجقۂ روم۔

سلاجقۂ عظمیٰ ـــــ اس کا بانی رکن الدین ابو طالب طغرل بک ہے۔ اس خاندان کی مدت حکومت ۴۲۹ھ سے ۵۲۲ھ تک یعنی کل ۹۳ برس ہے۔ اور اس کا خاتمہ شاہان خوارزم کے ہاتھوں ہوا۔

سلاجقۂ کرمان ـــــ اس خاندان کا مورث اعلیٰ الپ ارسلاں کا بھائی قاروت بک بن داؤد بن میکائیل بن سلجوق ہے۔ اس خاندان کی کل مدت حکومت ۴۳۳ھ سے ۵۸۳ھ تک یعنی ۱۵۰ سال ہے اور اس کا خاتمہ ترکمانوں کے ہاتھوں ہوا۔

سلاجقۂ عراق وکردستان ـــــ ان کی حکومت کی بنیاد ۵۱۱ھ میں پڑی اور ۷۹ برس بعد ۵۹۰ھ میں شاہان خوارزم نے اس کی حکومت کا چراغ گل کیا۔

سلاجقۂ شام ـــــ اس خاندان کا موسس تتش بن الپ ارسلاں بن داؤد بن میکائیل بن سلجوق ہے۔ اس خاندان کی حکومت کی ابتدا ۴۸۷ھ میں ہوئی اور ۲۴ برس بعد ۵۱۱ھ میں دولت نوریہ اور دولت ارتقیہ کے ہاتھوں موت وفنا کا جام پیا۔

سلاجقۂ روم یعنی سلاطین قونیہ واقصرا ـــــ اس خاندان کا بانی قطلمش بن اسرائیل بن سلجوق ہے۔ ان کی حکومت کا آغاز ۴۷۰ھ میں ہوا۔ اور ۲۳۰ برس بعد ۷۰۰ھ میں عثمانیوں اور مغلوں نے اس کا خاتمہ کیا۔ سلاجقہ کی تمام شاخوں میں صرف اسی شاخ کو اتنی بڑی مدت کی عمر نصیب ہوئی۔

سلاجقہ کی مذکورۃ الصدر شاخوں میں سے سلاجقۂ عظمیٰ اور سلاجقۂ عراق کو حکومت عباسیہ سے ایک گونہ خاص ربط وتعلق ہے کیونکہ ۴۴۷ھ سے ۵۹۰ھ تک یعنی کامل ۱۴۳ برس تک بغداد انھیں کے زیر نگیں رہا اور خلفائے بنی عباس انھیں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہے۔

سلاجقہ کے عہد حکومت میں یکے بعد دیگرے نو عباسی خلفا تخت خلافت پر بیٹھے جن میں سے پہلا القائم بامر اللہ ہے جس کے عہد خلافت میں آل بویہ کا دور حکومت ختم ہوا اور آخری الناصر لدین اللہ ہے جس کے عہد میں خود سلاجقہ کی حکومت تاخت و تاراج ہوئی۔

(۲)

سلاجقہ عظمیٰ کے اکثر ملوک و سلاطین غزالی کے ہم عہد و ہم عصر ہیں۔ مثلاً عضد الدین ابو شجاع الپ ارسلان، جلال الدین ابو الفتح ملک شاہ، ناصر الدین محمود، رکن الدین ابو المظفر برکیا روق رکن الدین ملک شاہ ثانی اور محمد بن ملک شاہ کے مختلف عہدوں کو غزالی نے بچشم خود دیکھا۔

طغرل بک جس نے بغداد پر قبضہ کیا اور خلیفہ سے اس کی راہ و رسم اس قدر بڑھی کہ خلیفہ نے اس کی بھتیجی سے شادی کی۔ اور طغرل بک نے بھی چاہا کہ عباسی خاندان میں نکاح کرے (حالانکہ غیر عباسی کے ساتھ عباسیوں کا رشتہ و عقد کی اس سے پہلے کوئی مثال نہ تھی) چنانچہ ۴۵۳ھ میں اس نے خلیفہ کی بیٹی کا خطبہ کیا اور کافی مدت کی لیت و لعل کے بعد کامیاب ہوا۔ غزالی اسی کے عہد کے آخر میں پیدا ہوئے۔

دولت آل سلجوق کے تمام سلاطین و ملوک میں الپ ارسلان گل سرسبد کا حکم رکھتا ہے۔ مدارس نظامیہ جن کا آگے چل کر ہم مفصل تذکرہ کریں گے اور جن کا غزالی کی ذات پر بہت بڑا اور ناقابل فراموش احسان ہے۔ الپ ارسلان ہی کے دور حکومت میں قیام و وجود میں آئے رہا محمد بن ملک شاہ، سو اس کے متعلق تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ غزالی نے التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک اسی کی خاطر لکھی تھی۔

ہمارے مطلب کے لیے یہاں سلجوقیوں کا اتنا ہی سا مختصر ذکر غالباً کافی ہوگا

دوسری فصل

فرقۂ باطنیہ

سلاجقہ کی وہ مختلف شاخیں جن کا حال ہم نے گذشتہ فصل میں بیان کیا ہے جب اپنی حدودِ سلطنت فارس عراق اور جزیرہ روم تک وسیع کر رہی تھیں تو بعینہٖ اسی وقت فاطمیوں کا خاندان مغرب اور مصر پر قابض ہونے کے بعد اپنے مبلغین کی بدولت مشرق کی طرف قدم بڑھانے کے لئے منصوبے تیار کر رہا تھا مجھے یہاں فرقہ باطنیہ کی دعوت و تبلیغ کے متعلق اجمالاً کچھ بیان کرنا ہے اس لئے کہ غزالی نے اس فرقے سے بہت کچھ تعرض کیا ہے اور ان کے رد میں خاصی خامہ فرسائی کی ہے یہ اور بات ہے کہ اس باب میں غزالی کی تحریریں ہم تک نہیں پہنچ سکیں اور عنقریب جب ہم غزالی کی تالیفات سے بحث کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ خود غزالی کو فرقہ باطنیہ کی طرف میلان کے ساتھ صرف اسی لئے متہم ہونا پڑا کہ انھوں نے اس فرقہ کا رد کرتے ہوئے ان کے افکار و عقائد کو اس عمدگی اور سلاست کے ساتھ بیان کیا کہ لوگوں کے لئے اس فرقے کے آراء و نظریات میں بجائے خود ایک گونہ جاذبیت اور کشش پیدا ہو گئی۔

میں یہاں اس امر کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ معتقدات و افکار جو آج بھی عام مسلمانوں کے اذہان و قلوب پر مستولی ہیں وہ بھی اکثر و بیشتر انھیں مختلف نظریات کی صدائے بازگشت ہیں جن کی تبلیغ عباسیوں نے مشرق میں اور فاطمیوں نے مغرب میں کی تھی كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ.

حقیقت یہ ہے کہ یہ مبلغین نہایت عیار تھے وہ عوام کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے وہ جانتے تھے کہ خالی الذہن اور سادہ لوح لوگوں کو خرافات، کلپترہ گوئی اور گمراہ کن پروپیگنڈے سے کیونکر رام کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ اسی زمانے پر کیا موقوف ہے، خود دیکھئے آج بھی قاہرہ چھوٹے چھوٹے بتوں اور مورتیوں کا ایک بڑا معبد اور بتکدہ ہے، جہاں حضرت حسین، حضرت زینب،

حضرت فاطمہ علیہم السلام اور دوسرے اولیاء اللہ بتوں کی طرح پوجتے ہیں اور یہ سب کچھ اسی پروپیگنڈے کا لازمی نتیجہ اور اثر ہے جس کا زہر فاطمیوں نے اپنے عہد حکومت میں پھیلایا تھا۔

اگر طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو ہم پروپیگنڈے کے وہ تمام طرق بیان کرتے جو باطنیہ نے اپنی دعوت و تبلیغ کے لیے اختیار کئے اور جن کے سامنے موجودہ زمانے کے تمام وہ ہتھکنڈے بے کار اور ہیچ ہیں جنھیں انگریز، فرانسیسی اور امریکی اقوام آئے دن استعمال کرتی رہتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ باطنیہ کے رسوا کن مزعومات کا امت مسلمہ کے عقول اور اذہان کو مسخ کرنے میں بڑا ہاتھ ہے اور ان ہی مزعومات کی وجہ سے اس امت مظلومہ کو ایسے ایسے حوادث و مصائب کا سامنا کرنا پڑا جن کی نظیر گذشتہ تاریخ میں مفقود ہے۔ سب سے پہلے مسلم قوم جہالت کا شکار ہوئی اور پھر اس جہالت و کوری نے اس کے لاشے کو عباسیوں اور فاطمیوں کے سامنے لا ڈالا جس پر ان ستمگاروں میں سے کسی نے بھی رحم اور ترس نہ کھایا۔

فرقہ باطنیہ کے مبلغین بکمال عیاری اور چالاکی سے ایک سادہ لوح مسلمان کو آہستہ آہستہ گمراہ کرتے اور اسے یقین دلاتے کہ سب سے بڑی مصیبت و آفت جو مسلمانوں کے باہمی شقاق و افتراق کا باعث ہوئی اس کی محض وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اُن ائمہ شریعت کا اتباع اور پیروی ترک کردی جو دینِ محمدی کے اسرار و رموز کے واقف و آشنا تھے اس لئے کہ شریعتِ محمدی ان سطحی مسائل و علوم سے عبارت نہیں جنھیں ہر کہ و مہ سمجھتا اور جانتا ہے بلکہ یہ اُن مخصوص اور غامض اسرار و رموز کے مجموعے کا نام ہے جن کی تعلیم و معرفت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعض ائمہ معصومین یا ملائکہ مقربین یا انبیاء مرسلین کو مخصوص کر لیا ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اُس سادہ لوح اور سادہ دل مسلمان کے سامنے اپنے نظریات رکھتے جن میں سے بعض کا تعلق ان کے مزعومہ ائمہ معصومین کی عصمت و تقدیس سے اور بعض کا تعلق براہ راست ان کی سیاسی تنظیم و دعوت سے ہوتا

مشرق میں اس فرقے کا سب سے بڑا اور مشہور داعی حسن بن صباح تھا جو مصر میں جا کر خلیفہ

مستنصر سے ملا اور وہیں فرقہ باطنیہ کے اصول و مبادی سے آگاہی حاصل کی اور پھر قزوین میں آکر تیغ و قلم سے اس مذہب کی نصرت و حمایت کی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا اقدام یہ کیا کہ قلعۃ الموت پر قابض ہو کر اپنے آپ کو ہر طرف سے اچھی طرح محفوظ و مصئون کر لیا اور پھر بلاد فارس میں اپنے قدم جمانے شروع کیے۔ یہاں تک کہ اس کی قوت و ہیبت کے تصور سے ہر شخص کانپنے لگا اور آخر کار سلاجقہ اور اس کے مابین نہایت خونریز معرکے ہوئے۔

اس فرقے کے متعلق مزید معلومات کے لئے مختلف کتب تاریخ کی طرف بالعموم اور عبد الکریم شہرستانی کی مشہور عالم تصنیف "الملل والنحل" کی طرف بالخصوص رجوع کرنا چاہیے کیونکہ ان کے مذہبی معتقدات عجب چوں چوں کا مربہ ہیں اور غزالی نے اپنی تصانیف میں کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے اور بالخصوص فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ میں تو جی بھر کر ان کا رد کیا ہے۔

تیسری فصل

صلیبی جنگیں

(۱)

آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ سلاجقہ کی حدود سلطنت مملکت روم میں قونیہ اور اقصرا وغیرہ تک پھیل چکی تھی اور سلاجقہ اور فاطمیوں کے مابین سیاسی رقابت منتہائے اوج پر تھی لہذا اب آپ کے لئے یہ سمجھنا چنداں مشکل نہیں کہ وہ کیا اسباب و علل تھے جن کی بنا پر قیصر روم نے نصاریٰ کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ ظاہر ہے کہ قیصر روم ان دونوں خاندانوں کی باہمی چشمک اور رقابت کی وجہ سے ہر طرح محفوظ تھا اور مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لئے ایسا بیش بہا اور نادر موقع اسے ہاتھ آیا جسے دانشمند ارباب قوت و سلطنت کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے۔

قیصر روم نے انتہائی منت و سماجت کے ساتھ نصاریٰ کے پیشوائے اعظم سے درخواست

کی کہ اُس کو سلاجقہ کی دست برد سے بچائے۔ پیشوائے اعظم کو مغربی ممالک پر اپنی سیادت اور مذہبی اثر و نفوذ قائم کرنے کا بہترین موقع ملا۔ چنانچہ اُس نے عیسائیت کی طرف سے دفاع اور بیت المقدس کی بازیابی کے نام پر تمام نصاریٰ کو مسلمانوں کے مقابل صف آرا کر دیا۔

میں یہاں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سیاسی شخصیتیں ہمیشہ عوام کے امیال و عواطف کو اپیل کر کے خود ذاتی فائدہ اُٹھاتی رہی ہیں۔ اس کلیے سے صلیبی جنگوں کے مبلغین کیوں کر مستثنےٰ ہو سکتے تھے چنانچہ انھوں نے بھی حقیقت و واقعہ پر سیاسی نقاب ڈال کر مسلمانوں کے ظلم و ستم کی داستانیں وضع کیں اور جی بھر کر پروپیگنڈا کیا کہ مشرق میں نصاریٰ مسلمانوں کے ہاتھوں ظلم و استبداد کا شکار ہیں اور اس طرح تمام یورپ کو مسلمانوں کے خلاف اُکسانے اور بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذہب جہاں حساس اور طاقتور قوموں کے ہاتھ میں تیغ برّاں کا حکم رکھتا ہے وہاں اس کی حیثیت کمزور اور بے حس اقوام کی گردن میں طوق ذلّت سے زیادہ نہیں، غور کیجیے کہ اگر مسلمان ابتدا میں مذہب اور دین کی وجہ سے تمام دنیا پر چھا گئے تو آخر میں ساری ذلتیں اور رسوائیاں بھی انھیں مذہب ہی کی بدولت اُٹھانا پڑیں۔ اس لئے کہ ایک بالغ النظر اور مآل اندیش، دین کی بدولت اگر ایک طرف دنیا کی ساری راحتیں اپنے گرد جمع کر لیتا ہے تو دوسری طرف آخرت کی سعادتوں کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مگر اس کے برعکس ایک کوتاہ اندیش اور کمزور و ناتواں فرد اپنے ضعف و بے چارگی ہی کو مذہب کا نام دے کر اپنے آپ کو اس کی دلدل میں پھنسا کر زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

جب شیاطینِ مغرب مذہب کی آڑ لے کر آہستہ آہستہ مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے عین اُسی وقت مسلمان جمعہ کے دن مساجد میں جمع ہو ہو کر اپنے بخت خفتہ کو جگانے اور اپنے سے ذلت و نکبت کو دور ہٹانے کی سعی میں مصروف تھے مگر یہ تمام کوششیں اور محنتیں اکارت گئیں جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ

مذہب اپنے قدموں پر نہیں بلکہ ان لوگوں کے سہارے کھڑا ہوتا ہے جو اپنے اندر ملک گیری کا بے پایاں جذبہ اور زندگی کا بے پناہ عشق اور ولولہ رکھتے ہیں ورنہ مجھے بتائیے کہ خاندانِ فاطمی جو خاندانِ نبوت ہونے کا مدعی ہے، اُس کے آنکھوں دیکھتے نصاریٰ دنیائے اسلام پر آناً فاناً کیسے چھا گئے اور وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔

حکومت، برتری اور زندگی و بقا یہ ہیں زندہ و خوددار قوموں کا مطمح نظر اور نصب العین اگر مذہب ان امور کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو واقعی مذہب اللہ کی بہت بڑی رحمت اور بہت بڑا انعام ہے مگر اس کے خلاف فرض کیجیے کہ اگر مذہب دنیائے انسانیت کو قعرِ ذلت اور وادی ضلالت میں ڈھکیلتا ہے تو وہ مذہب مذہب نہیں بلکہ حقیقت میں احبار و رہبان یا انھیں کے قماش کے شریر نفوس کی خود ساختہ بدعت و گمرہی ہے۔ اگر ہماری بات کا یقین نہ آئے تو کتب تاریخ کی ورق گردانی کر کے دیکھ لیجیے۔

بعد ازاں صلیبی حملہ آوروں نے مسلمانوں کے اکثر علاقے فتح کر کے ایشیائے کوچک اور شام میں اُن لاطینی قوموں کے نام پر جو ان صلیبی جنگوں میں شریک تھیں مختلف چھوٹی چھوٹی لاطینی ریاستیں قائم کر لیں۔ اس قسم کی سب سے پہلی ریاست وادی فرات کی رُہا نامی ریاست ہے جو ۴۹۰ھ (۱۰۹۷ء) میں قائم ہوئی۔ دوسری ریاست انطاکیہ کی ہے جو ۴۹۱ھ/۱۰۹۸ء میں وجود میں آئی۔ اس کے بعد انھوں نے بیت المقدس کو فتح کر کے ستر ہزار مسلمانوں کو خاک و خوں میں تڑپایا۔ جب ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ اس موقع پر فاطمیوں نے کس بے تدبیری اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا تو ہماری آنکھیں شرم و حیا سے جھک جاتی ہیں۔

(۲)

کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم نے صلیبی جنگوں کا یہ مختصر سا حال کیوں بیان کیا ہے؟ صرف اس لئے تاکہ آپ اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکیں کہ جب نصاریٰ کا پیشوائے اعظم مسلم ممالک کو فتح کرنے اور اُن پر قابض ہو جانے کے لئے اہلِ مغرب کو ابھار رہا تھا اور اس سلسلے میں شب و روز

ناسود مینا م اور فصیح و بلیغ خطبے مرتب کر رہا تھا حجۃ الاسلام غزالی تبلیغ جہاد وغیرہ کے تقاضوں سے قطع نظر کر کے ایک نہایت خلوت پرور ماحول میں ڈوب کر اپنے اوراد و اذکار میں مصروف تھے۔ اس باب میں صرف ایک مثال کے بیان کر دینے پر ہم اکتفا کرتے ہیں کہ فتح بیت المقدس کے دن نصاریٰ نے حافظ ابوالقاسم رملی کو گرفتار کر لیا اور منادی کرائی کہ جو شخص فدیہ دے کر چاہے انہیں رہا کرو اسکتا ہے مگر بیت المقدس کے بھرے شہر میں ایک انسان کو بھی اس کی ہمت و جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار علامہ سبکی کی روایت کے مطابق بے شمار دوسرے علماء کے ساتھ حافظ رملی کو بھی قتل کر دیا۔

ہم نے یہ المیہ (TRAGEDY) صرف اس لئے بیان کیا ہے تاکہ جہاں آپ کو غزالی کی زندگی کے سمجھنے میں آسانی ہو وہاں آپ پر یہ امر بھی واضح کر دیا جائے کہ ایک شخص علم و فضیلت کے اعتبار سے اپنے زمانہ و عصر میں کتنا ہی ممتاز اور سربرآوردہ کیوں نہ ہو، ضروری نہیں کہ اپنے زمانے کی سچی تصویر کہلا سکے اس لئے کہ صلیبی جنگوں کے آغاز میں جن جن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا اُن کے ذکر سے غزالی کی تمام تصنیفات یکسر خاموش و گنگ ہیں۔

یقیناً یہ بہت بڑی لغزش ہوگی اگر ہم اخلاقی تقاضوں کو اجتماعی زندگی سے کاٹ کر انفرادی زندگی کے ساتھ مخصوص کر دیں اس لئے کہ احوال و ظروف کی تبدیلی کے ساتھ مسئولیت اور ذمہ داری بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور کوئی لمحہ اور کوئی آن ایسی نہیں جس میں اخلاق کا تقاضا پوری شدت کے ساتھ موجود نہو۔

چوتھی فصل

مدارسِ نظامیہ

یہ مدارسِ سلطان الپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ کے وزیر اعظم نظام الملک

کی طرف منسوب ہیں جو دس برس تک الپ ارسلان کے عہد حکومت میں اور بیس برس تک ملک شاہ کے زمانے میں یعنی کامل تیس برس تک کرسی وزارت پر متمکن رہا اور آخر کار قتل کر دیا گیا۔ مورخین کا اس امر میں اختلاف ہے کہ اس کے قتل کا باعث کیا ہوا بعض کی رائے ہے کہ جب نظام الملک نے مدارس نظامیہ پر بے دریغ روپیہ صرف کرنا شروع کیا یہاں تک کہ ان مدارس کا سالانہ بجٹ . . . . . . ہ دینار تک پہنچ گیا تو بعض لوگوں نے ملک شاہ سے شکایتاً کہا کہ اتنی بڑی دولت جو نظام الملک ان مدارس پر فضول صرف کر رہے ہیں اس سے اتنا بڑا لشکر تیار کیا جا سکتا ہے جس کی فتح و نصرت کے جھنڈے قسطنطنیہ پر لہرائیں۔ اس شکایت سے متاثر ہو کر جب ملک شاہ نے نظام الملک سے باز پرس کی تو نظام الملک نے جواب دیا کہ اے بیٹا میں ایک عجمی بڑھا ہوں اگر نیلامی میں میری بولی دی جائے تو پانچ دینار میں بھی میرا نیلام ہونا مشکل ہے لیکن تم ایک بانکے چھبیلے ترک جوان ہو، اگر تمہاری بولی دی جائے تو بعید نہیں کہ تیس دینار میں نیلام ہو جاؤ مگر اس بے قیمتی کے باوجود تم عیش و طرب کی محفلوں اور خواہشات نفسانی کے نرغے میں بری طرح گھرے ہوئے ہو، تمہارا اعمال نامہ گناہوں اور بداعمالیوں سے سیاہ تو ہے مگر اس میں نیکی اور اطاعت الٰہی کی کہیں سفیدی نہیں، جن فوجوں پر تم گھمنڈ کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ آڑے وقت میں وہ تمہارے کام آئیں گی، یاد رکھو ان کی تلواروں کا طول دو ہاتھ سے زیادہ نہیں اور ان کی کمانوں کے تیر تین سو ہاتھ سے زیادہ فاصلے پر مار نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ چوبیں گھنٹے فسق و فجور، رقص و سرود اور شراب نوشی میں بدمست اور چنگ و رباب کی لے میں گم رہتے ہیں مگر اس کے مقابلے میں میں نے تمہاری طرف سے دفاع کے لئے ایک ایسی فوج تیار کی ہے جسے جیش اللیل کہنا زیادہ مناسب ہے۔ جب میری فوجیں رات کو غفلت کی نیند میں خراٹے لے رہی ہوتی ہیں تو یہ شبینہ فوجیں اپنے پروردگار کے حضور میں صف بستہ کھڑے ہو کر گریہ وزاری کرتی اور تیرے لئے اور تیری فوجوں کے لئے نہایت عاجزی و تضرع کے ساتھ دعائیں مانگتی ہیں یقین جانو کہ تمہاری فوجیں اور تم خود انہی کی حفاظت میں بآرام زندگی بسر کرتے اور انھیں کی دعاؤں کے

ٹھیل پاؤں پھیلا کر سوتے ہو اور انھیں کی یمن و برکت کی بدولت آسمان تم پر بارش برساتا اور زمین رزق اگلتی ہے۔ ملک شاہ یہ جواب سن کر چپ ہو رہا اور زیادہ کچھ نہ بولا۔

جورجی زیدان نے اپنی کتاب التمدن الاسلامی میں سراج الملوک کے حوالے سے اس واقعہ کو من وعن نقل کر دیا ہے اور بغیر کسی مزید تبصرے کے صرف اتنا بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ نظام الملک ۴۸۵ھ میں قتل کر دیا گیا۔

ایک سے زائد مورخین کا بیان ہے کہ نظام الملک نے اپنے پوتے عثمان بن جمال الملک کو جب مرو کا حاکم بنا کر بھیجا تو ملک شاہ نے اپنے خواص میں سے قودن نامی ایک شخص کو بطور محاسب عثمان کے پاس مالیات کی جانچ پڑتال کے لئے روانہ کیا قودن اور عثمان دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی اور عثمان نے اپنی جوان عمری کی کم تجربی اور اپنے دادا کے جاہ و منصب کے گھمنڈ میں آکر قودن کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ کچھ عرصے بعد جب رہا کیا تو قودن روتا پیٹتا سیدھا ملک شاہ کے دربار میں داد خواہی کے لئے پہنچا۔ ملک شاہ کو نظام الملک اور اس کی اولاد کا یہ جبر و استبداد اور امور سلطنت میں بے جا دخل اندازی سن کر بہت طیش آیا اور نظام الملک کو لکھا کہ اگر حکومت و سلطنت میں تم میرے ہمسر اور برابر ہو تو اس کا علاج دوسرا ہے اور اگر میرے قائم مقام اور نائب ہو تو تمھارے لئے ضروری ہے کہ نیابت کا پاس و لحاظ رکھو۔ تمھاری اولاد کی بے ہودگی اور بے اعتدالی حد سے متجاوز ہو گئی ہے اور معلوم نہیں ▪▪ اپنے دماغ و تخیل میں کن کن امنگوں اور آرزوؤں کے گھروندے تعمیر کر رہے ہیں تا آنکہ انھوں نے یہ کیا، وہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ نظام الملک نے خط پڑھ کر قاصدوں سے کہا کہ بادشاہ سے کہدو کہ اگر آج تک تمہیں اس امر کا علم نہیں ہوا کہ حکومت و سلطنت میں میں تمھارا شریک و ہمسر ہوں تو آج سے تمہیں اس کا علم ہو جانا چاہئے کہ میری ہی حسنِ تدبیر اور اصابتِ رائے کی بدولت تم تاج و تخت تک پہنچے ہو۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ جب تمہارا باپ قتل کر دیا گیا اور تم نہایت بے بسی اور کس مپرسی کے عالم میں تھے تو میں نے ہی تمہاری اعانت و دستگیری کی اور تمھارے اپنے خاندان کے باغیوں

کے ساتھ دوسرے باغیوں کا بھی قلع قمع کیا اور اس تمام اثنا میں تم میرے ہی سایۂ شفقت میں پروان چڑھے لیکن جب تمام خاص وعام اور دور ونزدیک کے لوگوں کو میں نے تمھارا حلقہ بگوش اور اطاعت گذار بنا دیا تو لگے تم آج مجھ پر اتہام لگانے، عیب تراشنے، اور میرے باب میں دوسروں کی شکایات سننے، بادشاہ سے کہدو تمھارے تاج کی عزت میرے قلمدان کی عزت سے وابستہ ہے اگر اپنے تاج کی خیریت چاہتے ہو تو میرے قلمدان کی عزت کرو کہتے ہیں کہ تمام قاصدوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ یہ تلخ پیغام بادشاہ کے کانوں تک نہیں پہنچائیں گے مگر انھیں میں بادشاہ کا ایک جاسوس بھی موجود تھا جس نے ساری بات بجنسہٖ بادشاہ کے کانوں تک پہنچادی، بادشاہ نے غضبناک ہوکر ایک شخص کو خفیہ بھیجا اور اس نے جاکر نظام الملک کا کام تمام کردیا۔

نظام الملک کے قتل کے مذکورہ اسباب میں سب سے زیادہ قرین صواب وہ ہے، جو حضرت استاذ محمد بک الخضری نے جامعہ مصریہ والے لیکچروں میں بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ جب نظام الملک نے فوجیں بھیج کر فرقۂ باطنیہ کے مرکز قلعۃ الموت کو محاصرہ میں لے لیا اور ان پر آمد ورفت کی تمام راہیں مسدود کردیں تو ایک باطنی نے غیرت وجوش میں آکر نظام الملک کو قتل کردیا۔ استاذ موصوف کے بیان سے اس امر کی تردید ہرگز نہیں ہوتی کہ نظام الملک اور سلطان ملکشاہ کے مابین بھی عداوت ونفرت کے مابین بھی عداوت ونفرت کے جذبات موجود تھے اس لئے کہ خلفاء وسلاطین اور وزراء وامرا کے درمیان بغض وحسد کی داستانیں معلوم خاص وعام ہیں بالخصوص اس تاریک دور میں جس کا خمیر ہی جبر واستبداد سے اٹھایا گیا تھا اور جس میں ظلم وسرکشی اور جبر وتسلط ہی ملک کا آئین تھا بہت سارے شعرائے نظام الملک کے مرثیے لکھے جن میں سے مقاتل بن عطیہ بکری کے یہ دو شعر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کان الوزیرُ نظام الملک لؤلؤۃً	یتیمۃً صاغہا الرحمٰن من شرف
بدت فلم تعرف الایام قیمتہا	فردّہا غیرۃً منہ الی الصدف

لہ وزیر اعظم نظام الملک ایک ایسا دُرِ یگانہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے شرافت وعزت کے سانچے میں ڈھالا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

جیسا کہ فاطمیوں نے رفض و تشیع کی نصرت و اعانت کے لئے چوتھی صدی کے وسط میں
جامع ازہر کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح نظام الملک نے اہل سنت کی تائید و حمایت کے لئے
پانچویں صدی کے وسط میں مدارس نظامیہ کی طرح اور داغ بیل ڈالی اور ہر زمانے میں مسلمان
اپنے ملک و حکومت کے بقاء و استحکام کے لئے ایسے مکاتب اور مدارس برابر قائم کرتے رہے
ہیں جیسا کہ موجودہ عصر میں یورپین اقوام اپنے آراء و افکار کا زہر پھیلانے کے لئے دوسرے ممالک
میں سکول اور کالج کھولتے ہیں اس لئے کہ مختلف اقوام کے مابین اتحاد و ائتلاف کی فضا پیدا کرنے کے
کے لئے علم سے زیادہ کارگر اور کامیاب ہتھیار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ سیاست و جہانبانی بھلا
ایسے کامیاب ہتھیار سے کیسے غفلت برت سکتی ہے۔

نظام الملک نے صرف مذکورہ بالا مدارس کے قیام پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی عظیم الشان
مہمان خانے اور سرائیں بھی تعمیر کیں تاکہ علماء و زہاد پر جی بھر کر انعام و اکرام کی بارش کر سکے اور وہ
اس سے متاثر ہو کر خود بخود شام، عراق اور خراسان میں اس کا پروپیگنڈا کرتے پھریں۔ حقیقت یہ
ہے کہ نظام الملک نے اپنے زمانے کے لوگوں کے عام ذوق کو خوب سمجھا اور پھر اس سے پورا پورا
فائدہ بھی اٹھایا۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس جب بڑے بڑے ائمہ و اکابر آتے تو کسی کے لئے تعظیماً کھڑا
نہ ہوتا اور اپنی مسند پر کھڑا رہتا مگر وہیں ایک بوڑھا شخص تھا جو کبھی نظام الملک سے ملنے کے لئے آتا
تو نظام الملک اس کی تعظیم و تکریم کے لئے سرو قامت کھڑا ہو جاتا اسے اپنی مسند پر بٹھاتا اور خود
دوزانو ہو کر اس کے سامنے مؤدب بیٹھ جاتا جب نظام الملک سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا
یہ علماء و زہاد جب میرے پاس آتے ہیں تو میری ان خوبیوں کا ذکر کر کے تعریف کرتے ہیں جو مجھ میں
نہیں ہیں اور اس وجہ سے مجھ میں نخوت و تکبر پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ بوڑھا جب بھی میرے پاس
آتا ہے تو میرے سامنے میرے عیوب و نقائص گنواتا ہے اور اس کی وجہ سے میں بہت ساری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ لوگوں کے سامنے آیا مگر جب انھوں نے اس کی قدر و قیمت کو نہ پہچانا تو غیرت الٰہی نے
یہ گوارا نہ کیا اور اسے دوبارہ سیپ میں رکھ دیا۔

بری باتوں سے اپنا ہاتھ روک لیتا ہوں۔ اگر یہ واقعہ درست ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے علما نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنے سے عاجز و قاصر تھے اور امرا و خواص کو وعظ و نصیحت سننے کے لئے بجائے علماء کے فقراء و درویش کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا کیونکہ اس زمانے کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ اس گروہ کے ساتھ رواداری سے کام لیا جائے اس باب میں نظام الملک کی نیت کچھ بھی ہو اور اللہ تعالیٰ نیتوں کا جاننے والا ہے اس کا یہ کارنامہ کچھ کم نہیں کہ اس نے ایسے عالیشان مدارس قائم کرکے بے شمار اوقاف ان کے لئے مخصوص کئے۔ طلبہ کے وظائف مقرر کئے، ان کے آرام و آسائش کے لئے، بازار، ہوسٹل اور حمام تعمیر کروا دیے اور ان ہی اوقاف کی بدولت ایک طویل مدت تک یہ مدارس علوم و معارف کی بیش بہا خدمت انجام دیتے رہے اور علماء و فضلاء کی ایک بہت بڑی تعداد ان سرچشموں سے مستفید و سیراب ہوئی۔

ان مدارس کا غزالی کی ذات پر بہت بڑا احسان ہے اس لئے کہ غزالی نے نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم حاصل کی اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں مدرس ہوئے۔ آئندہ کسی باب میں ہم تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کریں گے۔

پانچویں فصل

غزالی کے زمانے کا عام ذوق

یہ متعین کرنا بہت مشکل ہے کہ کسی زمانے میں کون سا ذوق عام اور غالب تھا، ایک مؤرخ کا اجتہاد اس باب میں صرف اتنا کام دے سکتا ہے کہ وہ مختلف شواہد و امثال کی روشنی میں کسی خاص زمانے کی جتنی بھی، درست تصویر ممکن ہو سکتی ہے [illegible]وں کے سامنے پیش کردے

میری رائے یہ ہے کہ غزالی کے زمانے میں ایسی سادگی جس میں امراء و علماء کے مکر و حیلہ کی بھی ایک گونہ آمیزش تھی زیادہ عام تھی اور اس سادگی کی بین دلیل وہ ہے جس کا ذکر غزالی نے اپنی مشہور کتاب "المنقذ من الضّلال" میں کیا ہے۔ کہ جب وہ مدرسہ نظامیہ (بغداد) کی تدریس سے الگ ہو گئے تو لوگ کہا کرتے تھے کہ اسلام کو نظر لگ گئی۔

علامہ سبکی لکھتے ہیں کہ غزالی کے ایک معاصر نے انھیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ "ایک دفعہ سفر میں ڈاکوؤں نے ہمارے قافلے کو لوٹ لیا اور دوسرے لوگوں کے سامان کے ساتھ میرا سب کچھ بھی لے گئے۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے گیا اور اُن کے سردار سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ واپس چلے جاؤ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ تمھیں اُس ذات کا واسطہ دیکر کہتا ہوں جس سے تم خیر و سلامتی کی امید رکھتے ہو کہ میرے سامان میں سے صرف میری تعلیقات واپس کر دو اس لئے کہ وہ تمھارے لئے بالکل بیکار ہیں۔ ڈاکوؤں کے سردار نے کہا کہ یہ تمھاری تعلیقات کیا بلا ہیں، میں نے جواب دیا وہی چند کتابیں جو تھیلے میں ہیں اور میں نے اُن کے پڑھنے اور لکھنے کے لئے اتنا دور دراز کا سفر کیا ہے وہ یہ جواب سن کر ہنسنے لگا اور بولا تم ان کتابوں کے عالم ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہو جب اُن کے چھن جانے سے تمھارا علم بھی چھن گیا اور اب تم علم سے کورے رہ گئے۔ اس کے بعد اُس نے اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا اور اُس نے میرا تھیلا مجھے واپس لوٹا دیا۔ غزالی کہتے ہیں کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے یہ چند تنبیہی کلمات میری عبرت و بصیرت کے لئے اُس ڈاکو کی زبان پر جاری فرما دئے تھے چنانچہ جب میں طوس واپس پہنچا تو کامل تین برس تک ان تعلیقات کے حفظ کرنے میں مصروف رہا۔ اب بحمد اللہ یہ کیفیت ہے کہ اگر میری تعلیقات چھن بھی جائیں تو بھی میرا علم میرے پاس محفوظ رہے گا۔

اس واقعہ میں سادگی اور بھولا پن واضح ہے۔ اس لئے کہ کسی شخص کا دفاتر کے دفاتر کو پوری طرح ازبر اور نوک زبان یاد کر لینا کوئی کمال نہیں بلکہ ذہنی اور عقلی ترقی کے لئے انتہائی

مانع ہے کسی عالم کے علم وفضل کی قدر وقیمت اس کی محفوظات سے نہیں بلکہ اس کے حسنِ فہم اصابتِ رائے اور قوت فیصلہ سے پہچانی جاتی ہے

اس زمانے کی سادگی اور بھولے پن کی اور بڑی دلیل نظام الملک کی وہ وصیت ہے جو اس نے بعد میں آنے والے سیاسی لوگوں کے لئے چھوڑی ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"امام موفق نیشاپوری (جن کی عمر پچاس برس سے متجاوز تھی) بہت صاحب قدر و منزلت اور خراسان کے اجلّہ علماء میں شمار ہوتے تھے چونکہ اس زمانے کے لوگوں میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ جو شخص امام موصوف سے علوم عربیہ کی تحصیل کرے وہ متبحر عالم ہونے کے علاوہ بہت بڑے عز وجاہ کو پہنچتا ہے اس لئے میرے والد نے عبدالصمد فقیہ کی معیت میں مجھے طوس سے نیشاپور روانہ کیا تاکہ اس یگانۂ عصر سے کسبِ علوم و فیوض کروں۔ باہمی ملاقات کے بعد ہم دونوں میں محبت و صداقت کے رشتے بدرجۂ غایت استوار ہوگئے۔ وہ ہمیشہ مجھ پر شفقت و عنایت کی نگاہ رکھتے اور میں بھی اُن سے زیادہ کسی کو مکرم و محترم نہ سمجھتا چنانچہ کئی برس تک یہی کیفیت رہی۔ جب میں پہلے پہل امام موفق نیشاپوری کے حلقۂ درس میں حاضر ہوا تو دو طالب علموں سے ملاقات ہوئی جو میرے ہی ہم عمر تھے اور ابھی تحصیل علم کے سلئے امام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ایک کا نام عمر خیام اور دوسرے کا نام حسن بن صباح تھا۔ دونوں بلاکے ذہین اور ہوشیار تھے ہم تینوں آپس میں انتہائی مانوس اور پکے دوست بن گئے۔ جب امام موصوف سبق پڑھا کر چلے جاتے اور کلاس ختم ہوجاتی تو ہم تینوں مل کر اسباق کا اعادہ و تکرار[2] کیا کرتے۔ خیام نیشاپوری تھے اور حسن بن صباح کے والد ایک عابد زاہد اور درویش صفت صوفی منش بزرگ تھے مگر خود حسن بن صباح زندیق اور بے دین تھا۔ ایک روز حسن نے عمر خیام سے کہا عوام میں یہ بات مسلّمات کا درجہ رکھتی ہے کہ جو طالب العلم امام موفق کی خدمت میں رہ کر علوم کی تکمیل کرے اُسے لا محالہ

---

[1] مقدمہ رباعیات عمر خیام از سباعی [2] طلبۂ علوم اسلامیہ کی اصطلاح میں استاذ سے پڑھے ہوئے سبق کو باہم مل کر دہرانے اور اعادہ کرنے کو تکرار کہتے ہیں۔ مترجم

بہت بڑی دولت وعزت اور بہت بڑا جاہ و منصب بتلاتا ہے فرض کرو ہم تینوں کو نہ بھی مگر کسی کو تو ضرور یہ رتبہ ملے گا۔ بتاؤ ایسی حالت میں دونا کام دوستوں کا اس کامیاب دوست پر کیا حق ہوگا؟ ہم نے کہا تم ہی بتاؤ کہنے لگا ہم تینوں سے جو سب سے بڑا مالدار ہو جائے اُس کا فرض ہے کہ ساری دولت بلاکم وکاست تینوں میں برابر تقسیم کردے، ہم نے کہا درست ہے، ایسا ہی ہوگا اور قسمیں کھا کھا کر ہم نے یہ عہد و پیمان باندھا اس بات پر کئی سال گذر گئے اور میں خراسان چھوڑ کر اللہ کی وسیع زمین میں مارا مارا پھرتا رہا چنانچہ غزنہ گیا غزنہ سے کابل گیا۔ جب کابل سے واپس آیا تو سلطان الپ ارسلان کی وزارت کا منصب مجھے تفویض ہوا کچھ عرصے کے بعد جب میرے دونوں دوستوں کو اس کا علم ہوا تو دولت و ثروت کی تقسیم اور قدیم وعدے کے ایفا کے لئے وہ میرے پاس آموجود ہوئے۔"

اس واقعہ کے درج کرنے سے میری غرض صرف اتنی ہے کہ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اُس زمانہ میں کیا ہی سادہ پن تھا اور لوگ کیا ہی سادہ تھے، اُن کے عقیدہ میں محض امام نیشاپوری سے پڑھنے اور کسبِ علوم کرنے کی وجہ سے کوئی شخص دنیا جہاں کی عزت و جاہ کو سمیٹ سکتا تھا۔ حالانکہ یہ باتیں بالکل بے حقیقت ہیں اور ایک ذہنی فریب سے زیادہ کوئی حیثیت و وقعت نہیں رکھتیں۔ صرف کم عقل اور ضعیف الاعتقاد قسم کے لوگ ہی ایسی باتوں کو تسلیم کرسکتے ہیں۔ مگر آپ نے دیکھا اُس زمانہ میں یہ عقیدہ کتنا مسلّم اور کتنا عام تھا اور طالب العلم اپنے اپنے حلقہائے درس میں بیٹھ کر کتنے مزے لے لے کر اس عقیدہ کا اظہار کرتے تھے۔

گذشتہ فصل میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ نظام الملک نے علماء و فقرا کا "جو عظیم الشان" جیش اللیل ترتیب دیا تھا کتنے فخر و مباہات کے ساتھ ملک شاہ کے سامنے اُس کا ذکر کیا، بھلا دعاؤں اور آنسوؤں سے بھی کبھی کوئی مصیبت ٹالی جاسکتی ہے یاد رکھئے دعاؤں اور آنسوؤں سے زیادہ بے سود اور بے کار کوئی ہتھیار نہیں۔ اگر قوموں کا سچا اور قومی دفاع ممکن ہے تو صرف ان علوم کی بدولت جن سے اُن کے اخلاق کی صحیح تعمیر ہو، اُن کی خوابیدہ ہمتیں بیدار ہوں اور اُن کی ثقافت و

تہذیب کے مٹے ہوئے نقوش دوبارہ ابھر آئے اور روشن ہوں

اس زمانے میں اوہام پروری کی کثرت اور خوابوں کا عام تذکرہ وشہرت بھی اس امر کی واضح دلیل ہے کہ وہ لوگ کتنے سادہ اور حقیقت وواقعہ کی نسبت اوہام وشکوک کے کس قدر دلدادہ وعاشق تھے۔

(۲)

رہا اس زمانے کے امراء وعلماء کا حیلہ ومکر سو اس کا ذکر بے شمار کتابوں میں موجود ہے خود غزالی کی تالیفات اس باب میں شاہد عدل ہیں وہ کئی جگہ ایسے علماء کی مذمت کرتے ہیں جو بظاہر تو ہر وقت مذہب کی تائید ونصرت کے لئے کمربستہ نظر آتے ہیں مگر فی الواقعہ دنیوی جاہ ومنصب کے پجاری ہیں۔

بڑی آسانی سے اس امر کا یقین حاصل کیا جا سکتا ہے کہ غزالی نے اپنے زمانہ وعصر کی کیا ہی صحیح اور سچی تصویر کھینچ دی ہے جب وہ اُن برخود غلط اور دیں باز ودنیا ساز صوفیہ کا ذکر کرتے ہیں جو نیکی وتقوے کے نام پر لوگوں کو فریب دیتے اور ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، حالانکہ ان بدبختوں کو نیکی اور صلاح سے دور کا بھی تعلق وواسطہ نہیں۔ اس گروہ کی قلعی کھولتے وقت حقیقت یہ ہے کہ غزالی نے ایسی حیرت انگیز جرأت وشجاعت کا ثبوت دیا ہے جو ظاہر ہے کہ غزالی کے مطالعۂ کتب قدیمہ ہی کا صرف نتیجہ واثر نہیں بلکہ اُن طرح طرح کی مصائب وتکالیف کے خلاف جوشِ انتقام کی بھی غماز ہے جو اس گروہ کے مکر وریا کی بدولت غزالی کو سہنی پڑیں۔ گو اس سے قبل معری بھی ایسے گندم نما جو فروش صوفیہ کی زندگی ومشرب پر ایک سیر حاصل نقد وجرح کر چکا تھا مگر اس نقار خانے میں اُس کی آواز پر کسی نے کان نہ دھرا، لیکن غزالی چونکہ خود ایک بلند پایہ صوفی تھے اور ان کے تلامذہ کی ایک فوج ان کے افکار کی نشر واشاعت کے لئے اُن کے گرد موجود تھی اس لئے اُن کی تنقید کا اثر زیادہ وسیع اور زیادہ گہرا ہوا۔

بد خود غلط اور گمراہ لوگوں کے باب میں غزالی نے جو کچھ تحریر کیا ہے اُس کا ایک مختصر سا نمونہ واقتباس ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

"ان کی ایک جماعت نے وعظ و تذکیر کا صحیح اور مناسب انداز ترک کر دیا اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں بلکہ اس زمانے کے تمام واعظوں کا یہی حال ہے۔ ممکن ہے کہ دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں کوئی واعظ ایسا بھی ہو جو اس کلیے سے مستثنیٰ ہو مگر ہمیں اس کی ذات کا علم نہیں، صرف ندرت پسندی اور جدت طرازی کی خاطر بعض واعظوں نے خلاف عقل و شرع اور محض رطب و یابس باتیں کہنا شروع کر دیں اور بعض نے کچھ مقفّیٰ اور مسجّع عبارتیں اور ہجر و وصال کے موضوع پر کچھ اشعار نوکِ زباں یاد کیے ہوئے ہیں جن کو مختلف مقامات میں حجت و سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مقصود ان کا صرف یہ ہے کہ وعظ کی مجلسوں میں سامعین چلّا چلّا کر روئیں اور وجد و مستی میں آکر لوٹنے لگیں۔ چاہے اُن کے سینے میں کتنی ہی فاسد اور لایعنی اغراض موجزن کیوں نہ ہوں۔ ایسے واعظین شیاطین الانس کا درجہ رکھتے ہیں، یہ لوگ صرف خود ہی گمراہ نہیں بلکہ دوسروں کی بھی گمراہی کا موجب ہوئے ہیں۔"

(احیاء العلوم ص ۵۰۴ ج ۳)

یہ اور بات ہے کہ غزالی خود بھی صوفیہ ہی کے حلقے سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ عن قریب کسی آئندہ باب میں دیکھیں گے کہ وہ اسی گروہ کی تعریف و توصیف میں مشرق و مغرب کے کیا کیا ڈانڈے ملاتے ہیں۔

اُس زمانے کے امراء و سلاطین کے حیلہ و مکر اور عامۃ الناس کو فریب دینے کی سب سے بڑی مکروہ صورت یہ تھی کہ مذہب کے مقدس نام پر انسانوں کے گلّے کے گلّے میدانِ جنگ کی طرف ہنکائے جاتے تھے تاریخ میں آپ اس قسم کی مثالیں بہت کم پڑھیں گے کہ کسی مسلمان حکومت نے دوسری مسلمان حکومت پر حملہ کیا ہو اور مذہب کی آڑ نہ لی ہو بلکہ اس کے خلاف عموماً یہی ہوا ہے کہ خود کو مذہب کا حامی و علم بردار اور دوسرے کو کافر و فاجر کا نام دے کر اُس پر حملہ اور چڑھائی

کردی اور اس فتنہ و شر کی آگ میں عوام کو جھونک دیا، مصر، شام، عراق، خراسان اور دوسرے اسلامی ممالک کی تاریخ اس کی بین شاہد ہے آہ! اللہ کی ہزار ہزار لعنت ہو خود غرض و خود پرست مدعیانِ سیاست پر۔

چھٹی فصل

مشہور مقامات

اس فصل میں ہم بعض ان مشہور مقامات کا ذکر کریں گے جنھیں غزالی نے دیکھا ہے اس لئے کہ اس بات کا بھی غزالی کی زندگی سے گہرا تعلق ہے، صرف بغداد کا ذکر ہم قصداً نہیں کریں گے کیونکہ یہ اپنی شہرت کی وجہ سے کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں۔ ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنی مفید اور مشہور کتاب "ذکری ابی العلاء" میں نہایت شرح و بسط سے بغداد کا ذکر کیا ہے اگر کوئی صاحب بغداد کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کریں۔

ان مقامات کے بیان میں ہم نے سارا اعتماد یاقوت[۱] حموی کی کتاب معجم البلدان پر کیا ہے اس لئے کہ یاقوت غزالی کے زمانے سے قریب العہد ہونے کے علاوہ مختلف مقامات کے تمام وہ عیوب و محاسن بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیتا ہے جن کے لئے یہ مقامات اُس زمانے میں مشہور تھے۔

طوس

طوس خراسان کا ایک مشہور ضلع ہے، اس میں دو شہر ہیں طابران اور نوقان (غزالی کا مزار طابران میں ہے) ان دونوں شہروں کے گرد تقریباً دو ہزار قریے ہیں، طوس حضرت

---

[۱] یاقوت حموی کا انتقال ۶۲۶ھ میں ہوا اور اس کی تالیف معجم البلدان جغرافیہ کی کتابوں میں چوٹی کی کتاب شمار ہوتی ہے۔

عثمانؓ بن عفان کے عہد خلافت میں فتح ہوا۔ حضرت علی بن موسیٰ رضا اور ہارون الرشید
کی قبریں یہیں ہیں مسعر بن مہلہل کا قول ہے کہ طوس چار شہروں سے عبارت ہے ان میں سے
دو بڑے اور دو چھوٹے ہیں۔ اس میں عظیم الشان اسلامی عمارتوں کے آثار آج تک موجود
ہیں حمید بن قحطبہ کا وہ محل جو ایک مربع میل میں ہے وہ بھی یہیں ہے۔ علی بن موسیٰ رضا اور
ہارون الرشید کی قبریں بھی یہیں ایک باغ میں ہیں۔ طوس اور نیشاپور کے مابین ایک عظیم الشان
محل ہے جو دیواروں کی بلندی اور عمارت کی مضبوطی اور پختگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا
اس میں ایسے ایسے عالیشان برآمدے، ڈیوڑھیاں، کمرے، تخلیے اور ایسی ایسی خوبصورت
الماریاں موجود ہیں کہ دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ میں نے لوگوں سے اس کے
بانی کے متعلق پوچھا سب کہتے تھے کہ تبابعہ (ملوک یمن) کے خاندان میں سے کسی نے تعمیر
کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کا بانی یمن سے چین جا رہا تھا جب اس مقام پر پہنچا تو چاہا کہ کسی
محفوظ اور تسلی بخش جگہ میں اپنے اہل وعیال کے علاوہ وہ خزانے بھی چھوڑ جائے جن کی ذمہ داری
اور جن کا بوجھ اسے پریشان کر رہا تھا تاکہ اطمینان اور چین سے آگے بڑھ سکے چنانچہ یہ محل تعمیر
کیا اور بہت بڑی نہر کھدوائی جس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اپنا مال و دولت اور اہل وعیال
یہیں چھوڑ کر خود چین کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد جب چین سے کامیاب واپس آیا تو
اہل وعیال کے ہمراہ کچھ خزانے تو ساتھ لے گیا اور کچھ یہیں دفن کر دیئے اور اُن کا پتہ نشان
لکھ لیا طویل عرصے تک قافلے یہاں سے گذرتے رہے مگر کسی کو ان خزانوں کا علم نہ ہوا۔ آخر کار
اسعد بن یعفر والیٔ کحلان کو ان کا پتہ مل گیا اور اُس نے آکر سب کے سب نکلوا لئے۔

ائمہ علم کی ایک بڑی تعداد طوس کی رہنے والی ہے جن میں سب سے زیادہ مشہور
ابو حامد غزالی ہیں۔ نظام الملک بھی یہیں کا رہنے والا تھا۔ یاقوت لکھتے ہیں کہ اہل خراسان
طوس والوں کو گائے بیل کہتے ہیں مگر مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی ایک شخص نظام الملک
کی ہجو میں کہتا ہے:۔

[1] لقد خرّب الطوسی بلدۃ غزنۃ ... فصب علیہ اللہ مقلوب بلدتہ

ھو الثور قرن الثور فی جر امّہ ... ومقلوب اسم الثور فی جوف لحیتہ

دعبل خزاعی ایک قصیدے میں اہل بیت کی مدح اور حضرت علی بن موسیٰ رضا اور ہارون الرشید کی قبروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :

قبران فی طوس : خیر الناس کلھم ... وقبر شرھم : ھذا من العبر [2]

ماینفع الرجس من قرب الذکی ولا ... علی الذکی بقرب الرجس من ضرر

ھیھات کل امرئ رھن بما کسبت ... یداہ حقًا فخذ ماشئت او فذر

یہی طوس غزالی کا وطن اور مولد ہے اور یہیں اُن کی قبر ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ غزالی طوس کے قریب غزالہ نام ایک گاؤں کے رہنے والے تھے کوئی تعجب نہیں کہ ایسا ہی ہو، کیونکہ یاقوت لکھتے ہیں کہ طوس کے اردگرد ایک ہزار قریے تھے تو گویا اس صورت میں غزالی بتشدید الزاء بجائے بفتح الزاء صحیح ہوگا۔ علامہ سبکی لکھتے ہیں کہ ایک [3] اور شخص کا لقب بھی غزالی تھا۔ ڈاکٹر زویمر کی یہ رائے ضروری نہیں کہ درست ہو کہ غزالہ ایک قدیم خاندان کا نام تھا اور یہ دوسرا شخص اُسی خاندان کی طرف منسوب ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ شخص بھی غزالی کے گاؤں غزالہ ہی کی طرف منسوب ہو۔

نیشاپور

یاقوت لکھتا ہے کہ نیشاپور علم و فضل کا مرکز ہونے کے علاوہ اور بھی بڑی خوبیوں کا شہر ہے میں نے اپنی پوری سیاحت کے اثنا میں دوسرا ایسا عمدہ شہر نہیں دیکھا۔ رے سے نیشاپور ۱۶۰ فرسنگ

---

[1] نظام الملک طوسی نے چونکہ غزنہ کو تباہ و تاراج کیا اس لیے اللہ نے اُس کے شہر (طوس) کے مقلوب (سوط یعنی تازیانہ) سے اُس کو سزا دی وہ بیل ہے اُس کی ایسی تیسی (ہم نے صرف کنایے پر اکتفا کیا ہے صراحت مفہوم سے تہذیب مانع ہے۔ اور ثور (بیل) کا مقلوب (روث یعنی غلاظت) اُس کی داڑھی میں ہے

[2] کتنی عبرت کی بات ہے کہ طوس میں سب میں بہتر اور سب میں بدتر دونوں کی قبریں موجود ہیں۔ نیک کے قرب سے بد کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور بد کے قرب سے نیک کو کیا نقصان ہو سکتا ہے جزا و سزا کا سارا دارومدار اعمال پر ہے پس نیکی اور بدی دونوں میں سے تو جو چاہے اختیار کرلے۔ [3] طبقات ج ۴ ص ۹

اور وہاں سے سرخس ۴۰ فرسنگ اور سرخس سے مرو الشاہجہاں[1] ۳۰ فرسنگ ہے۔ نیشاپور کے لوگ کاریزوں سے پانی پیتے ہیں جن میں مخصوص اور مقررہ تہ خانوں کے رستوں سے اترتے ہیں لیکن پانی کا ذائقہ اچھا نہیں جب میں نیشاپور گیا ہوں تو طرح طرح کے پھلوں سے باغات لدے ہوئے تھے ریواس[2] یہاں لاجواب ہوتا ہے رنگ میں نہایت سفید اور وزن

---

[1] مرو الشاہجہاں خراسان کا دارالخلافہ تھا۔ یاقوت کے زمانے میں صرف اس ایک شہر میں دس وقف اور عام کتب خانے (PUBLIC-LIBRARIES) موجود تھے۔ دو کتب خانے جامع مسجد میں تھے ایک عزیزیہ جسے عزیزالدین ابوبکر زنجانی نے وقف کیا تھا اور اس میں ۱۲۰۰۰ کتابیں تھیں دوسرا کمالیہ، مگر معلوم نہیں یہ کس کی طرف منسوب ہے تیسرا مدرسہ مستوفیہ میں (شرف الملک مستوفی ابو محمد بن منصور حنفی المذہب تھا ۴۹۴ھ میں انتقال کیا) چوتھا نظام الملک کے مدرسہ نظامیہ میں، پانچواں مدرسہ عمیدیہ میں، چھٹا مجدالملک وزیر کا ساتواں مدرسہ خاتونیہ میں، آٹھواں مدرسہ ضمیریہ میں، دو کتب خانے سمعانیوں کے۔ ان تمام کتب خانوں سے کتابیں حاصل کرنا نہایت آسان تھا۔ یاقوت کہتا ہے ان کتب خانوں کی تقریباً ۲۰۰ کتابیں عموماً میرے پاس رہتی تھیں جن میں سے اکثر کے لیے میں کوئی ضمانت (SECURITY) جمع نہیں کرواتا تھا میں نے اکثر معاجم انھیں کتب خانوں کی امداد سے مرتب کی ہیں کسی اعرابی نے مرو الشاہجہاں ہی کے متعلق کہا ہے۔

أقمرية الوادي التي خان الفها — من الدهر احداث اتت وخطوب

تعالي اطارحك البكاء فاننا — كلانا بمرو الشاه جهان غريب

(ترجمہ) اے فراق زدہ اور مصیبت کی ماری قمری آ مل کر آہ و زاری کریں اس لئے کہ ہم دونوں مرو میں پردیسی ہیں

ابوالحسین مسعود بن الحسن دمشقی کہتا ہے

اخلاي ان اصبحتم في دياركم — فانني بمرو الشاهجهان غريب

اموت اشتياقا ثم احيا تذكرا — وبين التراقي والضلوع لهيب

فما عجب موت الغريب صبابة — ولكن بقاه في الحيوة عجيب

(ترجمہ) اے دوستو! اگر تم اپنے دیس میں ہو تو تمھیں مبارک میں تو مرو میں پردیسی ہوں۔ وطن کے شوق اور یاد میں نہایت بے چین ہوں اور میرے اندر ایک آگ لگی ہوئی ہے عشق و محبت کی راہ میں پردیسی کا مرجانا اتنا حیرت انگیز نہیں جتنا اس کا باقی اور زندہ رہنا۔

[2] ریوند کا پھل۔

میں بہت بھاری ہوتا ہے۔ ایک دفعہ لوگوں نے تجربے کی غرض سے اسے تولا تو پانچ رطل نکلا۔
آگے چل کر یاقوت لکھتا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ۳۱ھ
عبد اللہ بن کریز نے نیشاپور فتح کیا بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے ایام خلافت میں
احنف بن قیس نے اسے فتح کیا تھا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب یہ لوگ
باغی ہو گئے تو عبد اللہ بن عامر کو دوبارہ ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا۔

ائمہ علم کی ایک بہت بڑی تعداد نیشاپور سے اٹھی ان میں سب سے زیادہ سربرآوردہ اور
مشہور حافظ امام ابو علی الحسین بن علی نیشاپوری ہیں جنھوں نے تحصیل علم کے لئے دور دراز کا سفر کیا
۳۳۵ھ میں جب ان کی عمر ساٹھ برس تھی نیشاپور میں ان کا حلقۂ درس واملا قائم ہوا اور ۳۴۹ھ
میں یہ خود انتقال کر گئے۔

نیشاپور کی مذمت میں شعرا نے طبیعت کی عجب عجب جولانیاں دکھائی ہیں۔ ابو الحسن
استرآبادی کہتا ہے کہ یہاں علم وفضل کا چرچا تو بہت ہے لیکن لوگ ہمدردی، مروت، رواداری
اور مہمان نوازی کے جذبے سے بالکل عاری ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان کی آتشِ شکم علم کی ٹھنڈک
سے نہیں بلکہ روٹی کی گرمی سے فرو ہوتی ہے۔

لا قدس اللہ نیسابور من بلد ۔۔۔ سوق النفاق بمغناها على ساق
یموت فیه الفتی جوعاً وبرّهم ۔۔۔ والفضل ماشئت من خیر وارزاق
والخبز فی معدن الغرثی وان برقت ۔۔۔ انواره فی المعانی غیر براق

مرادی نیشاپور کی مذمت میں کہتا ہے کہ جب تک حکومت کا غلبہ واثر تمھارے ہاتھ میں
نہ ہو ادھر کا رخ بھی نہ کرو اس لئے کہ اہل نیشاپور کے ہاں علم وفضل کی سربلندی اور حسب ونسب
کی برتری دونوں بے کار اور ہیچ ہیں۔

لا تنزلن بنیسابور مغترباً ۔۔۔ الا وحبلك موصول بسلطان
أو لا فلا ادب یجدی ولا حسب ۔۔۔ یغنی ولا حرمة ترعی لانسان

معن بن زائدہ شیبانی نیشاپور میں شب غربت کی درازی کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

نیشاپور میں میری رات بہت طویل ہے حالانکہ رے میں بہت مختصر ہوتی تھی۔ رے میں میرے تمام احباب جمع تھے اور جانتے ہو احباب کے اجتماع اور یکجائی سے بڑھ کر کوئی نعمت و سرور نہیں، یہاں نیشاپور میں دوست ایک بھی نہیں لیکن دشمن ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ میں رات کو ایسی بے بسی اور بے چارگی میں انجم شماری کر رہا ہوتا ہوں جیسے دشمنوں کے ہاتھ میں قیدی ہوں اور وہ جس طرف چاہیں لے جائیں، اللہ کی ذات سے کچھ بعید نہیں کہ وہ احباب کو پھر جمع کر دے اور حزن و غم کے ایام رخصت ہو جائیں اور میری جوانی کی خشک شاخ پھر سے سرسبز اور ہری ہو جائے۔"

غزالی نے فقہ، منطق اور اصول کی تحصیل یہیں نیشاپور میں امام الحرمین سے کی اور اپنے تمام اقران و امثال اور معاصرین پر فوقیت لے گئے آخری ایام عمر میں مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں مدرس ہوئے لیکن کچھ عرصے بعد تدریس چھوڑ کر واپس طوس چلے آئے اور اپنے مکان کے جوار میں ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ تعمیر کر کے خانہ نشیں ہو گئے۔

جرجان،

طبرستان اور خراسان کے مابین ایک مشہور شہر ہے بعض اسے طبرستان میں اور بعض خراسان میں شمار کرتے ہیں، کہتے ہیں، یزید بن مہلب بن ابی صفرہ نے اسے تعمیر کیا تھا علماء و ادباء اور محدثین کی ایک بہت بڑی جماعت یہاں پیدا ہوئی حمزہ بن یزید سہمی نے جرجان کی ایک مستقل تاریخ لکھی ہے۔ اصطخری کہتا ہے جرجان کے نواحی میں جرجان کے برابر بڑا کوئی شہر نہیں طبرستان کی نسبت یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے یہاں کے متوسط طبقے کے لوگ زیادہ باوقار بامروت اور سخی ہیں، شہر کے دو حصے ہیں ایک جرجان دوسرا بکرآباد، ان دونوں میں ایک بڑی نہر فاصل ہے۔ یہاں پانی کے چشمے بکثرت ہیں اور کھیت بہت کھلے کھلے ہیں۔ جب عراق سے آگے آگے بڑھیں تو مشرق بھر میں جرجان کے برابر کوئی خوبصورت اور عمدہ شہر نہیں، یاقوت کہتا ہے یہاں زیتون

کھجور، اخروٹ، انار، نیشکر اور سنگترہ بکثرت ہوتا ہے، ریشم یہاں کا ایسا نفیس ہے کہ اس کا رنگ کبھی پھیکا نہیں ہوتا عجیب و غریب خواص کے پتھر یہاں موجود ہیں، سانپ بہت بڑے بڑے اور دیکھنے میں ہولناک ہیں مگر واقع میں بالکل بے ضرر ہیں۔

سنہ ۱۸ھ میں سوید بن مقرن نے جرجان فتح کیا یہاں ایسے ایسے باکمال اور صاحب فن علمار کی ایک جماعت پیدا ہوئی جن سے استفادہ و تحصیل علم کے لئے لوگ دور دراز سے آتے تھے۔

یہاں کی شراب نہایت لطیف اور عمدہ ہوتی تھی۔ ابن خزیم نے ذیل کے اشعار اسی شراب کی تعریف میں کہے ہیں۔ اشعار

جُرجان کی زاہد فریب اور توبہ شکن شراب ناب جس پر ابھی کسی غلط اندیش صوفی اور بداندیش واعظ کی نگاہ نہیں پڑی تھی جب میں سوز ہاتھا تو مجھی لے کر آیا میں نے کہا خود نوش جان کر دیا کسی کو سوغات دیدو، جب شباب کے جنون و مستی میں میں نے اسے منہ نہیں لگایا تو اب بڑھاپے کے سفید دامن پر کیا بٹہ لگاؤں گا۔ جب انسان کی عمر چالیس سے اونچی ہو جائے اور وہ اس پر بھی عقل و خرد اور ہوش و آگہی کے تقاضے محسوس نہ کرے تو اسے رہنے دو اس کے گرد لہو و لعب، عیش و طرب اور راحت و آرام کے جتنے اسباب و وسائل جمع ہوں ہونے دو۔ اب اس دیوانے کا سنبھلنا مشکل ہے، اب اس گرتے کو تھامنے کی کوئی صورت نہیں۔

یاقوت لکھتا ہے کہ کوفہ والوں کا قول ہے کہ جو شخص ان گذشتہ اشعار کی روایت نہیں کرتا اُس میں مروت کی کمی ہے۔ یاقوت ہی کا بیان ہے کہ جب مسلم بن الولید (صریع الغوانی) جرجان میں مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اتفاق سے اُس کی نگاہ کھجور کے ایک ایسے درخت پر پڑی جس کے بغیر پورے جرجان میں اور کوئی کھجور کا درخت نہ تھا تو فرطِ حسرت و تاسف سے کہنے لگا۔

أَلَا يَا نَخْلَةً بِالسَّفْحِ مِنْ أَكْنَافِ جُرْجَانِ

أَلَا إِنِّي وَإِيَّاكِ بِجُرْجَانَ غَرِيبَانِ

لہ اے پورے جرجان کی تنہا کھجور! تم اور میں دونوں جرجان میں مسافر و تنہا ہیں۔

غزالی نے ابونصر اسمٰعیلی سے تحصیل علم کے لئے جرجان کا سفر کیا اور وہ تعلیقات جو طوس کی طرف مراجعت کے وقت غزالی سے ڈاکوؤں نے چھین لی تھیں وہ اسی استاذ کے سامنے مرتب کی تھیں۔

دِمشق

یاقوت حموی کی معجم البلدان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دِمشق کی عظمت و تقدیس کے متعلق عربوں میں کیسی کیسی بعید از قیاس داستانیں اور کیسے کیسے دور از کار افسانے مشہور تھے سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابھی تک اس کے موسس اور بانیٔ اول کی تحقیق نہیں ہو سکی کوئی کہتا ہے کہ دماشق بن قانی بن مالک بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام نے اس کی بنیاد رکھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کی کل عمر طبعی سات ہزار سال ہے اور جب تخلیق عالم پر تین ہزار ایک سو پینتالیس سال گزر چکے تو اس وقت دمشق کی بنیاد رکھی گئی اور حضرت ابراہیم کی ولادت اس کے پانچ برس بعد ہوئی بعض لوگ حضرت ابراہیم کے غلام عازر کو دمشق کا بانی قرار دیتے ہیں۔

سب سے زیادہ حیرت افزا اور دلچسپ قول یاقوت کا ہے وہ کہتا ہے کہ "ثقہ اور معتبر مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اس جگہ قیام فرماتے تھے جسے آج کل بیت انات کہتے ہیں حضرت حوا بیت لہیا میں، ہابیل جو بھیڑ بکریاں پالتا تھا وہ مقری میں اور قابیل جو کھیتی باڑی کرتا تھا وہ قلنیہ میں رہتا تھا اور یہ سب مقامات دمشق کے نواحی میں ہیں" حیرت ہے کہ اس مورخ شہیر کو اتنی سی بات بھی نہ سوجھ سکی کہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السّلام کا زمانہ اس قدر بعید ہے کہ معتبر و غیر معتبر کسی مؤرخ کی نگاہ بھی اس زمانے کو نہیں پا سکتی۔

ہم یہاں یہ نکتہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ کسی مقام سے مخصوص قسم کی مقدس روایات وابستہ کر دینا جہاں لوگوں کی کم عقلی اور سادگی کی بڑی دلیل ہے وہاں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی داستانیں سننے سے لوگوں کے دلوں میں سیر و سیاحت کا والہانہ

شوق اور جذبہ پیدا ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے بے شمار افراد جب یہ سنتے ہیں کہ دمشق انبیاء کا گہوارہ ہے اور حضرت ابراہیم کی مسجد اور حضرت موسیٰ علیہما السّلام کا مزار بھی یہیں ہے اور بہشت کی کوئی نعمت ایسی نہیں جو یہاں دستیاب نہ ہوتی ہو تو دیوانہ وار دمشق کی جانب دوڑتے ہیں۔

لوگوں میں مشہور تھا کہ عجائب عالم چار ہیں، سنجہ کا پل، اسکندریہ کا مینار، رہا کا گرجا اور دمشق کی مسجد، اس مسجد کی تعمیر ہونے کی بھی ایک عجیب اور دلچسپ داستان ہے۔ کہتے ہیں کہ ولید بن عبدالملک نے جب یہ مسجد تعمیر کرنا چاہی تو دمشق کے عیسائیوں کو بلا کر کہا کہ ہم تمہارے گرجے کا کچھ حصہ مسجد میں شریک کر کے مسجد کو وسیع کرنا چاہتے ہیں، اس کے بدلے چاہے تو وہ چند قیمت لے لو اور چاہے جہاں تمھیں پسند ہو ہم دوسرا گرجا تعمیر کر دیتے ہیں، عیسائیوں نے انکار کر دیا اور حضرت خالد بن ولید کا عہدنامہ دکھایا اور ساتھ ہی کہا کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ جو شخص اس گرجے کو گرانے یا کوئی گزند پہنچانے کا ارادہ کرے گا وہ مر جائے گا ولید نے کہا تو اچھا میں ہی سب سے پہلے یہ اقدام کرتا ہوں ولید اس وقت زرد رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھا اٹھا اور گرجا گرانا شروع کر دیا، اس کی پیروی میں دوسرے لوگ بھی گرانے میں شریک ہو گئے اور اس طرح مسجد کو حسب منشا وسیع کر لیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس مسجد کی تعمیر میں نو برس تک دس ہزار آدمی کام کرتے رہے موسیٰ بن حماد بربری کہتا ہے کہ "میں نے اس مسجد میں شیشے کے ایک کتبے میں سورۃ (الھٰکم التکاثر حتّٰی زرتم المقابر) سنہری حروف میں کندہ دیکھی حتّٰی زرتم المقابر کے قاف میں ایک نفیس اور بیش بہا سرخ رنگ کا موتی جڑا ہوا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ موتی ولید کی بیٹی کا تھا جب وہ مر گئی تو اس کی والدہ نے اصرار کیا کہ یہ موتی بھی اسی کے ساتھ دفن کر دیا جائے ولید کے حکم سے یہ موتی (حتّٰی زرتم المقابر) کے قاف میں جوڑ دیا گیا اور ولید نے قسم کھا کر بیوی کو یقین دلا دیا کہ میں نے اسے مقابر میں دفن کر دیا ہے۔ جاحظ نے کتاب البلدان میں بعض سلف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ چونکہ صبح و شام اہل دمشق اس حسین مسجد کی صورت میں جنت کا نمونہ دیکھتے رہتے ہیں اس لئے ان سے

زیادہ جنت کا کوئی عاشق و شیدا نہیں" یاقوت کہتا ہے کہ اس مسجد کی بڑی اعجوبہ کاری یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فرض کرو سو برس تک زندہ رہے اور ہر روز اس مسجد کی سیر کیا کرے تو ہر روز اس مسجد کی صنعت گری کا ایک نیا اور مختلف شاہکار اس کے سامنے آئے گا،" آگے چل کر کہتا ہے "یہ مسجد طویل عرصے تک اپنی خوبصورتی کے لئے چار دانگ عالم میں مشہور اور ضرب المثل رہی ہے ۱۶۱ھ میں اس میں کسی وجہ سے آگ لگ گئی اس لئے اب اس میں وہ پہلی سی خوبصورتی اور کشش باقی نہیں رہی۔"

شعراء نے دمشق کی مدح و تعریف میں بے شمار قصائد لکھے ہیں ابوالمطاع بن حمدان کہتا ہے

"غوطہ[1] اور اہل غوطہ کو اللہ آباد رکھے اس کے جنوبی حصے سے میری کچھ پرانی یادیں وابستہ ہیں جب پانی منہ سے لگاتا ہوں تو بردی[2] اور نیربین کی طرف کشش اور شوق کی وجہ سے سینے میں ایک ہوک اٹھتی ہے جس کے فراق کے تصور ہی سے میرا رواں رواں کانپتا اور کلیجہ منہ کو آتا تھا آج جب وہ وقوع میں آگیا ہے تو جانتے ہو میری کیا کیفیت ہوگی ہے

اپنی خوشی اور مرضی سے میں تم سے جدا نہیں ہوا بلکہ آہ! یہ جوگ شاید اپنے مقدر میں ہوگا۔

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو ۔۔۔ پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

صنوبری کہتا ہے۔

دمشق والوں کے لئے دمشق ایک آیۂ رحمت ہے بلکہ یوں کہئے کہ دنیا نام ہی دمشق کا ہے سر سبز و شاداب باغوں کے بیچوں بیچ بلور کی طرح صاف اور شفاف نہریں ناگوں کی طرح بل کھاتی پھرتی ہیں ان باغوں کے پھل نہایت خوش کن اور روح پرور منظر پیش کر رہے ہیں کہیں سیب ہے جس نے خدِ یار سے کچھ سرخی مستعار لی ہے کہیں رنگترہ ہے جو اپنے گول اور سڈول بدن

---

[1] غوطہ دمشق کا ایک نہایت پر فضا مقام ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں چار بہشت ہیں۔ صغد، اُبلّہ، شعب بوان، غوطۂ دمشق (مترجم)

[2] بردی دمشق کی ایک بڑی نہر اور نیرب یا نیربین دمشق کا ایک قریہ ہے۔ (مترجم)

غرور میں دوشیزہ کے سینے پر ترچھی نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔

بحتری کہتا ہے

دمشق کی تعریف و توصیف میں جس قدر مبالغے اور اغراق سے کام لیا جائے کم ہے، اس جیسا دنیا میں کوئی حسین و جمیل شہر نہیں۔ اس کے پہاڑوں پر ابر پاروں کے غول کے غول اڑتے پھرتے ہیں اس کا صحرا کیا ہے ایک وسیع تختۂ چمن ہے جب دیکھو جھڑی لگی ہوئی ہے اور پر میوہ شاخیں لہک لہک کر اور خوش لحن پرندے چہک چہک کے جنت نگاہ اور فردوس گوش کا سامان کر رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کا موسم آتے ہی اُلٹے پاؤں پھر گیا ہے، یا بہار کے قافلے اور موسم گل کے کارواں رخصت ہوتے ہی دوبارہ پھر عود کر آئے ہیں۔

غرضیکہ متقدمین نے دمشق اور اس کی مسجد کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں لیکن غزالی اور دمشق کے باہم رابطہ اور تعلق کو سمجھنے کے لئے شاید دمشق کا اتنا مختصر سا ذکر ہی کافی ہو، غزالی پہلی مرتبہ ۴۸۹ھ میں چند دنوں کے لئے یہاں آئے اور پھر واپس چلے گئے، دوسری مرتبہ جب آئے تو طویل عرصہ تک جامع دمشق کے غربی مینار میں گوشہ نشیں اور معتکف رہے۔ علامہ سبکی کہتے ہیں کہ ایک روز اتفاق سے غزالی جامع اموی میں بیٹھے تھے اور علماء کی ایک جماعت مسجد کے صحن میں ٹہل رہی تھی کہ ایک دیہاتی آیا اور ان علماء سے ایک فقہی مسئلہ دریافت کیا لیکن یہ علماء اس کا کوئی جواب نہ دے سکے، غزالی یہ سارا قصہ بغور دیکھ رہے تھے انھیں گوارا نہ ہوا کہ یہ شخص ناکام اور بے نیل مرام واپس جائے انھوں نے اس کو بلایا اور پوری تفصیل سے مسئلے کے تمام پہلو اس کو سمجھائے۔ دیہاتی غزالی سے مذاق کرنے لگا اس نے خیال کیا کہ جس مسئلے کا جواب ان جیسا جلیل القدر علماء سے نہیں بن پڑا اس کا جواب یہ درویش کیا دے گا۔ جب علماء نے یہ منظر دیکھا تو دیہاتی کو واپس بلایا اور اس سے پوچھا یہ فقیر کیا کہتا تھا (غزالی اُن دنوں فقیروں اور درویشوں کے بھیس میں تھے) دیہاتی نے سارا ماجرا من و عن کہہ دیا چنانچہ یہ علماء غزالی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تعارف کے بعد ان سے درخواست

کی کہ یہاں ایک حلقۂ درس قائم کریں۔ غزالی نے وعدہ تو کر لیا لیکن پھر راتوں رات دمشق سے نکل کھڑے ہوئے اور چلے گئے۔

غزالی کا تعلق دمشق سے بہت گہرا اور وسیع ہے لیکن بغرض اختصار ہم صرف اتنے ہی ذکر پر اکتفا اور قناعت کرتے ہیں۔

بیت المقدس

یہ اُن مقامات میں سے ہے جنھیں عرب بالعموم اور مسلمان بالخصوص نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کی تعظیم و تقدیس کی روایات وضع کرتے وقت پرِ پرواز تخیل نے جہاں تک ساتھ دیا خوب خوب غلو و اغراق سے کام لیا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا جو چاہو مانگو میں دوں گا حضرت سلیمان نے کہا اے اللہ میرے گناہ بخش دے۔ اللہ نے کہا بخش دیئے حضرت سلیمانؑ نے کہا اے اللہ جو شخص اس مقام میں عبادت کی غرض سے آئے اُسے بھی بخش دے اور اُسے گناہوں سے ایسا پاک اور صاف کر دے جیسا کہ وہ پیدا ہوا تھا اللہ نے کہا ایسا ہی ہو گا۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا جو محتاج و فقیر یہاں آئے اُسے غنی و مالدار کر دے اور جو بیمار و نزار یہاں آئے اُسے شفا بخش دے۔ اللہ نے کہا ضرور ایسا ہی ہو گا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر ہوئی آپ نے فرمایا مسجد حرام، میں نے کہا اُس کے بعد آپ نے فرمایا بیت المقدس، اور ان دونوں کی تعمیر کے مابین چالیس برس کا عرصہ و وقفہ تھا۔ حضرت کعب سے منقول ہے کہ قیامت کے قریب دجال کے پُر آشوب اور پُر فتن ایام میں مسلمانوں کا آخری مامن اور جائے پناہ بیت المقدس ہی ہو گی دجال بیت المقدس کا محاصرہ کر لے گا اور مسلمان مارے بھوک کے اپنی کمانوں کے چلّے تک کھا جائیں گے وہ اسی پریشانی و اضطراب اور غم و حزن کے عالم میں ہوں گے کہ صخرۂ[1] بیت المقدس

---

[1] صخرہ یا قبۂ صخرہ مسجد اقصیٰ ہی کے ایک حصّے کا نام ہے۔ مزید تفصیل کے لئے بیت المقدس کے تحت یاقوت حموی کی معجم البلدان کی طرف رجوع فرمائیے۔ مترجم

کی طرف سے کسی شخص کی آواز آئے گی مسلمان کہیں گے یہ تو کسی قوی ولوانا کی آواز ہے، اتنے میں حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نمودار ہوں گے۔ دجال انھیں دیکھ کر بھاگ جانے کی کوشش کرے گا لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام تعاقب کرکے باب اللد میں اُسے قتل کر دیں گے۔ تقریباً تمام راوی اس امر پر متفق ہیں کہ قیامت کا میدان یہیں قائم ہوگا اور سب لوگ حشر ونشر کے بعد یہیں جمع ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس میں بعض عجیب وغریب اور پُر اسرار چیزیں بنائی تھیں، مثلاً ایک گنبد میں زنجیر لٹک رہی تھی سچے آدمی کا ہاتھ تو اُس تک پہنچ سکتا تھا لیکن جھوٹے کا نہیں پہنچتا تھا آخر کسی نامعلوم طریقے سے یہ زنجیر غائب ہوگئی۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام نے ایک نہایت مضبوط اور محکم مکان تعمیر کیا اور اُس کی دیواروں کو اس درجہ صیقل ومصفی کیا کہ اُس سے بآسانی نیک وبد میں تمیز ہو سکتی تھی۔ اگر نیک آدمی اس مکان میں داخل ہوتا تو دیواروں میں اُس کا عکس سفید اور اگر بد داخل ہوتا تو اُس کا عکس سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ اسی مکان کے ایک گوشے میں آبنوس کا ایک عصا رکھا تھا، اگر کوئی نبی زادہ اسے ہاتھ لگاتا تو اُسے کوئی گزند نہ پہنچتا، لیکن اگر کوئی دوسرا شخص اسے چھونے کی کوشش کرتا تو اُس کے ہاتھ جل کر بھسم ہو جاتے۔ یاقوت کہتا ہے کہ متقدمین نے اس عصا کے اور بھی بہت کچھ خواص بیان کئے ہیں لیکن ان کا ذکر موجب تصدیع ہے۔" کاش یاقوت نے اس عصا کے وہ فوائد وخواص بھی بیان کر دئے ہوتے تاکہ ہماری معلومات میں بیش بہا اور قابل قدر اضافہ ہو جاتا۔ بیت المقدس کے مذکورہ بالا اوصاف وخواص کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے متقدمین کی نگاہ مختلف اشیا کی حقیقت وماہیت کی تلاش اور سراغ میں کس قدر عام اور سطحی تھی۔ یاد رکھیے بیت المقدس کی زیارت کسی کو گناہوں سے پاک نہیں کر سکتی، بجز دوسرا اس کی زیارت کے کوئی شخص محتاج سے مالدار اور بیمار سے تندرست نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں مسجد حرام کی بنیاد اور اُس کے چالیس برس بعد بیت المقدس کی تعمیر کے متعلق کوئی وقیع اور قابل اعتبار سند نہیں ملتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی احادیث کی نسبت کذب وافترا اور موضوع ومردود ہے۔ دجال کا بیت المقدس کا محاصرہ کرنا اور

مسلمانوں کا بھوک کی شدت سے اپنی کمانوں کے چلّے تک کھا جانا بالکل غلط اور باطل ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں اب کبھی واپس نہیں آئیں گے[۵] اور فرض کیجیے کہ ایسا ہو بھی تو بھی اس امر کی کیا ضمانت اور کیا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کے پاس اُن ایام میں کمانوں اور تیروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی اس پر اسرار زنجیر کو بھی نہ بھولیے جس تک سچے کا ہاتھ تو پہنچتا مگر جھوٹے کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ محض خیال آفرینی اور واہمہ کی کارپردازی ہے معلوم نہیں وہ مکان بھی کتنا عجیب و غریب ہوگا جس کی دیواروں میں نیک کا عکس سفید اور بد کا سیاہ پڑتا تھا۔

بیت المقدس کے مذکورہ بالا اوصاف پڑھ کر یقیناً آپ کے ذہن میں بیت المقدس کا ایک اجمالی سا نقشہ اور تصویر آ گئی ہوگی۔ اس میں حضرت ابن عباس کے ان اقوال کا مزید اضافہ کر لیجیے کہ بیت المقدس کو انبیا نے تعمیر کیا، انبیا ہی اس میں رہے، اس میں ایک بالشت بھر بھی جگہ ایسی نہیں جہاں کسی نہ کسی نبی نے نماز نہ پڑھی ہو یا کسی نہ کسی فرشتے نے عبادت نہ کی ہو کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ طوفانِ نوح کی مصیبت سے سب سے پہلے بیت المقدس نکلا، قیامت کا صور یہیں سے پھونکا جائے گا اور قیامت کی منادی اسی کے مینار سے ہوگی۔

اب آئیے دیکھیں غزالی بیت المقدس کے متعلق کیا کہتے ہیں" المنقذ من الضلال" میں لکھتے ہیں کہ میں بیت المقدس کا سفر عموماً کیا کرتا تھا اور صخرہ میں داخل ہو کر دروازے بند کر دیتا اور دن بھر عبادت و ذکر اور یادِ الٰہی میں مستغرق و مصروف رہتا۔ اس اثنا میں مجھ پر وہ امور منکشف ہوئے ہیں جن کے بیان کے لئے زبان کو یارائے گفتار نہیں۔"

یہ مقامات جن کو عوام کی مبالغہ پسندی اور خیال آرائی نے ایک خاص عظمت و تقدس کا رنگ دیدیا ہے اور ان کی فضیلت میں احادیث تک گھڑلی گئی ہیں۔ ان سے غزالی کا ذہن شعور بھی نہایت متاثر ہے اور زندگی کا ایک خاص سانچہ بناتے وقت غزالی نے انھیں پوری طرح

---

[۵] اہل سنت کے عام اور مسلّمہ عقیدے سے کھلا تخلّف ہے۔ مترجم

پیش نظر رکھا ہے۔ اگر طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو ہم دوسرے اُن مقامات کا بھی ذکر کرتے جن کی غزالی نے سیر و سیاحت کی ہے لیکن بغرض اختصار صرف چند گزشتہ مقامات کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ساتویں فصل

غزالی کے زمانے کے مشاہیر

اس میں شبہ نہیں کہ ہمیں غزالی کے معاصرین میں سے ان کے اساتذہ کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہیے اس لئے کہ ان کی ذہن کی تعمیر میں اُن کا خاص حصہ ہے لیکن اس سے قبل ہم غزالی کے دوسرے معاصرین کا ذکر کرتے ہیں تاکہ آپ بخوبی اندازہ کر سکیں کہ اُس زمانے میں علماء کی عام عقلی اور ذہنی سطح کیا تھی۔ ہم یہاں اس حقیقت کو دوبارہ دہرائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری غرض اور ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو غزالی کے زمانہ و عہد سے ایک گونہ قریب کر دیں رہا یہ کہ اُس زمانہ میں عام نظری اور فکری میلانات و رجحانات کیا تھے، سو اُس کی وسعتوں اور پہنائیوں کی متحمل یہ کتاب نہیں ہو سکتی۔ ہم یہاں صرف اخلاق کے باب میں غزالی کے افکار و آراء سے بحث کریں گے۔

شہرستانی

ابوالفتح محمد بن عبدالکریم شہرستانی ۴۷۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۴۸ھ میں وفات پائی۔ نیشاپور میں ابوالحسن علی بن احمد مدینی سے تحصیل علم کی علامہ سبکی نے طبقات[1] میں ان کے دوسرے اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کی سب سے زیادہ عمدہ اور مشہور تالیف (کتاب الملل والنحل) ہے اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ چونکہ مجھے مختلف مذاہب و ادیان کا لٹریچر پڑھنے اور اُن کے آراء

---

[1] طبقات ج ۴ ص ۷۸

معتقدات کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس مطالعہ کا نتیجہ
حاصل ایک جامع کتاب کی صورت میں جمع و مدون کردوں تاکہ عبرت پذیر دماغوں کے لئے بصیرت
اور رہنمائی کا موجب ہو" جہاں اس کتاب میں یہ بہت بڑی خوبی اور کمال ہے کہ ہم نہایت سہولت
اور آسانی کے ساتھ مختلف مذاہب کے نظریات پر مطلع ہو جاتے ہیں وہاں اس کتاب میں ایک
بڑا عیب اور نقص یہ ہے کہ بعض ایسے مباحث اور مقامات جہاں نہایت بسط و تفصیل سے کام
لینا چاہیئے تھا، ان میں نہایت ایجاز و اختصار بلکہ اجمال و ابہام سے کام لیا گیا ہے۔ چونکہ اس
کتاب میں فلاسفہ کے نظریات کی بڑی شد و مد کے ساتھ نصرت و حمایت کی گئی ہے اس لئے بعض
معاصرین نے انھیں بد اعتقاد اور کج فکر بھی کہا ہے لیکن آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ فلاسفہ کے
ہمنواؤں کے عقائد و نظریات میں رخنے نکالنا اور اُن پر طرح طرح کے عیب اور اتہام تراشنا
اس عصر کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے۔

ابیوردی

ابوالمظفر محمد بن احمد ابیوردی حضرت امام الحرمین کے شاگرد ہیں۔ ان کے تمام ہم عصروں
نے ان کے حسن عقیدہ کی تعریف کی ہے (اس زمانے کے تمام علماء حسن عقیدہ اور صحت نظریہ کے لئے
عوام کی شہادت کے محتاج تھے گویا علم بھی کوئی خرافات کا مجموعہ ہے جس کے لئے خواص کی نسبت
عوام کی شہادت وسند کی زیادہ ضرورت ہے) ابیوردی چونکہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ خلافت
کا مستحق سمجھتے تھے اس لئے انھیں زندگی میں بے شمار مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار بغداد
سے ہجرت کے لئے مجبور ہو گئے، کچھ عرصے تک ہمدان میں تدریس و تالیف کا مشغلہ رکھا اگرآخر ربیع الاول
۵۰۷ھ میں کسی کی زہر خورانی سے اصفہان میں انتقال کیا۔

ابیوردی بہت قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر ہیں تحمل اور بردباری کے موضوع پر ان کے
اشعار نہایت رقّت انگیز، دل گداز اور وجد آفریں ہیں۔ کوئی کم ہی ایسا ادیب ہوگا جس کو ان کے
دو شعر یا مضمون، اشعار یاد نہ ہوں۔

زمانہ مجھے بہت ڈانٹ دکھاتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ میں کتنا سخت جاں اور سخت کوش ہوں وہ رہ رہ کر مجھے مصائب و حوادث کی تلواریں دکھاتا ہے اور میں رہ رہ کر صبر و تحمل کی سپر دکھاتا ہوں۔

سب سے زیادہ رقت انگیز اشعار وہ ہیں جن میں اُن احباب کی طرف کشش اور شوق کا اظہار کیا ہے جو بغداد میں داد عیش دے رہے ہیں۔ اشعار

"اے کاش کبھی ایسا بھی ہو گا کہ میں غیضہ[1] کے مقام پر دوپہر یا رات کو آرام اور چین کی کروٹیں لے رہا ہوں گا جس کی ہوا عشق و محبت کے زمانے کی طرح صاف و بے میل اور محبوب کی چشم بیمار کی طرح بیمار و سبک رفتار ہو گی اور جس کی شام رنگیں کے گیسوؤں میں ہوا کے نرم نرم جھونکے اٹھکیلیاں کر رہے ہوں گے۔ آہ اس سرزمین کی ہر کنکری موتی ہے اس کی خاک کا ہر ذرہ مشک بار و عنبر بیز ہے، اس کے پانی کے ہر ہر جرعہ میں شراب کی سی مستی و کیف پنہاں ہے حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا سارا مزہ و عیش وہیں ہے۔ وہاں رات نہایت مختصر اور دوپہر نہایت ٹھنڈی ہے۔ اے وہ دوستو! جو بغداد میں ہو تا دتم تو خوش ہو، آہ میرے حصے میں تو تمہاری فرقت میں آہ و زاری اور نالہ و شیون ہی آیا ہے۔ میں تمہاری یاد میں کانٹوں کے بستر پر لوٹ پوٹ رہا ہوں اور کسی کروٹ چین نہیں پڑتا، تمہارے قرب و یک جائی کا سارا زمانہ اُس ایک رات کے مقابلے میں مختصر ہے جو تمہاری فرقت و جدائی میں کاٹ رہا ہوں"

مہینے وصل کے گھڑیوں کی مانند اڑتے جاتے ہیں مگر گھڑیاں جدائی کی گذرتی ہیں مہینوں میں

ارجانی

احمد بن حسین نام اور ابوبکر کنیت ہے ۴۶۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور ۵۴۴ھ میں انتقال کیا۔ اصل و مولد کے اعتبار سے شیرازی تھے اور ایک عرصہ تک تستر میں عہدۂ قضا پر فائز

---

[1] غیضہ مرغزار یا سرسبز درختوں کے جھنڈ کو کہتے ہیں لیکن اسی نام کا عراق میں ایک مقام بھی ہے۔ میں نے سیاق و سباق کے تقاضے سے دوسرے مفہوم کو ترجیح دی ہے لیکن چونکہ غیضہ و بغداد میں فاصلہ کافی ہے اس لئے آپ چاہیں تو پہلا مفہوم اختیار کر سکتے ہیں۔ مترجم

رہے، شعر و سخن میں بہت اونچا درجہ رکھتے تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو، اشعار

,, محبوب نے رخصت ہوتے وقت عاشق کی تسلی کے لئے چہرے سے نقاب الٹ دی اور ظاہر کیا کہ میں بھی تمہارے غم عشق میں تمہاری ہی طرح رو دھو رہی ہوں اُس کے عارض رنگین پر آنسو ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے گلنار پر شبنم کے موتی پڑے ہوں۔ ہم دونوں کے آنسو بظاہر یک رنگ ہیں لیکن حقیقت میں بہت فرق ہے، اُس کے آنسوؤں نے رخساروں سے سرخی مستعار لی ہے اور میرے اشک ہائے غم نے رخساروں کو خونیں کر دیا ہے، اُس کے رخساروں پر آنسو ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شیشے میں شراب ارغوانی۔

آپ چاہیں تو ادب و تاریخ کی کتب میں پانچویں صدی ہجری کے دوسرے علما و مشاہیر کے حالات بھی پڑھ سکتے ہیں تاکہ اس صدی کا عام ذوق سمجھنے میں آپ کو سہولت ہو لیکن ہم یہاں اسی اختصار پر قناعت کرتے ہیں۔

دوسرا باب

حیاتِ غزالی

تمہید

چونکہ ہمارے پیش نظر اور زیر بحث غزالی کی زندگی کا یہی ایک پہلو ہے کہ جب انھوں نے اخلاق میں کتابیں تالیف کیں تو اس وقت اُن پر کیا کیا اثرات ضوفگن تھے اس لئے یہاں اُن کی زندگی کی بقیہ شاخوں کے بیان میں بہت ایجاز و اختصار سے کام لیا جائے گا۔

ہمارے سامنے غزالی کی خود نوشت سوانح (AUTOBIOGRAPHY) المنقذ من الضلال کی صورت میں موجود ہے جس میں انھوں نے اپنے ذہنی اور عقلی ارتقاء کا تدریجی حال پوری تفصیل سے قلمبند کیا ہے اس لئے ہم کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ان کے مختلف سوانح نگاروں کی طرف احتیاج کا ہاتھ پھیلائیں کیونکہ ان کے ہاں غزالی کی مدح سرائی اور عقیدتمندی کے خوبصورت اور رنگ برنگ پھول اور گلدستے تو بکثرت مل سکتے ہیں لیکن صحیح حالات دستیاب نہیں ہو سکتے اُن کے ہاں غزالی معصومیت کے اُس عرش پر پہنچ چکے تھے جہاں خطا اور لغزش تو بڑی بات ہے خطا اور لغزش کا تصور بھی تقریباً ناممکن اور محال ہے اور اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ کسی کو غزالی پر نقد و جرح کی جرأت و جسارت کرنی ہی نہیں چاہیے۔

پہلی فصل

خاندان

غزالی ایک ایسے گم نام اور مجہول الحال خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ذکر و تفصیل سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔ صرف ان کے والد اور بھائی کے کچھ حالات کہیں کہیں ملتے ہیں چنانچہ ہم انھیں سے اندازہ کرنا چاہتے ہیں کہ غزالی کے خاندان کا عام ذوق کیا تھا۔

علامہ سبکی طبقات[1] الشافعیہ میں لکھتے ہیں "غزالی کے والد درویش صفت، صوفی منش، پارسا اور نہایت غیور انسان تھے، اپنے ہاتھ سے پشم اور اون کاتتے اور اس سے جو کچھ ملتا صرف اسی میں اپنا گذارہ کرتے، علماء و مشائخ کی صحبت و خدمت میں عموماً حاضر ہوتے اور اپنی کمائی میں سے جو حصہ بچتا اسے بھی انھیں کے قدموں میں لاکر ڈال دیتے اور خوش ہوتے جب علما کی باہم علمی اور ادبی گفتگو سنتے تو روتے اور اللہ سے دعا مانگتے کہ مجھے بھی بیٹا عطا کر جو ایسی ہی علمی گفتگو کیا کرے۔ جب کسی وعظ و ارشاد کی مجلس میں شریک ہوتے تو ان پر رقت کا عالم طاری ہوجاتا اور بکمالِ دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ اللہ سے دعا کرتے کہ مجھے بھی بیٹا عنایت کر جو ایسا ہی وعظ کہا کرے۔

والد کی دعا کا اثر کہیے یا یوں سمجھے کہ علم و ارشاد کی محبت والفت بیٹوں نے باپ سے ورثہ میں پائی۔ ان کو اللہ نے دو بیٹے دیے اور دونوں عالم اور واعظ ہوئے۔

متعدد مؤرخین کا بیان ہے کہ غزالی کے بڑے بھائی نے جوانی میں کئی ملکوں کی سیر و سیاحت کی جہاں صوفیا و مشائخ کی صحبت و معیت میں اتنی عبادت و ریاضت کی کہ آخر تصوف کے رنگ میں رنگ گئے۔ جب عراق میں آئے تو بغداد میں انھیں حیرت انگیز شہرت اور مقبولیت

---

[1] ج ۴ ص ۱۰۲

نصیب ہوئی پورا کا پورا شہر پروانہ وار اُمنڈ کر آجاتا اور ان کے وعظ کی مجلسوں میں شریک ہوتا، ابن خلکان کہتے ہیں کہ یہ صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ واقع میں یہ فقہ کے آدمی تھے لیکن تصوف ایسا غالب آیا کہ اسی کے ہو رہے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز کسی حافظ نے ان کے سامنے جب یہ آیت پڑھی (یاعِبادِیَ الَّذِینَ اَسرَفُوا عَلٰی اَنفُسِہِم لَا تَقنَطُوا مِن رَّحمَۃِ اللّٰہِ) تو کہنے لگے یا عبادی میں اللہ نے اپنی طرف نسبت کر کے بندوں کا نام بڑا بلند کر دیا ہے اور پھر یہ دو شعر پڑھے، شعر:-

"معشوق کی محبت و عشق میں ناصح کی نصیحت اور دشمنوں کے دیوانگی کے طعن کو میں خاطر میں نہیں لاتا۔ جب مجھے اپنے نام سے پکارا جائے تو میں بہرہ بن جاتا ہوں لیکن "اے اس کے غلام" کہہ کر پکارا جائے تو فوراً لبیک کہتا ہوں۔

ایک روز وعظ میں یہ قصہ بیان کیا کہ "ایک شخص کسی لڑکے پر دل و جان سے فدا اور عاشق اور یہ لڑکا بھی اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ ایک روز صبح سویرے وہ لڑکا دوڑا ہوا آیا اور کہا مجھے دیکھو میں آج سب دنوں کی نسبت زیادہ خوبصورت ہوں عاشق نے کہا وہ کیسے؟ معشوق نے کہا میں نے آج شیشے میں اپنی صورت جو دیکھی تو بہت بھائی میں نے چاہا کہ تم بھی اس پر نگاہ ڈال لو، عاشق نے کہا جب مجھ سے پہلے تم اپنی صورت پر نگاہ کر چکے ہو تو اب یہ صورت میرے کس کام کی؟ اس حکایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری پر ان کی نگاہ کس قدر غائر تھی، عموماً کہا کرتے تھے "جو شخص اللہ کی راہ میں کچھ کھوئے گا، اللہ اس کی جبر و تلافی کر دیں گے"۔ اپنے بھائی غزالی کو ان دو شعروں میں نصیحت کیا کرتے تھے، شعر

"بادشاہوں کی صحبت میں انتہائی احتیاط ملحوظ رکھو، جب ان کے دربار میں جاؤ تو اندھے بن کر جاؤ اور جب ان کے پاس سے نکلو تو گونگے بن کر نکلو۔

ازہر میں ہمارے اساتذہ ان کے قصے مزے لے لے کر سناتے اور بتاتے کہ غزالی نے اپنے

---

۱ اسامہ بن فارس نے ان کے مواعظ جمع کئے ہیں جن کی تعداد ۸۳ تک پہنچتی ہے۔

ماکوی، فیاض، ... زمانہ کا ... کی ... کیفیت ... کا ... ہے ... ایران ... کی ... ہے

بھائی سے کتنا بڑا اثر قبول کیا ہے۔ اور وہ خود نیکی اور صلاح میں کتنے ضرب المثل تھے لیکن جب ہم نے ان قصوں کی حجت و سند کے لئے کتابوں کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ وا ہمہ اور تخیل کی صنعت گری کے سوا ان کی کوئی وقعت و حقیقت نہیں۔

اگر ہم مذکورہ بالا امور میں اس حقیقت کا اضافہ اور کر لیں کہ بچپن ہی میں غزالی کے سر پر سے والد کا سایۂ شفقت اُٹھ گیا تھا اور اُن کی وصیت کے مطابق ایک صوفی اور درویش نے دونوں بھائیوں کی کفالت اور سرپرستی کا بوجھ اُٹھایا تو ہمیں یہ سمجھنے میں سہولت ہو جاتی ہے کہ خاندان کے ساتھ ابتدائی ماحول نے بھی غزالی پر تصوف کا وہ رنگ چڑھانے میں کتنی امداد کی جو آگے چل کر اخلاق کے باب میں اُن کی تمام تالیفات پر چھا گیا۔

دُوسری فصل

ولادت اور طلبِ علم

غزالی ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم طوس ہی میں احمد بن محمد راذکانی سے حاصل کی کچھ ہوش سنبھالا تو امام ابو نصر اسمٰعیلی سے استفادہ و تحصیل علم کے لئے جرجان کا سفر کیا اور وہیں تعلیقات مرتب کیں کچھ عرصہ بعد طوس واپس آ گئے اور کامل تین برس تک ان تعلیقات کے حفظ کرنے میں مصروف رہے اس سے فارغ ہوئے تو امام الحرمین سے منطق، فقہ اور اصول کی تحصیل کے لئے مدرسہ نظامیہ (نیشاپور) کا رُخ کیا اور امام الحرمین کی وفات (۴۷۸ھ) تک انھیں کی خدمت میں رہے، اُستاذ کی وفات کے بعد نیشاپور کے قریب نظام الملک کی قیام گاہ "عسکر" میں چلے گئے۔ اس وقت غزالی کی عمر کل اُٹھائیس برس تھی۔ ان کی علمی شہرت ان سے پہلے نظام الملک تک پہنچ چکی تھی۔ وہ نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور اپنی علمی اور ادبی صحبتوں میں شریک ہونے کے لئے اصرار کیا۔ غزالی نے اپنے خزانۂ دماغ میں جو جواہر پارے جمع کئے ہوئے

تھے اُن کو پھیلانے اور لٹانے کے لئے یہ موقع غنیمت سمجھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظام الملک کی مجلسوں میں شریک ہونے والے تمام علماء پر فضیلت و بازی لے گئے اور اُن کے سامنے کسی کی پیش نہ چل سکی۔ نظام الملک نے ان کے علم و تبحر سے متاثر ہو کر ۴۸۴ھ میں نظامیہ بغداد کی تدریس کی خدمت ان کے سپرد کی اور انھیں بغداد روانہ کر دیا۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ غزالی خود اپنی طلب علم کے ابتدائی دور سے لے کر پچاس برس تک کی علمی مصروفیتوں کے متعلق کیا کہتے ہیں:۔

"بیس برس کی عمر کے کچھ ادھر سے لے کر کہ عین عنفوان شباب کا زمانہ تھا آج تک کہ عمر پچاس سے آگے قدم بڑھانا چاہتی ہے، جب کبھی علم کے بحر ناپیدا کنار میں قدم رکھا مردانہ وار رکھا دون ہمتی اور بزدلی کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا۔ علم کا کوئی ایسا تاریک گوشہ نہیں جس میں عقل کا چراغ لے کر نہ پہنچا ہوں کوئی عقدہ ایسا نہیں جسے ناخنِ تدبیر نے حل نہ کیا ہو ہر فرقے اور ہر گروہ کے عقیدے اور نظریے کا بغور مطالعہ کیا، تمام مذاہب کے اسرار و رموز کا کمال احتیاط سے تجزیہ کیا تاکہ حق پسند اور باطل نواز، متبع سنت اور ضلالت پرست سب میں آسانی تمیز کر سکوں۔ باطنیہ کا باطن اور ظاہریہ کا ظاہر دونوں میرے لئے برابر ہیں۔ دونوں میری دیکھی بھالی چیزیں ہیں فلسفیوں کی حکمت اور فلسفے کی تھاہ اور گہرائی ناپ کر چھوڑی متکلمین کے جدل و کلام پر نہایت غائر نگاہ ڈالی، صوفی کے تصوف کا راز فاش کیا کسی عابد کو دیکھا تو گھات میں بیٹھ رہا کہ دیکھوں اس کی عبادت اور زہد کا نتیجہ اور حاصل کیا ہوتا ہے۔ کسی ملحد و زندیق کو پایا تو اس کا تعاقب کیا کہ وہ اسباب معلوم کروں جنھوں نے اس کو اللہ کے انکار کا حوصلہ اور جرات دلائی۔ ہر بات کی ٹوہ اور ہر حقیقت کی گہرائی معلوم کرنے کا جذبہ اور شوق میری فطرت اور میرے خمیر میں تھا اس میں میرے ارادے یا میرے اختیار کو مطلقاً کوئی دخل نہیں تقلید اور جمود کا بندھن جوانی ہی میں پارہ پارہ ہو چکا تھا اور آبائی اور موروثی عقائد کی پٹیاں عین بچپن ہی میں آنکھوں پر سے یکے بعد دیگرے کھل چکی تھیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں پہلی یہ کہ اس زمانے میں فلسفیانہ عقائد نہایت شائع و ذائع اور عام و مشہور تھے اور ان نظریات کے حاملین اپنے عقائد و آرا کی نشر و اشاعت اور ان کی طرف سے دفاع میں انتہائی محنت و کاوش اٹھاتے تھے دوسری بات یہ کہ غزالی اپنے زمانے کے اُن جامد اور تنگ نظر طلبہ سے بالکل مختلف تھے جو صرف ایک ہی رائے پر قناعت کر کے بیٹھ رہتے تھے اور اُسی پر زندہ رہتے اور اُسی پر مرتے تھے ؎

زادی بحجاب اندر میری بحجاب اندر

بلکہ اس کے برعکس وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ہر فرقے، ہر گروہ اور ہر جماعت کے عقائد کی پوری چھان بین کریں۔

گو غزالی نے خود کہیں بیان نہیں کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اُن کے دل میں اپنے مذہب کی طرف سے شک اور تردد کا کانٹا اُس وقت چبھا اور دوسرے مذاہب کی تحقیق کا جذبہ اُس وقت پیدا ہوا جب انھوں نے دیکھا کہ عیسائیوں کے بیٹے عیسائی، یہودیوں کے بیٹے یہودی، مسلمانوں کے بیٹے مسلمان ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے مذہب پر قانع اور خوش ہوتا ہے اور دن رات اس کوشش میں رہتا ہے کہ دوسرے تمام مذاہب پر اپنے مذہب کی فوقیت و مزیت ثابت کرے لیکن حقیقت میں اُس کے پاس کوئی وقیع حجت و سند نہیں ہوتی۔ یہاں پہنچ کر غزالی پوری بلند آہنگی کے ساتھ اس امر کا صاف اعلان کرتے ہیں کہ تقلید سے زیادہ بے وقعت اور بے حقیقت کوئی چیز نہیں ہے

ازاں کہ پیروئی خلق گمرہی آرد نمے رویم براہے کہ کارواں رفت است

اس لئے کہ یہ تو ہر امت اور ہر قوم میں موجود ہے اور اگر کوئی قابلِ قدر و قیمت چیز ہے تو صرف یقینِ محکم کی دولت ہے کہ اگر اُس کے ابطال و تردید میں کوئی شخص پتھر کو سونے اور لکڑی کو سانپ میں بھی تبدیل کر دے تو اُس یقین کی دیواریں نہ ہلیں بالکل ایسا، جیسا کہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ دس کا عدد تین سے بڑا ہے، اب ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ نہیں تین کا عدد بڑا ہے

اور اس کی دلیل یہ لاتا ہے کہ دیکھئے میں اس لکڑی کو سانپ کی صورت میں بدل سکتا ہوں اور پھر وہ ایسا کر بھی دے اور آپ اپنی آنکھوں سے اس سارے تماشے کو دیکھ بھی لیں تو بھی یہی کہیں گے کہ تمہارا کمال بجائے خود مسلم ہے لیکن اس کے باوجود دس کا عدد بڑا اور تین کا عدد چھوٹا ہی ہے۔

تیسری فصل

غزالی کی روحانی زندگی کا آغاز

آبائی اور موروثی تقلید و جمود کی زنجیروں کو غزالی کے ہاتھ نے جب ایک ایک کر کے توڑ ڈالا تو اب انھوں نے اپنے آپ کو ہر طرف سے شکوک و شبہات کے کانٹوں میں گھرا ہوا پایا، چنانچہ یقین کی طرف سفر کے لئے انھوں نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ صرف محسوسات پر قناعت کر کے بیٹھ گئے اور کہا کہ یقین محسوسات ہی کا دوسرا نام ہے لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان کا اعتماد محسوسات پر سے بھی اٹھ گیا انھوں نے دیکھا کہ ہم کسی چیز کے سائے کو دیکھتے ہیں تو حکم لگاتے ہیں کہ یہ ساکن ہے متحرک نہیں لیکن ایک ہی گھنٹے کے مشاہدے اور تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا فیصلہ غلط تھا، یہ ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی حرکت اتنی تدریجی اور اتنی غیر مرئی اور غیر مشاہد تھی کہ ہماری نگاہ کا حاسہ اُسے نہیں پا سکا چنانچہ غزالی محسوسات سے بددل اور مایوس ہو کر ان معقولات کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں جو اپنی جگہ مسلمات کا حکم رکھتے ہیں مثلاً دس کا عدد تین سے بڑا ہے۔ نفی اور اثبات ایک چیز میں جمع نہیں ہو سکتے یا ایک ہی چیز حادث اور قدیم یا موجود اور معدوم یا واجب اور محال، ان مختلف اور متضاد اوصاف کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتی۔ غزالی کہتے ہیں کہ جب میں نے محسوسات سے ناطہ توڑ کر معقولات سے رشتہ قائم کر لیا تو ایک روز محسوسات آ کر کہنے لگیں کہ کل تک تو تم ہمارے ہی جمالِ جہاں آرا کا کلمہ پڑھتے تھے، جب تمہاری پیٹھ فلسفے کی گراں باری سے دکھنے لگتی تھی تو ہم ہی اس کو سہارا

دیتی تھیں، جب تمہارا سر فلسفے کی موشگافیوں سے تھک جاتا تھا تو راحت اور تسکین کے لئے ہماری ہی آغوش کو ڈھونڈتا تھا۔ آج یہ کیا ہوا کہ تم نے ہم سے یک بیک آنکھیں پھیر لیں، یہ کس کافر ادا کی دل رُبائیاں تم کو بھا گئیں۔ یہ کون پری پیکر تھا کہ جس کی نگاہ کا تیر تمہارے دل میں آکر ایسا ترازو ہوا کہ تم سٹی بٹی بھول گئے۔ تمہارا یہ کہنا کہ "یہ نیا محبوب حسن و جمال میں یگانہ ہے فرد ہے۔ اس جیسا آج تک نہیں دیکھا، اس بات کا کیا اعتبار کہ کل تک تم ہمارے متعلق بھی یہی رائے رکھتے تھے۔ رہا یہ کہ تم نے اُس جیسا دیکھا نہیں، سو تمہارا نہ دیکھنا اس امر کی دلیل ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ واقع ہی موجود بھی نہیں، ہوسکتا ہے کہ کل کوئی اور مہ جبین آئے اور تمہیں اپنے فتراک کا نخچیر بنالے اور تمہارے اس نئے محبوب کو اُٹھا کر خود اس کی مسند پر بیٹھ جائے۔[۱] یہ طعن سن کر غزالی پانی پانی ہو جاتے ہیں اور شکوک و شبہات کی ایک نئی اور پُرخطر پُرخار وادی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ ہماری اس دنیا کی خواب اور بیداری کی دو کیفیتوں کے ماورا ایک تیسری کیفیت بھی ہو اور ہماری اِس عالم کی بیداری کو اس کیفیت سے وہی نسبت ہو جو موجودہ عالم کی خواب کو موجودہ عالم کی بیداری سے ہے۔ یہاں پہنچ کر غزالی کے قدم پھر ٹھٹھک جاتے ہیں وہ حیران ہیں کہ یہ کیفیت و حالت کیا ہے، جب قرآن حکیم کی اس آیت پر نگاہ کرتے ہیں (لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ) تو کہتے ہیں کہ چونکہ موت ہی سے انسان پر تمام اشیا کے حقائق منکشف ہوتے ہیں اس لئے لامحالہ موت ہی اس کیفیت و حالت کا دوسرا نام ہے لیکن جب صوفیہ اور مشائخ کے اُن احوال و واردات کا تذکرہ سنتے ہیں جو کشف و استغراق کے عالم میں اُن کو پیش آتے ہیں اور جو بعض اوقات نہ صرف معقولات سے مختلف بلکہ اُن کے

---

[۱] یہ محض سخن آرائی اور سخن طرازی نہیں بلکہ خود غزالی نے اس واقعے کو اپنے اور محسوسات کے مابین مکالمے ہی کی صورت میں لکھا ہے۔ میں نے صرف اتنا تصرف کیا کہ اس مکالمے کے مفہوم کو جام و سبو اور بادہ و ساغر کی زبان میں ڈھال دیا لیکن مطلب کا ادنیٰ سا حصہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

مترجم

...انی ہوتے ہیں تو پکار اُٹھتے ہیں کہ نہیں نہیں یہ کیفیت، صوفیہ ہی کے کسی حال و مقام کا نام ہے
غزالی کہتے ہیں کہ یہاں سے میں پھر مسلّماتِ عقلیہ کی طرف کہ جہاں سے سفر شروع کیا تھا
دوبارہ واپس آگیا۔ لیکن منطق و حکمت کی دست گیری اور اعانت سے نہیں

از منطق و حکمت نکشاید درِ محبوب
اینہا ہمہ آرائشِ افسانۂ عشق است

...کہ اُس چارہ سازِ غیبی کی تائید و نصرت سے جس نے میرے سینے کو نور سے معمور کر دیا۔

ہم غزالی سے اس بات میں نہیں اُلجھتے کہ اللہ کا کوئی ایسا نور بھی ہے جس سے وہ اپنے
...ندوں کے سینوں کو بھر دیتا ہے لیکن دو باتیں پوچھنے کی جرأت ضرور کریں گے۔ پہلی یہ کہ ایسا
...وں ممکن نہیں کہ عقل کے فیصلے بھی اُسی آفتابِ ضیا پاش کی کرنیں ہوں جس کی روشنی سے
...للہ نے خود غزالی کے سینے کو بھر دیا اور دوسری بات یہ ہے کہ اُس محروم و نامراد کی کیا
...فیت ہوگی جو علم و براہین سے دامن جھاڑ کر صرف اُس آفتاب ہدایت کے طلوع کا انتظار
...تا ہے جس کی روشنی سے اللہ کے بندوں کے سینے بھر جاتے ہیں۔

محررہ بالا حقائق سے آپ کو علم ہو گیا ہو گا کہ غزالی نے جب اخلاق میں تالیفات کی
...نا ڈالی تو اُس کے لئے اُنھوں نے اپنے ذہن و دماغ کا کیسا سانچہ تیار کیا تھا غالب گمان
...ہے کہ مدرسۂ نظامیہ بغداد کا عہدۂ تدریس قبول کرنے کے بعد غزالی کی روحانی زندگی کا
...ور شروع ہوا جو آخران کی موت تک برابر باقی رہا۔

چوتھی فصل

زندگی کے باب میں غزالی کا نقطۂ نگاہ

حکمت و فلسفہ کردست گراں خیز مرا
خضرِ من! از سرِ ایں بارِ گراں پاک انداز

غزالی کے اخلاقی نقطۂ نگاہ پر بحث کرنے سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جب انھوں نے علم الاخلاق میں تصنیف و تالیف کی داغ بیل ڈالی تو اس وقت ان کی صحت کیسی تھی، مزاج کیسا تھا؟ زندگی کے باب میں وہ کیا خاص اور متعین نقطۂ نگاہ رکھتے تھے؟ اس لئے کہ ان باتوں کا ہر مؤلف کی تالیف میں بڑا دخل اور بڑا اثر ہوتا ہے اور اگر یہ امور ابتداہی میں اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لئے جائیں تو نہ ہم کسی مؤلف کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی تالیف کے درس و مطالعہ سے کسی صحت مند فیصلے اور نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر و مستند غزالی کی خود نوشت المنقذ من الضلال ہے اس میں انھوں نے اپنی اس دہ سالہ خلوت کی زندگی کی واردات کو نہایت بسط و تفصیل سے قلمبند کیا ہے جس کی مختلف فرصتوں میں انھوں نے احیاء العلوم وغیرہ دوسری کتب اخلاق تصنیف و تالیف کیں۔

ایک طویل کلام کے ضمن میں کہتے ہیں:-

علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد میں نے اپنی پوری ہمت و محنت اور توجہ، صوفیہ کے طریق و مشرب کے سمجھنے پر مرکوز کر دی، اس کا علم مجھے ابتدا ہی میں ہوگیا تھا کہ یہ مشرب بغیر علم و عمل دونوں کی یکجائی اور اتحاد کے حاصل ہونا محال ہے۔ علم تصوف کا سارا خلاصہ یہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کا ایک ایک کانٹا چن چن کر نکال پھینکا جائے اور نفس کو

ناپسندیدہ و نازیبا اخلاق و عادات سے بالکلیہ پاک و صاف کر دیا جائے تاکہ دل کی
زمین ماسوی اللہ تمام امور و خرافات سے ویران اور اللہ کی یاد سے معمور و آباد ہو جائے۔

بنشیں در دل ویرانہ ام اے گنج مراد
کہ من این خانہ بسودائے تو ویراں کردم

ظاہر ہے کہ عمل کی نسبت علم میرے لئے کہیں زیادہ آسان تھا اس لئے سب سے پہلے
میں نے کتب تصوف کا مطالعہ کیا۔ ابو طالب مکی کی قوت القلوب، حارث محاسبی کی تصنیفات
جنیدؒ، شبلیؒ اور ابو یزید بسطامی وغیرہ دوسرے تمام صوفیہ و مشائخ کی متفرق کتب میں نے
پڑھ ڈالیں تا آنکہ تصوف کا کوئی علمی گوشہ میری نگاہ سے اوجھل نہ رہا اور علم و مطالعہ اور
قرأت و سماع کی امداد سے جتنا کچھ حاصل ہو سکتا تھا میں نے حاصل کر لیا مگر بہت جلدی یہ حقیقت
مجھ پر واضح ہو گئی کہ اس مشرب کے سربستہ راز دل اور مشکل عقدوں کے حل کے لئے عقل و
تدبیر کے ناخن بیکار ہیں اور جب تک اندرونی ذوق اور وجدان کو بیدار نہ کیا جائے
اور صوفیہ کا حال و مقام حاصل نہ ہو زیادہ دیر تک کام جاری نہیں رکھا جا سکتا۔

لطف ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

غور کیجئے کہ کتنا فرق ہے، ایک شخص حفظان صحت کے تمام اصول و مبادی کا حافظ و عالم ہو
مگر خود اپنی صحت کا مرثیہ پڑھ رہا ہے، ایک شخص جانتا ہے کہ شکم سیری کس کو کہتے ہیں لیکن
اُس کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں ایک ہوش مند نشہ و مستی کی طبی تعریف کا عالم ہے کہ
معدے سے ابخرہ کے صعود اور عقل و دماغ کے سرچشموں پر ان ابخرہ کے چھا جانے کا نام نشہ
ہے لیکن خود نشے کی کیفیت سے محروم ہے، اس کے برعکس ایک مدہوش گو یہ تعریف نہیں
جانتا لیکن اُس کا کام و دہن شراب سے لذت گیر اور اُس کا دماغ نشہ و مستی سے سرشار
ہے۔ ایک طبیب بحالت مرض بھی صحت کی تعریف اور ادویہ کے خواص کا عالم ہے لیکن
اس کے وجود خود مریض و بیمار رہے۔ یاد رکھئے بعینہ یہی فرق ہے زہد کے شرائط و اسباب

کے جاننے اور زہد کی کیفیت کو اپنے اوپر حاوی اور طاری کر لینے میں۔

تا ترا باشد نہ حالے ہمچو من

حالِ من باشد ترا افسانہ پیش

ان امور پر غور کرنے سے میرے اس یقین کو اور قوت مل گئی کہ ان لوگوں تک قال کی راہ سے نہیں بلکہ حال کی راہ سے پہنچا جا سکتا ہے۔ قال کے تمام گوشے میں نے ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے ہیں اس لئے اب حال کی طرف رجوع کرنا چاہئے عقلی اور شرعی علوم کی زندگی بھر کی مزاولت نے ایمان باللہ اور نبوت و یوم آخرت پر کامل یقین کی جڑوں کو دل میں اچھی طرح راسخ و مضبوط کر دیا تھا مگر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ کام بھی کسی قطعی دلیل کے ہاتھ سے نہیں ہوا، بلکہ بے شمار اسباب و قرائن اور لا تعداد تجربات کی بدولت خود بخود انجام پایا۔

آغازِ کار ہی میں مجھے اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑا تھا کہ اُخروی سعادت کی دولت صرف تقویٰ اور طہارت نفس ہی کی وجہ سے ہاتھ آ سکتی ہے اور اُس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اس دارِ فنا و پُر غرور سے رشتہ کاٹ کر دارِ بقا و پُر سرور سے تعلق استوار کیا جائے اور بہمہ وجوہ اپنا رخ اللہ کی جانب پھیر دیا جائے۔

سرمد! گلہ اختصار می باید کرد ـ یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن برضائے دوست می باید داد ـ یا قطع نظر زیار می باید کرد

لیکن جب تک دنیوی عزت و جاہ کی ہوس سے منہ نہ پھیر لیا جائے اور دنیا کی تمام رعنائیوں اور دل کشیوں کو پیٹھ نہ دکھائی جائے اُس وقت تک یہ گوہر مقصود کیسے ہاتھ آ سکتا ہے؟

سرمد! غمِ عشق بوالہوس را ندہند

سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند

اس پر میں نے اپنے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہر طرف سے دنیوی علائق کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوں، روزمرہ کے اعمال و وظائف پر نگاہ کی تو سب سے زیادہ دل کشی تعلیم و

تدریس میں تھی لیکن اس میں بھی ہمت و محنت کا اکثر حصہ نہایت لا طائل اور غیر مفید علوم پر صرف ہو رہا تھا۔ اس باب میں نیت کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی شرارت سے خالی نہیں اس ساری تعلیم و تدریس کا محرک و باعث، خلوص و للّٰہیّت نہیں بلکہ اس کے تحت بھی جاہ طلبی اور شہرت پسندی کا مذموم اور بدترین جذبہ کارفرما ہے۔ اگر میں نے اب بھی سنبھلنے کی کوشش نہ کی تو موت و ہلاکت کے غار میں گر جانا یقینی ہے۔ طویل عرصے تک اسی کشمکش و پیچ اور ادھیڑ بن میں رہا کبھی بغداد کو خیرباد کہنے کا قوی عزم کرتا تو دوسرے روز ناچار یہ عزم فسخ کرنا پڑتا۔ اگر اس سلسلے میں کبھی ایک قدم آگے بڑھتا تو دو قدم پیچھے ہٹتے اگر کسی صبح کو آخرت کا جذبہ و طلب دل کو موہ لیتا تو اسی شام کو خواہشات نفسانی کی دل بادل فوجیں مجھ پر حملہ بول دیتیں اور دنیا کی محبت پابزنجیر کر دیتی کہ جا ایں جا ست مگر ادھر ایمان کے منادی کی یہ آواز رہ رہ کر کانوں میں سنائی دے رہی تھی: الرحیل! الرحیل! چلو! چلو

جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

مہلت عمر قلیل اور سامنے سفر طویل ہے جس علم و عمل کی دولت پر اس قدر غرور اور اتنا گھمنڈ ہے وہ موج سراب ہے، فریب ہے، ریا ہے تخیل ہے۔ اگر آج ہی سے آخرت کے لئے زاد و راہ تیار کرنا شروع نہ کر دیا تو پھر کس دن کا انتظار ہے۔ اگر دنیوی اور فانی تعلقات پر آج ہی تیشہ نہ چلایا تو پھر یاد رکھو روؤ گے پچھتاؤ گے۔

عشق بازی کار آساں نیست اے دل سرباز
زانکہ گوئے عاشقی نتواں زد بچوگان ہوس

اس پر میں محسوس کرتا کہ شاید ترک دنیا اور اس سے فرار کا جذبہ اور داعیہ کافی قوت پکڑ گیا ہے لیکن شیطان پھر لوٹ کر آتا اور کہتا کہ یہ کیفیت نہایت ناپائیدار اور سریع الزوال ہے۔ اگر اس کے چلتے میں آ کر تم نے اس صاف اور بے میل زندگی اور اس لمبے چوڑے جاہ و منصب کو ترک کر دیا تو یاد رکھو اگر اس کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہزار جتن بھی کرو گے

تو مل نہیں سکے گا غرضیکہ دین اور دنیا کے جذبات کی اس کش مکش اور کشاکش میں کامل چھ ماہ گذر گئے

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اُدھر جاتا ہے یا دیکھیں اِدھر پروانہ آتا ہے

اس کیفیت کا آغاز رجب ۴۸۸ھ میں ہوا اور اسی مہینے میں معاملہ دائرۂ اختیار سے نکل گیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھ سے قوتِ گویائی سلب کر لی۔ یہاں تک کہ درس و تدریس کا مشغلہ یکسر معطل اور موقوف ہو گیا۔ اگر کبھی طلبہ کی دل جوئی اور دل دہی کی خاطر درس دینے کی کوشش بھی کرتا تو زبان وفا نہ کرتی اور میں ایک آدھ جملہ بھی بولنے پر قادر نہ ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کیفیت نے دل کا رخ کیا اور اُس کو اس قدر حزن و غم سے بھر دیا کہ اُس کی وجہ سے قوت ہاضمہ نے جواب دے دیا اور کھانے اور پینے کی خواہش بالکل ختم ہو گئی۔ اگر کبھی ایک گھونٹ پانی کا پی لیتا تو حلق سے اُتارنا مشکل ہو جاتا۔ اگر کبھی ایک لقمہ کھا لیتا تو اُس کا ہضم کرنا دوبھر ہو جاتا اس کا لازمی اثر اور نتیجہ یہ ہوا کہ بدن کی تمام قویٰ میں غیر معمولی اضمحلال آگیا۔

کریں گے کوہکن کے جذبِ دل کا امتحان آخر

ابھی اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہو

یہاں تک کہ اطبائے نے علاج سے امید منقطع کر لی اور کہا کہ چونکہ یہ مرض دل سے شروع ہو کر تمام مزاج میں سرایت کر گیا ہے اس لئے اب اس مرض کا کوئی علاج اور اس درد کا کوئی درمان نہیں ہے۔"

عشق دردِ بے دوائے بودہ است   بہر جان و دل بلائے بودہ است

اتنے بڑے طویل اقتباس کو میں نے "المنقذ من الضلال" سے صرف اس غرض سے نقل کیا ہے کہ میرے رائے میں غزالی اپنے ان واردات کے بیان کرنے میں نہایت سچے ہیں اور طالب علم کو غزالی کی مختلف سوانح و تراجم کی بجائے صرف اسی ایک کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جس میں انھوں نے اپنی عقلی حالت کے تدریجی ارتقاء کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

گزشتہ اقتباس کے بعد آخر میں غزالی نے جو کچھ کہا ہے اُس سے زیادہ اُن کی حالت کا ترجمان کون ہو سکتا ہے کہتے ہیں۔

"جب میں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے بس محسوس کیا اور ارادہ و اختیار نے بالکلیہ جواب دے دیا تو میں نے اللہ کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی کیونکہ اُس کا وعدہ ہے کہ جب کوئی مجبور و مضطر اُسے پکارے گا تو وہ اُس کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشے گا۔ چنانچہ الحمدللہ میری دعا بھی زیورِ قبول سے آراستہ ہوئی اور منصب و جاہ، اہل و عیال، اور احباب و رفقاء کے علائق سے یکسر دامن جھاڑ کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔"

آفریں اے دستِ گستاخ محبت آفریں
یہ گریباں ایک مدت سے گلے کا ہار تھا

اس اقتباس کا آخری حصہ خاص غور و فکر کا محتاج ہے کیونکہ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کا نہایت واضح نقشہ کھینچ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا ہے کہ یہ ترک و انقطاع کی زندگی کامل دس برس تک ممتد رہی جس کی اثنا میں انھوں نے اخلاق کی ساری کتابیں مرتب و مدوّن کیں بغداد سے رخصت ہونے اور پھر طویل عرصے کے بعد اپنے اہل و عیال میں واپس لوٹنے کی داستان نہایت درد انگیز اور طولانی ہے۔ اتنا تو آپ جان چکے ہیں کہ بغداد ہی میں ان کی صحت کا نظام کیسا درہم برہم ہو گیا تھا اور ان کے مزاج میں کتنا عظیم تغیر و انقلاب آیا تھا کہ اولاد تک کو چھوڑنے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کیا۔ خلوت کی زندگی کچھ ایسی بھائی کہ جامع دمشق کے منارے میں دن بھر عبادت الٰہی میں مصروف رہنے اور صخرۂ بیت المقدس میں گوشہ نشین ہو کر اللہ اللہ کرنے کے واقعہ و حالت کو نہایت تعریف کے لب و لہجہ میں بیان کرتے ہیں۔ طویل عرصے کے بعد جب وطن واپس لوٹے ہیں تو بھی اپنے قول کے مطابق دل کی دنیا کو یادِ الٰہی سے آباد رکھنے کیلئے خلوت اور عزلت نشینی ہی کی زندگی کو ترجیح دی۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ ان خلوتوں کی اثناء میں اُن پر کیا کیا گراں قدر اسرار و رموز

منکشف ہوئے مجھے صرف اس سے تعرض ہے کہ انھوں نے اخلاق کی ساری کتابیں اسی دوران میں تدوین و تالیف کیں۔

گذشتہ واقعات کا سارا خلاصہ صرف تین امور میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) غزالی نے تصوف کی طرف میلان و رجحان والد سے ورثے میں پایا۔

(۲) والد کی وصیت کے مطابق ایک صوفی و درویش کی کفالت نے اس رجحان کو اور تقویت دی۔

(۳) دس برس کی عزلت نشینی کی زندگی نے غزالی کے آرار و افکار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا جس کا گہرا اثر اُن کی تصنیفات میں موجود ہے۔

اب آپ کو بخوبی علم ہو گیا ہو گا کہ غزالی کے اخلاقی نقطۂ نگاہ پر بھی تصوف کا رنگ غالب ہے اور اسی رنگ کو آپ اس کتاب میں جا بجا اُجاگر اور نمایاں پائیں گے۔

پانچویں فصل

وفات

اپنے بھائی کو مدرسہ نظامیہ میں قائم مقام اور نائب بنا کر خود غزالی مکۂ مکرّمہ تشریف لے گئے جہاں ۴۸۸ھ میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ۴۸۹ھ میں دمشق آئے اور کچھ دن یہاں قیام کرنے کے بعد بیت المقدس چلے گئے، جہاں کافی عرصہ تک معتکف رہے۔ یہاں سے پھر واپس دمشق آ گئے اور ایک مدت تک جامع دمشق کے غربی منارے میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنے کے بعد اسکندریہ روانہ ہو گئے۔ ان کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ سلطان یوسف بن تاشفین کے عدل و انصاف کا شہرہ سن کر یہاں سے اُن کے پاس جانا چاہتے تھے لیکن اُس کی موت کی اطلاع سننے کی وجہ سے ناچار یہ عزم فسخ کرنا پڑا اور مشہور مزارات اور مساجد کی زیارت

سیاحت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اس طویل سفر کے بعد پھر بغداد آئے اور وعظ و ارشاد کی مجلس قائم کی اور حقیقت و معرفت کے جام پر جام بے دریغ لنڈھانے شروع کیے اور احیاء العلوم کا باقاعدہ درس دینا شروع کیا۔ آخر اسے بھی چھوڑ کر خراسان آئے اور کچھ عرصے تک مدرسہ نظامیہ نیشاپور کی مسندِ درس کو زینت بخشی لیکن کچھ مدت کے بعد اس سے بھی کنارہ کشی کر لی اور اپنے وطن طوس میں آ کر گھر کے قریب ایک مدرسہ اور ایک خانقاہ قائم کر کے خانہ نشین ہو گئے اور آخر تک سارا وقت قرآن حکیم کی تلاوت، ارباب ذوق کی مجالست و ہم نشینی، طالب علموں کی تعلیم و تدریس اور نماز و روزہ کی ادائیگی و بجا آوری میں بسر کرتے رہے یہاں تک کہ دوشنبہ ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں رحلت فرمائی۔ سبکی کہتے ہیں کہ طابران میں ان کا مزار آج تک مرجع خاص و عام ہے۔

زبیدی کہتے ہیں کہ عارف باللہ محمد بن عبدالعظیم زموری کی کتاب بہجۃ الناظرین وانس العارفین میں نگاہ سے گذرا کہ:

"ہمارے شیوخ و اکابر نے ہم سے بیان کیا ہے کہ جب ابو حامد غزالی کی موت کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے ایک خادم خاص کو جو علم و فضل اور نیکی و صلاح میں ممتاز درجہ رکھتا تھا وصیت کی کہ میری قبر گھر ہی میں کھودی جائے اور قریب کے تمام دیہاتوں میں جنازے میں شرکت کے لیے عام منادی کر دی جائے۔ میری میت کے قریب کوئی نہ آئے کچھ دیر کے بعد قریب کے بیابان سے تین ایسے نامعلوم اشخاص آئیں گے جنھیں عراق میں کوئی نہیں جانتا ہوگا ان میں سے دو مجھے غسل دیں گے اور تیسرا بغیر کچھ بات چیت یا مشورہ کیے نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھے گا۔ جب غزالی کا انتقال ہوا تو خادم نے وصیت کے مطابق ہر امر پر عمل کیا۔ جب لوگ جنازے کے لیے جمع ہو گئے تو انھوں نے دیکھا کہ بیابان کی طرف سے تین آدمی آئے دو نے غسل دیا اور تیسرا پھر نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ جب آپ کی تجہیز و تکفین ہو چکی اور میت کو قبر کے کنارے رکھ دیا گیا تو تیسرا شخص پھر نمودار ہوا، اس نے اپنے گرد ایک بڑی چادر لپیٹی ہوئی

تھی۔ ایک طرف سیاہ نشان اور سر پر صوف کی دستار تھی نہایت عجز و خشوع کے ساتھ نماز جنازہ
پڑھانے کے لئے آگے بڑھا اور لوگوں نے اس کی امامت و اقتداء میں نماز ادا کی۔ سلام پھیرنے
کے بعد یک بیک نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ بعض عراقی علماء نے (جو جنازے میں شریک
تھے اور اس شخص کی ساری علامتیں یاد کر لی تھیں لیکن نہیں جانتے تھے کہ یہ کون شخص ہے)
ایک روز ہاتف کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے نماز جنازہ پڑھائی وہ شیخ ابو عبداللہ محمد
بن اسحٰق الشریف تھے۔ جو مغرب اقصیٰ کے عین القطر نامی مقام سے صرف اس مقصد و مصلحت
سے آئے تھے اور جنھوں نے غسل دیا وہ آپ کے رفیق تھے۔"

یہ ساری کہانی یقیناً موضوع اور بے سر و پا ہے جسے غزالی کے عقیدت مندوں نے گھڑ لیا
ہے لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی موت کے وقت عوام کے دلوں پر ان کے
تقویٰ اور ورع کا سکہ کس قدر رواں تھا۔ زندگی کے ایک حصے میں غزالی کو زندقہ اور
بے دینی کے اتہام سے بھی دوچار ہونا پڑا لیکن بہت جلد عوام نے اس سے رجوع کر لیا اور
غزالی کو اولیاء اللہ میں شمار کرنے لگے۔ کہتے ہیں غزالی نے موت سے کچھ قبل یہ اشعار پڑھے ؎

میرے اُن دوستوں سے پوچھو۔ جو مجھے مردہ سمجھ کر نالہ و بکار کر رہے ہیں کہ کیا کسی مردے کو
رو رہے ہو یا اُس شخص کو رو رہے ہو جو زندہ تمہارے پاس موجود ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ میں
مر گیا ہوں۔ واللہ میں نہیں مرا بلکہ مادی و عنصری لباس کو ترک کر کے میں نے ایک دوسرا
روپ اختیار کر لیا ہے

یہ قصیدہ خاصا طویل ہے اور مصر کی لائبریری میں تصوف کے تحت مخطوطہ نمبر ۱۲۱ میں
من و عن محفوظ ہے۔ پہلے واقعہ کی طرح اس قصیدے کی بھی کوئی اصل و حقیقت نہیں۔ غزالی کی
موت کے بعد کسی اور شخص نے اُن کی طرف منسوب کر دیا ہے اور صرف اسی پر کیا موقوف ہے
کیا کیا باتیں ہیں جو غزالی کے نام سے لوگوں میں رواج نہیں دی گئیں۔

کتاب الثبات عند الممات میں ابن جوزی نے غزالی کے بھائی احمد کی زبانی نقل کیا ہے

کہ دوشنبہ کے روز صبح کو میرے بھائی ابوحامد نے وضو کرکے نماز پڑھی اور کہا کہ کفن لاؤ کفن کو ہاتھ میں لے کر اُسے چوما، آنکھوں سے لگایا اور کہا، شاہ کے حضور میں چلنے کے لئے آمادہ و تیار ہوں، یہ کہہ کر قبلہ رو لیٹ گئے اور ابھی صبح کا کچھ دھندلکا باقی تھا کہ قفس عنصری سے روح پرواز کرگئی وسبحان من تفرّد بالبقاءِ۔

ابیوردی نے اُن کے مرثیے میں ذیل کے اشعار کہے ہیں۔ اشعار

آج قوم کے ہر عظیم المرتبت شخص کی آنکھ حجۃ الاسلام کی موت پر اشکبار ہے۔ جو شخص ابوحامد پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے اُس پر کسی کو تنقید اور نکتہ چینی کی مجال نہیں۔ غزالی کی موت کے حادثہ جانکاہ نے میرے بدن کے قویٰ کو مضمحل کردیا ہے۔ آنکھ رات بھر جاگتی اور آنسو چاہتے ہیں کہ بدن کی نمی کی ایک ایک بوند کھینچ لیں، حجۃ الاسلام کا زہد مشہور و معروف اور ان کا علم نہایت یقینی، پختہ اور ٹھوس تھا آہ وہ نہ رہے اور جانتے ہو سب سے زیادہ دکھ اور درد اُس شخص کی موت کا ہوتا ہے جس کی مثال اور بدل زندوں میں موجود نہ ہو۔

قاضی عبدالملک لمعانی ان کے مرثیے میں کہتے ہیں۔

حیران و سرگشتہ اور محزون و اندوہگیں آنکھوں سے اُس شخص پر رو رہا ہوں جس کی محبت میں حق و صداقت کی محبت ہے کبھی کے جمع کئے ہوئے آنسوؤں کے میں نے دریا بہا دئے اور آنکھوں سے کہا کہ روئے خوب دل کھول کر روئے۔

چونکہ ہم بھی غزالی کی تالیفات سے استفادہ کرنے والوں میں شریک ہیں اس لئے ہم بھی دست بدعا ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انھیں اپنی رحمت کے وسیع کراں میں جگہ دے اور احیاء دین و احیاء علوم میں جو انھوں نے مخلصانہ کوششیں کی ہیں انھیں بارآور و ثمر مند بنائے اور اپنے فضل وکرم سے ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ انہ نعم المولیٰ ونعم النصیر وھو بالمومنین رءوف الرحیم۔

تیسرا باب

وہ سرچشمے جن سے غزالی سیراب ہوئے

تمہید

مورخینِ فلسفہ کی رائے ہے کہ سب سے پہلے سقراط نے انسان کی ذات وصفات اور مختلف متعلقات واحوال میں غور وفکر کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے اسی نے کہا، "اپنی ذات ہی کے واسطہ سے اپنی ذات کی حقیقت و ماہیت کو تلاش کرو۔"

اپنے اندر ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

غالباً ان مورخین کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان کی ذات میں بحث وتحقیق کو مرتب علم اور باقاعدہ فن کی شکل دینے کا سہرا سقراط کے سر ہے۔ اسی نے اس فن کے اصول وقواعد اور مبادی وضع کیے اور اسی نے بتایا کہ انسان کے اجتماعی، اور انفرادی حقوق و واجبات کیا ہیں، ورنہ خیر وشر یا بعض اعمال کے مفید ومضر ہونے کا بحث سو یہ سقراط سے بھی کئی صدی پرانا ہے۔

وہ عرب قوم جس کے قدیم علوم وآداب سے غزالی اور ان کے اساتذہ نے کمال فائدہ اٹھایا، تہذیب واخلاق کے بارے میں اُن کے خزانے نظم ونثر کے بیش بہا جواہر پاروں سے مالامال ہیں۔ مثلاً ایک اعرابی جب اپنے بیٹے کو ان الفاظ میں وصیت کرتا ہے کہ موت کے

تلخ گھونٹ کو گوارا کر لینا لیکن ذلت و عار کے داغ کو ہرگز قبول نہ کرنا۔ تو حقیقت میں یہ بھی شخصی اور انفرادی[1] تہذیب ہی کی طرف رہنمائی ہے اگر کوئی عرب، فوج کو معرکہ کارزار میں جم کر لڑنے اور پیٹھ نہ دکھانے کی تلقین ان الفاظ میں کرتا ہے "پشتوں پر نیزے کھانے اور نیزے مارنے سے سینوں پر نیزے کھانا اور نیزے مارنا زیادہ عزت کی بات ہے" تو واقع میں اس سے بھی سپاہیوں کو تہذیب اخلاق ہی کا درس دینا مقصود تھا اس لئے کہ اخلاق زمان و مکان کی قید سے ورا، و آزاد ہیں۔ جہاں بھی انسان ہوگا یہ اپنا تقاضا باقی رکھیں گے۔ اسی طرح اکثم بن صیفی کا قول "عقل سو رہی اور عشق جاگ رہا ہے"۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

گناہوں کے پاؤں بے قید و آزاد ہیں لیکن نیکی پا بزنجیر ہے۔ ضدی اور ہٹ دھرم کسی وقت بھی پھسل سکتا ہے۔ کام کو آخر میں ہاتھ میں لینے کی نسبت اول سے ہاتھ میں لینا میں زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ جس دولت کے تلف ہونے سے تمہیں عبرت ملی اس کو سمجھو گویا وہ تلف نہیں ہوئی جنگ میں کسی اچھی تدبیر کا سوجھنا تیغ و سنان سے زیادہ مفید اور کارگر ہے۔ انجام کار پر نگاہ رکھنے والے بے خبر اور ناعاقبت اندیش کے ہاتھوں کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ندامت سے بچنا ہو تو پہلے تدبیر کار اور اسباب کار پر نگاہ کرو۔ جب کوئی مصیبت آجائے تو کوئی راہ نجات دکھائی نہیں دیتی لیکن جب ٹل جائے تو ہر دانا و نادان کو تدبیریں سوجھنے لگتی ہیں"۔ ان چھوٹے چھوٹے فقروں میں اجتماعی اور معاشرتی آداب کو کتنی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اجتماعی آداب بھی علم الاخلاق ہی کا ایک بڑا جزو ہیں۔

چونکہ شعرائے جاہلیت اور شعرائے اسلام دونوں نے انسانی فطرت و طبیعت کا ایک گونہ گہرا مطالعہ کیا تھا اس لئے اُن کے کلام میں بھی وراثت، صحبت اور ہمسائگی وغیرہ کے اثرات کا وہ

---

[1] انفرادی کی نسبت فردی تہذیب اور فردی آداب کی اصطلاح زیادہ موزوں ہے۔ مترجم

مبہم سا خاکہ موجود ہے جس نے فلاسفر کی رنگ آمیزی سے ایک مفصل اور مستقل فن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مثلاً ذو الاصبع العدوانی کا یہ شعر

انسان لاکھ چھپائے لیکن اس کا فطری خلق کبھی نہ کبھی ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

بعض اخلاقی نظریات ہی کا ترجمان ہے۔

مسکین دارمی کے یہ اشعار

کئی دوستوں کے راز میرے پاس امانتاً موجود ہیں لیکن ایک کا راز دوسرے سے کبھی نہیں کہتا ہر ایک کے لئے قلب کا ایک ایسا گوشہ مخصوص ہے جس تک کسی کی نگاہ کام نہیں کرتی وہ شہر دل میں الگ الگ پھر رہے تھے لیکن ان سب کے راز ایک ایسی مضبوط چٹان میں تھے اور محفوظ ہیں جسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔

ان مسائل اخلاق سے ملتے جلتے ہیں جنہیں فلاسفہ انفرادی آداب میں بیان کرتے ہیں۔

اگر ہم چاہیں تو مدح و ہجو کو بھی علم اخلاق کا جزو قرار دے سکتے ہیں کیونکہ مدح میں عموماً فضائلِ اخلاق اور ہجو میں رذائلِ اخلاق کو بیان کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ فضائل و رذائل کے ابواب علم اخلاق ہی کے ابواب ہیں

قعنب بن ضمرہ کے یہ اشعار

اگر وہ کبھی میرے عیب کی بات سنتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے لیکن کبھی میری خوبی کی بات سنتے ہیں تو چپکے سے وہیں دفن کر دیتے ہیں۔ اگر کبھی ان کے سامنے میری نیکی کا ذکر کیا جائے تو بہرے ہو جاتے ہیں لیکن بدی کا ذکر آئے تو فوراً سننے لگتے ہیں۔ ہمارے باب میں جاہل اور دشمن کے باپ ہیں۔ بزدل ہیں یقیناً بزدلی اور جہالت دونوں بڑے بڑے مرض ہیں۔"

ہجو میں ہیں لیکن ان میں بعض اُن مذموم صفات کو بیان کیا گیا ہے جن کے خلاف علم اخلاق نعرۂ جنگ بلند کرتا ہے۔

حسان بن ثابت کے یہ دو شعر

میں اپنی عزت کو بچانے کے لئے دولت کو سپر بناتا ہوں، عزت کے چلے جانے کے بعد اللہ کرے اس دولت میں کبھی برکت نہ ہو اگر دولت چلی جائے تو میں اُسے دوبارہ کما سکتا ہوں لیکن عزت پر حرف آ جائے تو اسے کبھی نہیں مٹا سکتا۔

باوجودیکہ تجزیہ اشعار ہیں لیکن ان میں بھی فضائل اخلاق میں سے ایک عمدہ خلق کو بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی اُن حکم اور مواعظ کو بھی ذہن میں رکھیے جو عربی ادب کے اکثر حصے پر حاوی اور قابض ہیں، آپ ہی بتایئے کہ روایت اسدی کے اس قول سے زیادہ دانش آموز اور حکمت پرور کلام کیا ہو سکتا ہے۔

میں اس نوجوان کو عزیز رکھتا ہوں جس کے کان فواحش سے ایسے ناآشنا ہوں جیسے اُس کا سامعہ ہی اس باب میں بیکار ہے۔

وہ ایسا پاک نفس ہو کہ نہ کبھی کسی کو ایذا دیتا ہو نہ کبھی کسی کی بھلائی میں مانع آتا ہو نہ کبھی ژاژخائی سے زبان کو آلودہ کرتا ہو۔

اگر چاہتے ہو کہ تمہیں شریف، معزز، مؤدب، دانشمند اور آزاد کہا جائے تو اس کی صورت یہ ہے کہ جب تمہارے کسی دوست سے لغزش ہو جائے تو تم خود اس کی طرف سے ایک معذرت گھڑ لو، دولت صرف اتنی کافی ہے جس کی وجہ سے تم دوسروں کے احتیاج سے بچ جاؤ فرض کرو کہ اگر اس سے زیادہ ہو گئی تو اسے دولت و تمول نہیں فقر و افلاس کہتے ہیں۔

اور قرآن؟

قرآن حکیم میں انسانی امیال عواطف اور قلبی احساسات ورجحانات کا نہایت گہرا اور دقیق تحلیل و تجزیہ موجود ہے، اس میں اخلاق کے اکثر ان مشکل مسائل کا واضح حل موجود ہے، جن کی گرہ کشائی سے بڑے بڑے فلسفی اور بڑے بڑے نکتہ ور عاجز و قاصر رہے ہیں انسان کو اپنے خالق کے ساتھ کیا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے؟ اپنی ذات، اپنی بیوی، اپنے والدین اپنی اولاد، اپنے ابنائے جنس، اپنے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھنا چاہیئے؟

سب کے آداب اس میں مذکور ہیں۔ شاذ و نادر ہی آپ کوئی ایسا اخلاقی عقدہ پائیں گے جسے قرآن حکیم نے حل نہ کیا ہو، جن آداب کے بیان میں قرآن کریم نے صرف اجمال و ایجاز پر اکتفا کیا حدیث نے اُن کی توضیح و تشریح کر دی، اگر آپ حدیث کے اُس حصے پر نگاہ کریں جو صرف آداب سے متعلق ہے تو یقیناً آپ بھی ہماری تائید کریں گے۔

قرآن و حدیث، اور عربی کے خطبوں اور اشعار کے بعد اخلاق کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ قدیم کلیلہ و دمنہ ہے جس کا ابن المقفع نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا، اور اس کے بعد اس موضوع پر خود دو کتابیں ادب صغیر اور ادب کبیر تصنیف کیں۔ شادی و نکاح کے آداب، غلاموں کے ساتھ سلوک، عورتوں کے ساتھ برتاؤ، وغیرہ وہ تمام امور جن کا جنگ اور صلح کی حالت میں عموماً خیال رکھا جاتا ہے اور جن پر علم اجتماع کی دیواریں استوار ہوتی ہیں، ان سب کے متعلق فقہ میں نہایت طویل اور مفصل ابواب قائم کیے گئے۔

ان کے بعد ادبی مجالس و اجتماعات اور اسٹیج کے لیکچروں کا دور آتا ہے جن میں علما، زہاد اور مصلحین نے تہذیب اخلاق کے بارے میں اپنے نظریات نہایت آزادی سے ظاہر کیے۔

غزالی اخلاق میں تالیفات وضع کرتے وقت ان صاف و شفاف چشموں سے خوب جی بھر کر سیراب ہوئے۔ اخلاق کے باب میں غزالی کے فیصلوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کا کوئی فیصلہ ایسا نہیں جو کسی حکمت، کسی ضرب المثل، کسی شعر، کسی آیت، کسی حدیث یا اقوال ماثورہ میں سے کسی اثر سے ماخوذ و مستنبط نہ ہو، ممکن ہے ان میں سے بعض چیزیں خود ان کے مطالعہ میں آئی ہوں اور بعض کو اپنے اساتذہ سے سنا ہو، میں نے چاہا کہ ان کے ہر فیصلے کے مقابلے میں اس کا اصل و ماخذ بھی بیان کر دوں لیکن ایجاز و اختصار جس کا اس کتاب میں التزام کیا گیا ہے مانع و دامن گیر ہوا۔

گذشتہ علمی، اور ادبی ذخیرہ سے استفادہ کرنے کے باوجود غزالی کی تصنیفات میں آزادیٔ رائے اور جدت پسندی کا رنگ بھی نمایاں ہے مثلاً بعض مسائل میں انھوں نے اشعری سے

اختلاف کیا ہے بعض اقوال میں شافعیہ سے الگ راہ اختیار کی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ اسلاف کا نقش قدم نگاہ سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اگر کبھی ان سے اختلاف بھی کرتے ہیں تو ایک سنجیدہ اور محتاط آدمی کی طرح ادب اور وقار کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے

پہلی فصل

فلسفیانہ ماخذ

فلسفہ پڑھنے میں غزالی کی نیت بخیر نہ تھی انھوں نے فلسفہ صرف اس غرض سے پڑھا تاکہ اس کی گہرائی اور پاتال معلوم کر کے لوگوں میں اس کے عیوب و نقائص کی نشر و اشاعت کریں۔
انھوں نے فلسفہ کسی استاذ سے نہیں پڑھا بلکہ خود اس کا مطالعہ کیا یہی وجہ ہے کہ انھیں فلاسفہ سے اس قدر کد ہے۔ اگر فقہ، تصوف اور علم توحید کی طرح اسے بھی باقاعدہ کسی استاذ سے پڑھتے تو بعید نہیں فلاسفہ پر تنقید میں ان کا لب و لہجہ بہت معتدل ہو جاتا اس لئے کہ اساتذہ جن علوم کو پڑھاتے ہیں ان کے باب میں وہ نہایت متعصب اور غیور ہوتے ہیں اور اس کا تلامذہ پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ غزالی کے صوفی اساتذہ کا رنگ و اثر ان کے تمام ذہنی اور اخلاقی نظریوں پر بہت واضح اور نمایاں ہے۔

لیکن اخلاق میں کتابیں تصنیف کرتے وقت کیا واقعی غزالی فلاسفہ کے اتباع و محاکات سے اپنا دامن بچا سکے ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہوا، فضائل کی تقسیم اور ان کے حاصل کرنے کے طرق رذائل کے اقسام اور ان سے بچنے کے وسائل پر ایک نگاہ کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ہر ہر قدم پر ان فلاسفہ و حکماء کا اتباع اور پیروی کی ہے جنھوں نے علم اخلاق اور علم اجتماع میں کتابیں مدوّن کیں۔

جب المنقذ من الضلال میں غزالی کا یہ قول آپ کی نگاہ سے گذرے گا تو یقیناً آپ

ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جائیں گے۔

"سیاسیات کے بارے میں فلاسفہ کی گفتگو کا سارا دارومدار امور دنیا کے وہ اصلاحی امور ہیں جن کا تعلق جہانبانی سے ہے۔ سو اس میں بھی ان کے پاس کوئی نئی بات نہیں یہ سب کچھ ان آسمانی کتابوں سے ماخوذ ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انبیاء و رسل پر نازل کیں یا ان حکمتوں سے مستفاد ہے جو اولیاء اللہ سے منقول ہیں۔ رہے اخلاقی مباحث سو اس میں ان کی ساری پونجی نفس کے اخلاق و صفات اس کے انواع و اجناس اور اس کے معالجہ و مجاہدے زیادہ نہیں لیکن یہ ساری باتیں بھی اس گروہ سے حاصل کی گئی ہیں جسے صوفیہ کہتے ہیں جو دنیا اور اس کی دلچسپیوں اور رعنائیوں سے قطع نظر کرکے صرف یادِ الٰہی پر قانع ہیں۔ ریاضت اور مجاہدے کے دوران میں نفس کے کچھ اخلاق و صفات اور عیوب و لطائف ان پر منکشف ہوئے انھوں نے یہ اسرار لوگوں سے کہہ دیئے۔ جب فلاسفہ کو ان کا علم ہوا تو وہ ان کو لے اُڑے اور اپنے کھوٹے مال کو رواج دینے کے لئے کچھ حصہ اس کھرے مال کا بھی ساتھ شریک کر دیا۔" ص ۱۶

غزالی کو اس امر کا احساس تھا کہ ان کا یہ دعویٰ شاید ان فلاسفہ اسلام کے سلسلے میں تو تسلیم کیا جا سکتا ہے جنھوں نے قرآن حکیم انبیاء و رسل کی حِکَم اور صوفیہ کے اقوال و امثال کا مطالعہ کیا ہے لیکن فلاسفۂ یونان کے بارے میں ان کا یہ دعویٰ ہرگز قابلِ تسلیم نہیں سو غور کیجیے اس کا جواب کیا دیتے ہیں؛

"ان (فلاسفۂ یونان) کے زمانے میں بھی اور اسی زمانے پر کیا موقوف ہے ہر زمانہ اور ہر عصر میں خدا پرستوں کی ایک جماعت موجود رہتی ہے جو حقیقت میں اس زمین کی محور و مدار ہوتی ہے اور انھیں کی طفیل و برکت سے زمین والوں پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔" ص ۱۷

تو گویا غزالی کے قول کے مطابق سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کا کوئی کمال نہیں۔ علم اخلاق میں ان کی ساری محنت و کاوش بیکار تھی۔ اگر دنیا کو ممنونِ احسان ہونا چاہیے تو ان "مدارون"

کا جن کے وجودِ مسعود سے آج سے کئی ہزار برس قبل اللہ نے سرزمین یونان کو نوازا تھا میں حیران ہوں کہ غزالی اُن اعتراضات کے مقابلہ میں کیا جواب دیں گے جو ڈنکے کی چوٹ کہتے تھے کہ ہم ایک خدا کو نہیں بلکہ ایک ہزار ایک خداؤں کو پوجتے ہیں۔ اور جن کے بعض خدا نہ صرف بندوں کو لذائذ دنیوی سے متمتع اور بہرہ اندوز ہونے کی ترغیب دیتے تھے بلکہ اکثر اوقات خود اپنے ہاتھوں سے اُن کے فسق و فجور کی راہیں بھی صاف اور ہموار کرتے تھے

بلاشبہ غزالی نے کتبِ اخلاق میں فلسفہ کے خرمن سے خوشہ چینی کی، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان پر مذہب اور تصوف کا رنگ ایسا غالب آیا کہ اُن کے سب نظریات اسی رنگ میں رنگ گئے۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو فلسفے سے دُور کا بھی تعلق اور لگاؤ نہیں لیکن حقیقت و واقعہ اس کے خلاف ہے، یہ فلسفے سے نہایت متاثر ہیں اور ان کے سارے اصول و مبانی اسی سے ماخوذ و مستفاد ہیں۔

غالبًا یہ کہنا غلط اور بے جا نہ ہوگا کہ غزالی کی ساری عظمت و شہرت و ناموری کا اصلی راز فلاسفہ کی مخالفت اور دشمنی ہی میں مضمر ہے۔ انھوں نے اس مخالفت کا دروازہ کیا کھولا کہ فلاسفہ کی توہین میں ہر کہ ومہ کی زبان کھل گئی۔ وہ بھونڈی اور گھناؤنی تقلید جس کے ہاتھوں آج دنیا کا ہر حریت پسند نالاں ہے اس کی تخم ریزی اسی دن ہو گئی تھی جس روز غزالی کی بارگاہ سے ابو سینا کے کفر و ارتداد کا فتویٰ صادر ہوا تھا۔

اخوان الصفا

یہ ایک خفیہ انجمن تھی جو چوتھی صدی ہجری کے وسط میں بصرہ میں قائم ہوئی چونکہ فلسفہ کو اس زمانے میں نہایت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اس لئے اس انجمن کے تمام اغراض و مقاصد کو نہایت مخفی رکھا گیا۔ اس کے قیام سے غرض و غایت یہ تھی کہ جو علوم و نظریات اس انجمن کی نگاہ میں درست اور صحیح ہوں اُن کی پورے عالم اسلامی میں نشر و اشاعت کی جائے اس انجمن کے ممبروں کی رائے یہ تھی کہ

چونکہ مجموعہ شریعت طرح طرح کی جہالتوں اور گمراہیوں کے نیچے دب گئی ہے لہٰذا اُس کی تطہیر بجز فلسفے کے اور کسی علم سے ممکن نہیں اس لئے کہ فلسفہ حکمت اعتقادی اور مصلحت اجتہادی دونوں کا ضامن اور کفیل ہے۔"

انھوں نے اکاون رسائل لکھے جن میں اُس زمانے کے تمام متداول علوم کا خلاصہ اور ماحصل درج کر دیا۔ ان رسائل کے مقدمے میں کہتے ہیں :۔

"اسلام سے قبل بھی حکما نے علم النفس سے بحث کی ہے لیکن یہ مباحث بہت طویل تھے اور بعض کم علم اور کوتاہ فہم لوگوں نے زبان در زبان ان کا ترجمہ کر کے ان کے مطالب میں کئی اشکالات اور الجھاؤ ڈال دیے چونکہ ہم ان مباحث کی حقیقت اور مغز سے پوری طرح واقف اور باخبر ہیں اس لئے بکمال صحت و اختصار ہم نے ان سب مباحث کو اکاون رسائل میں جمع و محفوظ کر دیا۔"

استاذ احمد امین نے بحوالہ میکڈانلڈ لکھا ہے کہ بعض محققین کی رائے ہے کہ چونکہ اس انجمن اور فرقہ باطنیہ کی تعلیم میں ایک گونہ ہم آہنگی اور یکسانی ہے۔ اس لئے بعید نہیں کہ اس انجمن کے ممبر بھی اسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، دوسری بڑی دلیل یہ ہے کہ جب مغلوں نے قلعۂ الموت کو فتح کیا تو اس میں رسائل اخوان الصفا کے کئی نسخے ملے[1]

اُستاذ کونٹ ڈی جلارزا نے جامعہ مصریہ کے لیکچروں میں بیان کیا کہ

"ابو حیان توحیدی (متوفی ۴۰۰ھ) جو اس انجمن کا ایک سرگرم رکن تھا کہا کرتا تھا کہ شریعت ابھی ادھوری اور نامکمل ہے اس میں بہت ساری خامیاں اور عیوب و نقائص باقی ہیں جن کو صرف حکمت و فلسفہ ہی سے دور کیا جا سکتا ہے۔"

اس انجمن کے فلسفی مذہبی اور سیاسی اغراض پر مطلع ہونے کے لئے رسائل اخوان الصفا کا نہایت عمیق مطالعہ شرط ہے۔ غالباً یہاں اس امر کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ چونکہ غزالی نے خود اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ انھوں نے علمی زندگی کے اوائل میں تمام مروجہ و متداول علوم و مذاہب

---

[1] مبادی الفلسفہ ص ۱۲۵

کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اس لئے اخوان الصفا پر رائے دینے کے باوجود انھوں نے ان کے رسائل سے بھی سیر حاصل استفادہ کیا ہے کیونکہ کسی کتاب کے مطالعہ کے لئے یہ امر ہرگز ضروری نہیں کہ اس کے مصنف سے ہر نظریے میں کامل اتحاد و اتفاق بھی ہو۔

فارابی

ابو نصر محمد بن طرخان خراسان کے شہر فاراب کے رہنے والے اور فارسی الاصل ہیں ابو بشر متی بن یونان نصرانی (متوفی ۳۲۸ھ) سے منطق کی تحصیل کی۔ حران کے مدرسے میں جا کر فلسفہ پڑھا دوبارہ بغداد آئے اور پھر یہاں سے دمشق چلے گئے اور سیف الدولہ بن حمدان کے زمانے میں وہیں مقیم رہے۔

سلطان بک محمد نے جامعہ مصریہ کے لیکچروں میں بیان کیا کہ

"وہ مسلم فلاسفر جنھوں نے افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اُن کے سرخیل فارابی ہیں شیخ رئیس کے واقعہ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں" میں نے فلسفہ کے تمام اقسام پر بوجہ احسن آگہی اور اطلاع بہم پہنچالی لیکن الٰہیات میں آکر قدم ایسی بری طرح رُکے کہ آگے بڑھنا دشوار ہو گیا تا آخر مایوس ہو کر میں نے الٰہیات کا مطالعہ ہی سرے سے ترک کر دیا۔ ایک روز میں اتفاق سے کچھ کتب فروشوں کے پاس بیٹھا تھا کہ کتابوں کا ایک ایجنٹ آیا جس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا یہ کتاب خرید لو، میں نے کتاب دیکھی تو فن الٰہیات میں تھی، یہ کہہ کر میں نے اُسے واپس لوٹا دی کہ یہ میرے کسی کام کی نہیں۔ وہ کہنے لگا کہ اس کتاب کا مالک بیچنے کا خواہشمند ہے اگر تم خریدنا چاہو تو صرف تین درہم میں دیدوں گا شیخ رئیس کہتے ہیں کہ میں نے کتاب خرید لی بغور دیکھا تو فارابی کی تصنیف تھی۔ اس کا مطالعہ کیا تو الٰہیات کے تمام مشکل مسائل اور الجھاؤ حل ہو گئے اور اللہ نے اس فن میں شرح صدر کر دیا۔ حالانکہ میں اس فن سے مایوس ہو کر اس کا خیال ہی بالکل ترک کر چکا تھا۔"

فارابی یونان کے فلاسفہ میں سے سب سے زیادہ ارسطو کے دلدادہ اور معتقد تھے کسی شخص
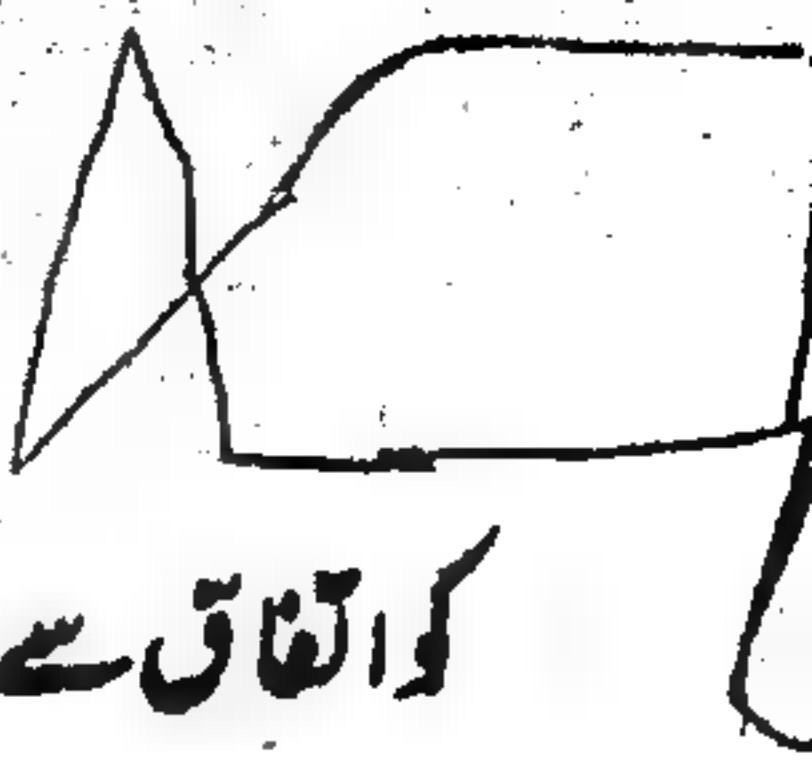
کو اتفاق سے ارسطو کی کتاب النفس کہیں ملی تو اس پر فارابی کے ہاتھ سے لکھا تھا، میں نے اس کتاب کو سو مرتبہ پڑھا" جس طرح ارسطو کو معلمِ اول کہتے ہیں اسی طرح فلسفیانہ آراء و مذاہب کی بکثرت شرح و تفسیر کی وجہ سے فارابی کو معلمِ ثانی کہتے ہیں۔ ایک دفعہ فارابی سے پوچھا گیا کہ تم بڑے عالم ہو یا ارسطو؟ تو جواب دیا کہ اگر میں ارسطو کے زمانے میں ہوتا تو یقیناً اس کے بڑے شاگردوں میں شمار ہوتا۔ فارابی نے تقریباً اسی برس کی عمر میں ۳۳۹ھ میں وفات پائی۔

فارابی کی تصانیف بہت تھیں جن میں سے اکثر زمانے کے دستبرد سے تلف اور ضائع ہو گئیں جو باقی ہیں اُن میں سب سے زیادہ مشہور آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ ہے۔ جو جمہوریۂ افلاطون کے نہج و انداز پر لکھی گئی۔

غزالی نے فارابی کی تصنیفات سے بھی خوب فائدہ اٹھایا یہ اور بات ہے کہ آخر انہیں بھی تکفیر کے تیر سے زخمی کئے بغیر نہ رہ سکے۔

ابن سینا

شیخ رئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا مسلم فلاسفہ میں سب سے زیادہ شہرت و تفوق کے مالک ہیں۔ اٹھاون برس کی عمر میں ۴۲۸ھ میں انتقال کیا۔ اطباء میں بے مثال اور بے بدل تھے فنِ طب میں ان کی کتاب القانون قرونِ وسطیٰ میں پورے مشرق و مغرب میں یکساں قابلِ اعتماد سمجھی جاتی تھی۔ فلسفہ، اخلاق، اور اختلافِ طبائع و امزجہ میں ان کے نظریات کی بسط و شرح کی طرف عربوں نے خاص توجہ دی۔ غزالی بھی ان کی تصنیفات سے بہرہ مند ہوئے لیکن آخر ان کے ساتھ سنمار کا سا سلوک کیا۔ اور عوام کی خوشنودی اور اپنی ہوس کی تسکین کے لئے ان کو کافر و بے دین کا لقب دیا۔

لہ یہ وہی بدنصیب رومی معمار ہے جس نے ملک نعمان بن امرالقیس کے لئے کوفہ کے باہر خورنق نامی مشہور محل تعمیر کیا تھا اس خوف سے کہ کہیں کسی شخص کے لئے بھی ایسا ہی محل تعمیر نہ کر دے نعمان نے اسی محل کے اوپر سے اسے گروا دیا جس سے جاں بحق ہو گیا۔ مترجم

ابنِ مسکویہ

ابو علی احمد بن محمد (متوفی ۴۲۱ھ) مسلمان فلسفی ہیں جن حکماء کے اخلاقی نظریات سے غزالی نے استفادہ کیا ہے اُن میں ابن مسکویہ کا نام سرِفہرست ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، سب سے زیادہ مشہور تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق ہے جو ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مقدمہ میں کہتے ہیں:۔

"اس کتاب کی تصنیف سے ہماری غرض یہ ہے کہ ہم اپنے اندر ایسا خُلق اور ایسا ملکہ پیدا کریں کہ تمام اچھے اعمال ہم سے خود بخود بغیر کسی تکلف اور مشقت کے صادر ہوں لیکن چونکہ یہ بات بغیر سائنٹفک طریق کے ممکن نہیں اس لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے نفوس پر غور کرنا چاہئے کہ یہ کیا اور کیسی چیزیں ہیں؟ ان کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے؟ یہ کس غرض اور کس مقصد سے ہم میں رکھے گئے ہیں ان کے وہ کون سے قویٰ اور ملکات ہیں جن کے صحیح استعمال سے ہم اس بلند مرتبہ تک پہنچ سکتے ہیں۔"

ابن مسکویہ فلسفۂ یونان کے ائمہ مجددین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یونانی حکماء سے جو کچھ نقل کرتے ہیں برملا اور ڈنکے کی چوٹ کرتے ہیں اس میں کسی قسم کی لاگ لپیٹ روا نہیں رکھتے۔ شریعت اسلامیہ کے جام اور حکمت یونان کے سندان سے بیک وقت کھیلتے ہیں، اُن کی اس کتاب کو جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ غزالی کے عقلی نقطۂ نگاہ کی تعمیر میں بڑا دخل ہے۔ میں نے چاہا کہ احیاء العلوم اور اس کتاب کے مابین مقابلہ کر کے دکھاؤں لیکن پھر اس خیال سے کہ اس باب کو جتنا پھیلاؤں گا پھیلتا جائے گا اس ارادے سے باز رہا۔ یہاں صرف اُن چند جملوں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے جن کو غزالی نے ابن مسکویہ سے تقریباً حرف بحرف لیا لیکن حوالہ کہیں نہیں دیا معلوم نہیں غزالی نے قصداً ایسا کیا یا سہواً لیکن بہرحال یہ اس امر کی کافی و قیع دلیل ہے کہ غزالی ابن مسکویہ کی تالیفات سے مستفید و متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

ابن مسکویہ	غزالی
جس نے اس لازوال نعمت سے منہ موڑ کر (۲) میں نے ان تمام کو چھوڑ کر ان کے اضداد	

ابن مسکویہ

فانی اور ناپائیدار امور پر جان دی وہ یقیناً
اپنے خالق کے غیظ و غضب کا مستحق ہے اور
اس پر جس قدر جلدی عذاب خداوندی نازل
ہو کر اس کے وجود سے انسانوں اور انسانی
آبادیوں کو پاک کردے اتنا ہی بہتر ہے۔

(۲) بچہ کی عقل و فراست کا اندازہ و تجربہ کرنے کے لئے
سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس میں حیا کا
حس بیدار ہوا ہے یا نہیں۔ اگر یہ بیدار ہو گیا ہو
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس نے برائی
کا مفہوم سمجھ لیا ہے اور اسی لئے اس کی طرف
اقدام سے ہچکچاتا ہے۔ جب آپ دیکھیں کہ بچہ
حیا مند ہے: نگاہ نیچی رکھتا ہے، شوخ نہیں۔
آپ کی طرف نگاہ بھر کر کبھی نہیں دیکھتا تو یہ
اس کی نجابت و شرافت کی پہلی دلیل اور
اس امر کی گواہ ہے کہ اس نے بھلائی اور
برائی میں تمیز کرنا سیکھ لیا ہے اور اب اس کا
نفس تادیب و تہذیب کے لئے آمادہ و تیار
ہے۔ اب اس کی خاص دیکھ بھال کی جائے
اور مطلقاً آزاد نہ چھوڑا جائے۔

غزالی

کے ساتھ اپنے آپ کو متصف کر لیا اسے
انسانوں اور انسانی آبادیوں میں رہنے کا
کوئی حق نہیں۔

(۲) جب بچے میں تمیز کے آثار ظاہر ہوں تو اس کی
دیکھ بھال شروع کر دینی چاہیے۔ جب حیا مند اور
شرمیلا ہو اور بعض امور کے ارتکاب میں ہچکچاہٹ
محسوس کرتا ہو تو اس کا مطلب ہے اب اس میں
عقل کا چراغ روشن ہو گیا ہے جس کی امداد
سے وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اب اس میں
اس بات کا شعور پیدا ہو گیا ہے کہ بعض کام
کرنے اور بعض کام نہیں کرنے چاہئیں ایسے
بچے کو ہرگز آزاد نہ چھوڑا جائے بلکہ اس حیا
اور تمیز کے ملکہ سے فائدہ اٹھا کر اس کی
نگہداشت و پرداخت کی طرف خاص توجہ
دینی چاہیے۔

(۳) بچہ کا نفس بالکل سادہ و بے رنگ ہوتا ہے۔ (۳) بچہ اپنے والدین کے ہاتھوں میں ایک امانت

غزالی	ابن مسکویہ
ہوتا ہے اور اس کے پاک دل کا نسخہ ہر قسم کے نقش و تصویر سے سادہ و بے رنگ ہوتا ہے	اس پر ابھی کوئی صورت نقش نہیں ہوئی ہوتی وہ کسی کام کے ترک و اختیار کی کوئی رائے نہیں رکھتا ہوتا۔
(۴) بچے کو سفید لباس کا شوق دلایا جائے اور اس کے ذہن نشین کرایا جائے کہ رنگین و ریشمی اور زرتار کپڑے پہننا عورتوں اور مخنثوں کا کام ہے۔ مردوں کو ایسے لباس سے احتراز کرنا چاہیے اور ایسی باتیں اس کے سامنے برابر دہراتے رہنا چاہیے۔	(۴) بچے کے ذہن نشین کرایا جائے کہ رنگین اور منقش کپڑے عورتوں، نوکروں اور شاگرد پیشہ لوگوں کو زیب دیتے ہیں، شریفوں کے مناسب سفید یا اس سے ملتے جلتے رنگ کے کپڑے ہو سکتے ہیں بچہ کے ہر قریبی عزیز کو اس قسم کی باتوں کا بار بار اعادہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ یہ باتیں اس کی طبیعت کا جزو بن جائیں۔
ان بچوں کے میل جول سے باز رکھنا چاہیے جو تن آسان، راحت پسند اور ناز و نعمت کے پروردہ ہوں کیونکہ جب بچے کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کی تربیت سے غفلت برتی جائے تو عموماً بدعادت، جھوٹا، حاسد چور، چغلخور، ضدی اور باتونی ہو جاتا ہے[1]۔	(۵) ان لوگوں کے میل جول اور مخالطت سے روکا جائے جو ہماری ان مذکورہ باتوں کے خلاف رائے رکھتے ہیں، اس کے وہ ہم عمر بچے جن کے ساتھ وہ صبح شام کھیلتا اور اٹھتا بیٹھتا ہے اور ان کی تربیت اس ڈھنگ پر نہیں ہوئی ان کے اختلاط سے خاص طور کو روکا جائے کیونکہ بچہ ابتدائی عمر میں عموماً شریر، جھوٹا، حاسد، چور، چغلخور، ضدی اور باتونی ہوتا ہے

---

[1] دونوں عبارتوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ غزالی کی عبارت زیادہ دقیق اور جامع ہے کیونکہ انھوں نے اخلاق کی خرابی کا ذمہ دار تادیب و تربیت کی طرف سے غفلت اور بے پروائی کو ٹھہرایا ہے۔ (مؤلف)

ابن مسکویہ	
(۶) اسے عمدہ عمدہ سبق آموز تاریخی واقعات اور اشعار حفظ کرانے چاہئیں، جن اشعار میں عشق و محبت یا عشاق کا تذکرہ ہو یا ایسا کلام جس کے متعلق لوگ رائے رکھتے ہوں کہ اس سے طبیعت میں ایک گونہ رقت اور گداز پیدا ہوتا ہے بچے کو ہرگز نہیں پڑھنے دینا چاہئے کیونکہ اس سے اخلاق کے بگڑنے کا قوی خطرہ ہے۔	پھر اُسے مکتب میں بٹھانا چاہئے تاکہ قرآن حکیم اور بزرگوں کے قصص و حکایات پڑھے ایسے اشعار جن میں عشق و محبت کا بیان ہو ہرگز نہ پڑھانے چاہئیں ایسے ادبا کی صحبت و ہم نشینی سے روکنا چاہئے جو سمجھتے ہیں کہ عشقیہ کلام کے سننے اور پڑھنے سے طبیعت میں ایک گونہ رقت اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے کیونکہ ایسے لوگوں کی ہم نشینی بچوں کے دلوں میں فسادِ اخلاق کی تخم ریزی کرتی ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ تربیت کے باب میں یہ نظریات فطری ہیں ان میں کسی کی نقل و محاکات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن میں کہوں گا کہ غزالی اور ابن مسکویہ کے نظریات میں اس قدر یکرنگی اور مشابہت سے کم سے کم اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کے نظریات بھی پہلے فلاسفہ سے ماخوذ ہیں اور اس باب میں کسی جدت و اختراع سے غزالی کا ہاتھ تقریباً خالی ہے۔

دوسری فصل

تصوف کا سرچشمہ

تصوف کے سرچشمہ سے ایک طویل عرصہ تک سیراب ہونے کی وجہ سے غزالی کی سرخوشی سرمستی کا یہ عالم ہوا کہ انھوں نے خود بھی بے محابا تصوف اور سیر و سلوک کی ایسی باتیں کہنا شروع کر دیں، جن میں سے کچھ تو عوام کی سمجھ میں آسکتی تھیں اور کچھ کے سمجھنے سے وہ عاجز و قاصر تھے۔ کتاب الاربعین اور احیاء العلوم میں صوفیہ کے گروہ کے اتباع اور تاسی اور ان کی طرف انتساب کی مثالیں

کثرت موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے عشق و شیفتگی نے انھیں ایسا گھائل کیا کہ سب کچھ
چھوڑ کر انھیں کے ہو رہے۔ جب کبھی صوفیہ کا ذکر کرتے ہیں تو کمالِ محبت و وارفتگی سے کرتے ہیں اور
اس طرح ایک غریب الوطن اپنے وطن و دیار کی محبت و کشش میں سرداں پھرتا اور زار زار روتا
ہے اسی طرح غزالی صوفیہ کے ہجر و فراق میں بے چین اور آتش زیر پا ہوتے ہیں منہاج العابدین میں
ان کے اس قول پر غور فرمایئے

زندگی کی وہ تھوڑی سی رونق اور درخشانی جو کبھی کبھی ہم سے ظہور میں آتی ہے یہ صرف انھیں کے
طفیل و برکت سے ظہور میں آتی ہے جو ہمارے شیوخ و اسلاف کے جادۂ مستقیم پر چلتے ہیں مثلاً
حارث محاسبی، محمد بن ادریس شافعی، مزنی اور حرملہ وغیرہم رحمہم اللہ اجمعین۔ ان ائمہ دین کی حالت و
کیفیت شاعر کے ان اشعار کے عین مطابق تھی۔ اشعار

انھوں نے کمال پاک بازی اور نیکی و صلاح سے زندگی بسر کی اور اپنے آقا و مولیٰ کی محبت
کے بغیر کوئی علاقہ و چارۂ کار نہ پایا یہ لوگ صاحبِ فضیلت و ولایت اور خدا رسیدہ تھے ان کا
منتہائے مقصود آقاؤں کے آقا اور سرداروں کے سردار تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ زمانہ کے
حوادث و آلام نے تمام لوگوں کے پیمانۂ صبر و شکیب کو لبریز کر دیا لیکن ان اہل اللہ کے صبر و استقامت
میں ذرا سی بھی جنبش نہ ڈال سکے۔

دورِ اول میں ہم عزت و شوکت کے تختِ شاہی پر متمکن و جلوہ گر تھے لیکن آج ذلیل و خوار ہیں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

کل تک آرام و راحت کے تکیے پر کروٹیں بدل رہے تھے لیکن آج ذلت و ادبار کی زمین پر ایڑیاں
رگڑ رہے ہیں۔

وہ قدم جن کو رگِ گل سے بھی ہوتی تھی خلش
سجدہ گاہ سنگ ہے پا بوس گاہ خار ہے

کاش ہم سیدھی راہ سے نہ بھٹکتے۔ تمام مصائب میں اللہ ہی کی اعانت و دستگیری درکار ہے
ہم دست بدعا ہیں کہ زندگی کی وہ تھوڑی سے رمق جو ہم میں باقی ہے اس سے بھی کہیں محروم
نہ کر دئے جائیں۔ انہ جوادٌ کریم، منّان رحیم، ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم[1]
آپ ہی بتائیے کہ شوق و کشش، عشق و شیفتگی اور سوز و گداز کا اس سے زیادہ مظاہرہ کہیں ممکن ہے؟

تصوف کی اصل وحقیقت

شریعتِ اسلامیہ کی دعوت اس تصوف کی تعلیم سے بالکل مغائر و مختلف ہے جس کے حاملین و
متبعین کے نقشِ قدم کو غزالی اپنے لئے مایۂ ناز سمجھتے ہیں۔ یہ تصوف ہندی، فارسی اور یونانی مذاہب
کا ایک مجموعۂ قامیزہ ہے جو مسلمانوں تک پہنچا اور جب بعض عبادوز | دنے اسے اپنے ذوق و وجدان
اور اپنی طبیعت و مزاج کے مطابق پایا تو دین کا رنگ و نام دے کر اس کے لئے دین ہی کے
قواعد و اصول مرتب و مدوّن کر ڈالے۔

بعید نہیں کہ تصوف کی تعلیمات کا وہ حصہ جو نفس کی طہارت و پاکیزگی، خیر سے محبت، شر سے
بیزاری و دوسرے وہ امور جو انسانی نفوس کو برے اور مذموم صفات سے پاک اور منزہ ہونے میں
امداد دیتے ہیں وہ اپنے جوہر و حقیقت میں اسلام ہی سے ماخوذ ہوں لیکن اتنا تو کامل وثوق و
اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ترکِ دنیا، قطعِ علائق اور زندگی سے فرار کا جذبہ، اسلام کی
روح کے یکسر منافی و متضاد ہے۔ اس لئے کہ اسلام ہمت و قوت کا داعی اور سارے عالم کو مسخر و
زیرِ نگین لانے کی صلاحیتوں کا کفیل و ذمہ دار ہے لیکن اس کے برعکس تصوف کی بارگاہ سے اس کے
حاملین کو ہمیشہ ذلت و غلامی کی خلعتوں سے نوازا جاتا رہا ہے۔

صوفیہ کی ہمنوائی

آپ دیکھیں گے کہ غزالی زندگی کی ہر ہر شاخ میں صوفیہ کے ہمنوا و ہم آہنگ ہیں۔ لوگوں کی
مذمت، زمانے کا شکوہ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود پرست اور ریاکار پارساؤں کے زہد و ریا
کی پردہ دری، ان سب میں صوفیہ کے قدم بقدم چلتے ہیں غزالی کی مدوّنہ کتبِ اخلاق کے

---

[1] ص ۹۶ و ۹۷

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صالح گروہ جن کو یہ اپنی اصطلاح میں علمائے آخرت کہتے ہیں اُن کی محبت غزالی کے قلب و دماغ میں رچی ہوئی ہے حتیٰ کہ اُن کے مقابلے میں اپنا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ اشعار:۔

ایک وہ ہیں کہ بامراد و کامگار ہو کر بادہ وصال سے سرمست و سرشار ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ہجر و وصال کی درمیانی وادی میں حیرت و تردد کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ محبوب کی دوری و فرقت سے اس کے قرب و حضور کے طالب ہیں۔ آہ ایسا کبھی نہیں ہوا اور کبھی نہیں ہوگا۔ اے محبوب اپنے وصال کے ایک ایسے جرعہ سے ہمارے کام و دہن کو آشنا کر کہ سارے غم غلط ہو جائیں اور حق و صواب کی راہ ہم پر باز ہو جائے، اے جملہ امراض کے طبیب، اے زخمی دلوں کے مرہم، اے ہر قسم کے دکھ اور درد کے دور کرنے والے، میں نہیں جانتا کہ اس درد کا درماں کیا ہے، میں نہیں جانتا کہ وہ کون سے اعمال اور کون سی تدبیریں ہیں جن کی وجہ سے یوم شمار میں نجات اور مخلصی ہوگی۔

یہیں سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بعض وہ الفاظ جن کو شرعی قیود کے تحت نہایت احتیاط سے استعمال کرنا چاہیئے تھا غزالی اُن کے استعمال میں کسی قید و شرط کو روا نہیں رکھتے، معاصرین نے جوان پر تنقید کے تیر برسائے تو اس کی بھی بڑی وجہ یہی تھی کہ بغداد اور دمشق کی خلوت گزینی اور کتب تصوف کے بہیم مطالعہ و تدبر سے غزالی پر یہ اثر ہوا کہ وہ اکثر اوقات بعض ذوقی اور وجدانی امور کے سامنے ایسے سپر انداز ہو جاتے ہیں کہ خود کو پورا کا پورا اُن کے حوالے ہی کر دیتے ہیں۔

تصوف میں اس قدر غلو کے باوجود غزالی ناقدین کے طعن سے بچ نہ سکے، انھوں نے کہا کہ تصوف کے باب میں غزالی بالکل جاہل و عاری ہیں۔ انھیں تصوف سے دور کا بھی تعلق اور لگاؤ نہیں تا آنکہ زبیدی اور غزالی کے دوسرے عقیدتمندوں کو یہ ثابت کرنا پڑا کہ تصوف کے جن مختلف آراء و طرق کو قوت القلوب اور رسالہ قشیریہ میں بیان کیا گیا ہے غزالی نے بجنسہ ان کی نقل حکایت کر دی ہے اور اس سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ و تصرف نہیں کیا۔

قوت القلوب

صوفیہ کی جن کتابوں سے غزالی متاثر ہوئے ہیں اُن میں قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب کا نام سرفہرست ہے۔ یہ کتاب ابوطالب مکی کی تالیف ہے جنھوں نے ۳۸۶ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ اب یہ کتاب بازاروں میں ناپید اور نایاب ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ مصر کی لائبریری میں نمبر ۲۷۶۳۶ کے تحت محفوظ ہے یہ دو جلدوں میں ہے پہلی جلد ۲۷۰ اور دوسری ۲۹۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کو صحیح معنوں میں احیاء العلوم کا ماخذ کہا جا سکتا ہے اگر آپ صرف توکل کے باب ہی کا دونوں کتابوں میں مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ غزالی اور ابوطالب مکی دونوں ایک ہی راہ سے ایک ہی مقصد کی طرف بڑھ رہے ہیں حتیٰ کہ دونوں کتابوں میں قرآن حکیم کی آیات احادیث اور قصص و اخبار بھی بالکل ایک ہیں۔ یہاں سے اس امر کا یقین کیا جا سکتا ہے کہ غزالی کو قوت القلوب میں جو بات صحیح اور اچھی معلوم ہوئی اس کو احیاء میں درج کر دیا اگرچہ افسوس ہے کہ کہیں اس کا حوالہ نہیں دیا بلکہ بعض اوقات تو عنوان تک بدل دیئے ہیں مثلاً ابوطالب مکی نے اگر عنوان باندھا ہے (متوکل کے حکم کا ذکر جبکہ وہ صاحب خانہ اور با اہل و عیال ہو) تو غزالی نے اس عنوان کو یوں بدل دیا ہے (متوکلین کے ان آداب کا بیان جو مال و اسباب کے چوری ہو جانے پر ملحوظ رکھنے چاہئیں) کہیں ایک مسئلہ قوت القلوب میں کسی دوسرے مسئلہ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے لیکن غزالی نے ایک خاص اور مستقل عنوان کے تحت اُس کو بیان کر دیا کہیں صاحب قوت القلوب نے ایک مسئلہ کو ایک خاص عنوان کے تحت بیان کیا تو غزالی نے احیاء العلوم میں اُس کو ایک دوسرے مسئلہ کے ضمن میں بیان کر دیا۔ پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ ساری پونجی غزالی کی اپنی ہی ہے اگر طوالت و اطناب کا خوف نہ ہوتا تو ہم ایک ہی موضوع پر دونوں کتابوں سے اقتباسات پیش کرتے۔

گزشتہ زمانہ میں احیاء علوم الدین اور قوت القلوب دونوں صوفیہ کی عنایت و توجہ کا

برابر مرکز رہی ہیں۔ ابوالحسن شاذلی سے منقول ہے کہ احیا تمہیں علم کی دولت بخشے گی اور قوت القلوب تمہارے دل کو نور سے معمور کر دے گی اور یہ بات ایک حد تک سے بھی درست کیونکہ جہاں احیاء میں اطناب اور انتہائی تفصیل سے کام لیا گیا ہے وہاں قوت القلوب گویا کمال ایجاز دقت نگاہ اور خلوص و پاکیزگی کا ایک عمدہ نمونہ و مرقع ہے۔ قوت القلوب کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ اس کے مؤلف نے صوفیہ کے اسرار و عقائد کے بیان میں بہت احتیاط اور ذمہ داری برتی ہے بخلاف احیاء کے کہ اس میں اس طائفہ کے اسرار و عقائد کے بیان میں بہت مبالغہ و اغراق سے کام لیا گیا ہے باقی رہی اسلوب کی دقت و خوبی سو وہ تقریباً احیاء میں ناپید اور مفقود ہے۔

رسالہ قشیریہ

تصوف کا یہ رسالہ ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مؤلف ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری ہیں جنھوں نے ۱۶ ربیع الآخر ۴۶۵ھ میں وفات پائی شیخ الاسلام زکریا انصاری نے احکام الدلالۃ فی شرح الرسالۃ کے نام سے اس کی شرح لکھی جس کا ایک قلمی نسخہ مصر کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

جیساکہ خود قشیری نے مقدمہ میں بیان کیا ہے انھوں نے اس رسالہ کے ذریعہ ۴۳۷ھ میں تمام دنیائے اسلام کے صوفیہ و مشائخ سے خطاب کیا ہے۔ اس زمانہ کے صوفیہ کی اصلاح حال کے لئے رسالہ قشیریہ کی حیثیت ایک عام منشور کی ہے۔ غزالی کی منہاج العابدین کی طرح قشیری کے رسالہ کا آغاز بھی آہ و فغاں اور نالہ و ماتم سے ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں۔ اے لوگو! تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ دیکھو محققین صوفیہ کا زمانہ و دور تقریباً گذر چکا ہے اور موجودہ زمانہ میں ان کا صرف ایک اثر و نشان باقی ہے جیساکہ کہا گیا ہے۔

امّا الخیام[1] فانها کخیامهم　　واری نساء الحی غیر نساءها

---

[1] خیمے تو بالکل ان کے خیموں کی طرح ہیں لیکن آبادی و قبیلہ کی عورتیں معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ہیں۔

یہ مشرب بہت بڑے وقفہ و التوا کا شکار ہو گیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس مشرب کا چراغ ہی حقیقت میں گل ہو گیا ہے

قشیری نے رسالہ کے آغاز میں اصول توحید کے متعلق صوفیہ کے عقائد کی وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد بیاسی مشائخ صوفیہ کے تراجم و سوانح نہایت اختصار کے ساتھ قلمبند کیے ہیں بعد ازاں اس گروہ کے متداول الفاظ و اصطلاحات اور رہ سپارانِ بادیۂ تصوف کے احوال و مقامات کی شرح و تفسیر کی ہے مثلاً وقت، مقام، حال، قبض، بسط، تواجد، وجد، وجود وغیرہ۔ آخری چند ابواب مجاہدہ، خلوت، عزلت، مراقبہ، صبر، شکر، خوف اور رجا وغیرہ کے معانی کے لیے وقف کیے ہیں۔

رسالہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شیوخِ طریقت اور سالکین راہ کے کلام و اقوال سے بہت زیادہ نقل و اقتباس کیا گیا ہے۔ اگرچہ احیاء و رسالہ میں مندرجات کی نوعیت کے اعتبار سے کافی بڑا فرق اور تفاوت ہے لیکن اس کے باوجود زبیدی کا یہ قول درست اور صحیح ہے کہ احیاء العلوم کی تالیف کے وقت رسالہ قشیریہ خاص طور پر غزالی کے پیش نگاہ رہا ہے۔ اگر کوئی شخص احیاء کے مختلف ابواب میں رسالہ کے اثرات کا سراغ اور کھوج لگانا چاہے تو بآسانی لگا سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ اتنا استفادہ کرنے کے باوجود غزالی نے صاحبِ قوت القلوب اور مؤلفِ رسالہ قشیریہ کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔

تیسری فصل

وہ صوفیہ جن سے غزالی متاثر ہوئے

یقیناً مناسب ہوگا کہ اب ہم صوفیہ کی اس خاص جماعت کا ذکر کریں جن کی تصنیفات کے مطالعہ سے غزالی متاثر ہوئے اور اپنی تالیفات میں جا بجا اُن کے اقوال کو بطور حوالہ وسند

پیش کیا ہے کیونکہ غزالی کے اخلاقی احکام کے وضع کرنے اور پھر اُن کو تصوف کے قالب میں ڈھالنے میں ان حضرات کا غیر معمولی حصہ ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام شافعی غزہ میں پیدا ہوئے اور زندگی کے آخری چار برس مصر میں مقیم رہنے کے بعد ۲۰۴ھ میں وہیں رحلت فرمائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۵۴ برس تھی۔

حضرت امام شافعی کے تشریعی نقطۂ نگاہ سے بحث کا یہ مقام نہیں، موقع محل کی رعایت و مناسبت سے صرف اتنی سی بات کی طرف اشارہ غالباً کافی ہوگا کہ احیاء العلوم میں غزالی نے اس امر کی تصریح کردی ہے کہ کتاب الام جو امام موصوف کی طرف منسوب ہے یہ حقیقت میں اُن کی نہیں بلکہ بویطی کی تالیف ہے۔

چونکہ غزالی حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے صوفیانہ پہلو سے بہت متاثر ہوئے ہیں اس لئے ہم ان کی زندگی کے صرف اسی ایک پہلو سے تعرض کرتے ہیں۔ حضرت امام تقویٰ و ورع اور بے نفسی و خود فراموشی کے لئے بہت بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ عموماً کہا کرتے تھے "کاش میرا سارا علم لوگوں تک ایسی راہ سے پہنچتا کہ اس کا ایک لفظ اور ایک حرف بھی میری طرف منسوب نہ ہوتا"

آپ کے کلام کے بعض نمونے

اب ہم آپ کے سامنے حضرت امام شافعیؒ کے بعض وہ اقوال پیش کرتے ہیں۔ جو لوگوں میں ضرب الامثال کے طور پر مشہور ہیں۔

"جو کوئی اس شخص کے سامنے جھکتا ہے۔ جو اُسے خاطر میں بھی نہیں لاتا، اُس شخص سے محبت اور پیار کرتا ہے جس کی محبت اور پیار کسی معنی میں بھی مفید اور نفع مند نہیں، اُس شخص کی تعریف و توصیف سے خوش ہوتا ہے۔ جو اُس سے متعارف و آشنا ہی نہیں۔ حقیقت میں ایسے شخص سے زیادہ کوئی اپنا دشمن نہیں ــــ مباحثہ و مجادلہ سے سنگدلی اور باہم کینہ و نفرت کے جذبات پرورش پاتے ہیں ــــ جس میں نیکی اور صلاح نہیں وہ کسی عزت و توقیر کا مستحق نہیں ــــ

انسانوں کی دیکھ بھال جانوروں اور چوپایوں کی دیکھ بھال سے کہیں زیادہ کٹھن اور مشکل ہے
—— اگر مجھے علم ہو جائے کہ ٹھنڈا پانی پینے سے بھی میری مروت اور شرافت کو ٹھیس لگے گی تو
میں اس کو کبھی بھی نہ پیوں —— جو تم سے تواضع و مدارات کا طالب ہو وہ تمہارا سچا دوست
نہیں —— مگر اور سچا دوست وہ ہے جو دوست کی معذرتوں کو تسلیم کرتا، اس کی مزدورت
کے وقت کام آتا اور اس کی لغزشوں سے درگذر کرتا ہے —— جس کے گھر میں آٹا نہ ہو اس سے
کسی باب میں صلاح و مشورہ نہ کرو —— کسی کی شرافت و مروت پر اعتماد کر کے اس کے حق میں
کمی نہ کرو —— جس کو تمہاری درخواست کے ٹھکرا دینے میں کوئی تامل اور باک نہ ہو اس کے
سامنے کبھی کوئی درخواست نہ رکھو —— جو تمہارے سامنے آکر کسی کی چغلی کھاتا ہے وہ دوسرے
کے سامنے جا کر تمہاری چغلی بھی ضرور کھائے گا —— جو اپنا لباس صاف و ستھرا رکھے گا غم و الم
کا کھٹکا کم ہو گا —— جو عطر استعمال کرے گا اس کی عقل میں اضافہ ہو گا۔

مزنیؒ

امام ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی ۱۷۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۶۴ھ میں وفات پائی
تحصیل علم حضرت امام شافعیؒ سے کی اور پھر ساری زندگی انہیں کے مذہب کی نشر و اشاعت
میں مصروف رہے۔ حضرت امام شافعیؒ کہا کرتے تھے کہ اگر مزنی شیطان سے بھی مناظرہ کرتے
تو بھی میدان یقیناً انہیں کے ہاتھ رہتا۔ عمرو بن عثمان مکی کے حوالہ سے سبکی نے نقل کیا ہے کہ میں نے
زندگی میں بے شمار عبّاد و زہاد کو دیکھا لیکن مزنی سے زیادہ مرتاض، اور عبادت و زہد میں ان سے
زیادہ کسی کو دائم اور مستقیم نہیں پایا۔ ان سے زیادہ اہل علم و فضل کا کوئی قدر شناس نہ تھا۔ اپنی ذات
کے بارے میں تقویٰ اور صلاح میں نہایت متشدد اور مبالغہ پسند تھے لیکن دوسروں کے معاملہ
میں نہایت نرم گیر، روادار اور فراخ حوصلہ تھے۔

حرملہؒ

حرملہ بن یحییٰ بن عبداللہ بن حرملہ ۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۳ھ میں راہیٔ عالم بقا ہوئے

حضرت امام شافعیؒ کے شاگرد اور ان کی حکمت و دانش مندی کے اقوال کے بہت بڑے راوی ہیں سبکی لکھتے ہیں مزنی وغیرہ دوسرے علمار کی طرح ربیع بھی بعض اوقات حضرت امام شافعیؒ کے مذہب کے قائم کردہ اصول و فروع سے مختلف کرجاتے ہیں۔"

محاسبیؒ

ابو عبداللہ حرث بن اسد محاسبی حضرت جنیدؒ کے شیخ طریقت ہیں ۲۴۳ھ میں بغداد میں انتقال کیا کہتے ہیں چونکہ یہ اپنے نفس کا محاسبہ اکثر کیا کرتے تھے اسی لیے لوگوں نے انھیں محاسبی کا لقب دے دیا۔ فقہ تصوف حدیث اور علم کلام میں تقریباً دوسو کتب تصنیف کیں حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں میں اکثر اوقات حضرت محاسبیؒ سے کہا کرتا تھا کہ لوگوں کی یکسوئی اور انقطاع سے میرے دل کا سکون بڑھتا ہے" محاسبی اس کے مقابلہ میں کہتے "یکسوئی اور سکون، یکسوئی اور سکون کا کیا تکرار کرتے رہتے ہو اپنا تو یہ عالم ہے کہ اگر پوری انسانی آبادی کا نصف ہمارے گرد جمع ہو جائے تو سکون و دلجمعی کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر پوری انسانی آبادی کا دوسرا حصہ ہم سے کنارہ کر جائے تو کبھی وحشت و دلگیری نہ ہو، ایک دفعہ جب انکے سامنے کسی نے یہ اشعار پڑھے اشعار

> جب تک کسی غریب الدیار اور غریب الوطن کی آنکھ غربت میں اشکبار رہے گی اس وقت تک میری آنکھ بھی اشک فشانی کرتی رہے گی جس روز میں نے اپنے وطن و دیار کو خیرباد کہا، اس روز کچھ اچھا نہیں کیا۔ حیرت ہے میں نے اس وطن کو کیوں چھوڑا جس میں میرا محبوب مقیم ہے۔"

تو وجد کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ایسا زار و قطار روئے کہ سارے مجمع پر ایک رقت اور سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ ان کا قول ہے

> اس امت کے بھلے لوگ وہ ہیں جن کو آخرت کا فکر و اندیشہ دنیا سے اور دنیا کا فکر و اندیشہ آخرت سے باز نہ رکھے —— کسی کے ایذا پر صبر و تحمل کرنا، غصہ میں کم آنا، مہر و شفقت کے جذبات کو عام کرنا، ہر شخص کے ساتھ خوش کلامی اور ملاطفت سے پیش آنا ہی حسن خلق ہے — چاہے لوگ ظالم کی کتنی ہی تعریف کریں آخر وہ اپنے ظلم پر ضرور نادم و پشیمان ہوگا مظلوم

لوگ لاکھ برا کہیں لیکن انجام کار وہ ضرور سرخرو ہوگا۔۔۔ قناعت پیشہ و سیر چشم آدمی فقیر و مفلس ہونے کے باوجود غنی و مالدار ہے۔ لالچی اور طماع، متمول و دولت ہونے کے باوصف محتاج و فقیر ہے۔"

جُنیدؒ

حضرت جنید صوفیہ کی نگاہ میں بلا نزاع علماء آخرت کے مولی و آقا اور سرگروہ و سرخیل ہیں ۲۹۷ھ ہجری میں آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ کے بعض احوال و مقامات ایسے تھے جنھیں عقل اور شرع کسی صورت روا نہیں رکھتے۔ آپ کا قول ہے۔

"کسی کا دل اللہ کے ذکر کی وجہ سے جتنا پاک اور صاف ہوتا ہے اتنا ہی اللہ سبحانہ اس میں نیکی اور معرفت کا القا فرماتے ہیں تو تمہیں غور کرنا چاہیے کہ تمہارے آئینۂ دل پر اللہ سے غفلت کا غبار تو نہیں آگیا۔۔۔ اللہ کی طرف سے غفلت اور اعراض کا عذاب آگ کے عذاب سے زیادہ شدید اور زیادہ مہلک و جانکاہ ہے۔۔۔ جب کسی فقیر و نادار سے ملو تو اس کے سامنے علمی موشگافیوں کی بجائے اس کی دلجوئی اور دل جوئی کی باتیں کرو کیونکہ تمہاری علمی بحثوں سے اُسے وحشت ہوگی لیکن تمہارے حسن سلوک سے اُس کا حوصلہ بڑھے گا۔"

غزالی کی مختلف تصنیفات میں ایسے مشائخ و صوفیہ کی ایک بہت بڑی تعداد کا ذکر موجود ہے جن کے اقوال کو وہ اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ ان صوفیہ کے اقوال و آراء اُس زمانے میں مشہور و معروف تھے اور غزالی نے ان سے خاصا استفادہ کیا۔ اگر ایجاز و اختصار کا ہاتھ ہمیں روک کر ہمیں ان کے ذکر و بیان سے روک نہ رہا ہوتا تو ہم ان سب حضرات کا بالتفصیل ذکر کرتے۔

چوتھی فصل

شریعت کا سرچشمہ

جن جن سرچشموں سے غزالی سیراب ہوئے اُن میں شریعت کا سرچشمہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی تصنیفات میں آپ قرآن حکیم کی آیات اور احادیث و اخبار کا ایک انبار پائیں گے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے اکثر علماء کی رائے ہے کہ غزالی کے ہاں اخلاق کا تصور بعینہٖ وہی ہے جو اسلام نے قائم کیا ہے۔ لیکن عن قریب جب ہم اخلاق کے باب میں غزالی کے نظریات کی وضاحت کریں گے تو آپ دیکھ لیں گے کہ ان علماء کی رائے کی وقعت و حقیقت کیا ہے؟

یہ جو ہم نے ابھی کہا ہے کہ شریعت کا سرچشمہ تو اس سے مراد فقط قرآن حکیم اور احادیث و اخبار ہی نہیں بلکہ اس سے مراد فقہاء کے اقوال و آراء بھی ہیں جن سے غزالی بہت متاثر ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے نقل و حکایت میں غزالی بہت محتاط ہیں اور اس احتیاط کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فقہاء زندگی کے ہر ہر قدم پر دینِ حنیف کے تقاضوں کا دامن تھامے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

انجیل

غزالی انجیل سے بھی غافل نہ تھے انھوں نے اس سے بھی خوب استفادہ کیا اور اپنی تالیفات میں اس کی تعلیمات پر کافی بھروسہ اور اعتماد کیا ہے اور ایسا کرنا ایک معنی میں ناگزیر بھی تھا اس لئے کہ جو شخص اُس مذہب کا متبع و پیرو ہو جس کی تعلیم ہے کہ انبیاء و رسل میں تمیز و تفریق نہ کرو بھلا وہ انجیل کی تعلیمات سے صرفِ نظر اور اعراض کرتا بھی تو کیسے کر سکتا تھا؟

ڈاکٹر زویمر نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہرگز لائقِ اعتبار نہیں کیونکہ ڈاکٹر موصوف نے اپنی ساری سعی و کوشش اس امر کے ثابت کرنے میں صرف کر دی ہے کہ غزالی کی ہدایت یابی کا سارا سہرا انجیل کے سر ہے حالانکہ حقیقت و واقعہ اس کے خلاف ہے۔ غزالی کو ٹھوکر ہی اس وقت

لگی جب اُنھوں نے انجیل کے تعلیمی و منفی آداب کی طرف استعانت و احتیاج کا ہاتھ بڑھایا۔

اس اجمال کی شرح و تفصیل یہ ہے کہ انجیل کے وضع کردہ اور قرار دادہ آداب و اخلاق سرتاسر غیر فطری اور غیر طبعی ہیں کسی کو بھی ان کے دامن میں پناہ دے کر سکون خاطر کی دولت نصیب نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر انہیں کی یہ تعلیم کہ جو تمھارے داہنے رخسار پر طمانچہ مارے اُس کے سامنے بایاں رخسار بھی رکھ دو۔ بالکل ناممکن العمل اور ناممکن التصور ہے عرف عام یا دنیا کا کوئی قانون بھی اس کی تائید کے لئے تیار نہیں۔ مسیحیت کا علم الاخلاق کہتا ہے کہ جو تمہیں ایک میل تک بیگار میں پکڑے تو تم دو میل تک اُس کے ساتھ جاؤ۔ ہم انصاف آپ ہی پر چھوڑتے ہیں بتائیے کیا یہ اخلاق قابل قبول ہو سکتے ہیں، کیا پورے روئے زمین پر ایک بھی مسیحی آپ کو ایسا مل سکتا ہے جو داہیں رخسار پر تھپڑ کھا کر بایاں رخسار آپ کے سامنے کر دے کیا آپ کسی ایک بھی مسیحی کی نشان دہی کر سکتے ہیں جسے آپ اگر ایک میل کی بیگار میں پکڑیں تو وہ خوشی سے دو میل تک آپ کے پیچھے دوڑتا

تعجب کی بات ہے کہ ڈاکٹر زویمر غزالی کے اس بیان سے متفق نہیں ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام ساٹھ دن تک بغیر کچھ کھائے پیئے اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔ ڈاکٹر موصوف کی رائے ہے کہ یہ دن ساٹھ نہیں بلکہ چالیس تھے۔ اے الق محدا احترام ڈاکٹر صاحب! اس تصحیح کے تکلف کی سرے سے ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ سارا قصہ ہی سرتاسر محض فرضی اور خیالی ہے۔ جو شخص چالیس یا ساٹھ دن تک کھائے پیئے بغیر زندہ رہتا ہے اُس کا یہ کمال سہی لیکن بتائیے کہ وہ اس کش مکش اور محنت و زور آزمائی کی دنیا میں کتنے کام سنوار سکتا ہے؟ کیا احبار و رہبان بھی ایسی زندگی پر قادر ہو سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن کیا آپ کو علم ہے کہ اس ستیزہ گاہ عالم میں ان زندہ لاشوں کی قدر و قیمت اور وقعت و حقیقت کیا ہو گی!

غزالی کے اس قول سے زیادہ کھلی اور فاش غلطی کیا ہو سکتی ہے کہ درۂ فاخرہ میں کہتے ہیں:

حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی سے عبرت و نصیحت پکڑو کہ کامل بیس برس تک انھوں نے ایک ہی کپڑے میں زندگی بسر کی۔ اپنی تمام سیر و سیاحت میں صرف پانی کا ایک کوزہ، ایک

کنگھی اور ایک تسبیح کے سوا اپنے پاس کچھ نہ رکھا ایک دن کسی کو دیکھا کہ ہاتھ سے پانی پی رہا ہے تو کوزہ وہیں چھوڑ دیا اور پھر زندگی بھر میں کبھی استعمال نہ کیا پھر ایک دن کسی کو دیکھا کہ انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کر رہا ہے تو کنگھی وہیں پھینک دی حضرت مسیح علیہ السلام ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میرے دونوں قدم میری سواری ہیں۔ زمین کے غار میرا گھر ہیں، زمین کا سبزہ و نباتات میرا کھانا ہیں، نہروں کا پانی میرا مشروب ہے اور انسانوں میں رہنا میرا ٹھکانا ہے۔"

غزالی کی یہ دعوت و تلقین سرتاسر مردود اور ناقابل قبول ہے اس لئے کہ اسلام اس طرح کی زندگی سے بالکل متعارف و آشنا نہیں۔ حیرت ہے کہ غزالی مسلمانوں کو حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح بیس برس تک ایک ہی کپڑے میں بسر کرنے کی عبرت دلاتے ہیں حالانکہ حضرت مسیح کا یہ واقعہ خود فی نفسہ فکر و نظر کا محتاج ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کپڑا بیس برس تک برابر انسان کے جسم پر باقی رہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ یہ بھی کوئی معجزے کے قبیل کی کوئی چیز ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس شخص کی سمجھ میں اس قسم کے معجزات نہ آئیں وہ بیٹھا اپنا سر پیٹا کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس عیسیٰ کے متعلق اس قسم کی بے سروپا باتیں مشہور ہیں اس سے مراد حضرت مسیح نہیں بلکہ کوئی فرضی شخصیت ہے جس سے تاریخ کے صفحات بالکل ناآشنا ہیں ورنہ دنیا کا کون سا ایسا ملک ہے جس کی آب و ہوا میں یہ کیمیاوی اثر ہو کہ ایک کپڑا کامل بیس برس تک انسانی جسم پر رہے اور اس کے چیتھڑے نہ اُڑ جائیں یا اس پوشاک کی بُو سے پہننے والے کے سارے تلامذہ و احباب کو گھن نہ آنے لگے۔ اِدھر تو غزالی اس قسم کی ریاکارانہ زندگی کی ترغیب دیتے ہیں اور اُدھر حضرت مسیح علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہیں کہ روزہ دار کو چاہیئے کہ سر اور داڑھی میں تیل لگائے، ہونٹوں کو تر کر لے تاکہ دیکھنے والے کو اس کے روزے کا وہم و گمان بھی نہ گذرے۔ دونوں قولوں میں کس قدر بُعد اور تضاد ہے

پہلے میں ریا اور نمائش کی ترغیب اور دوسرے میں اس سے مجتنب اور محترز رہنے کی تلقین ہے۔

اس سے بڑھ کر تعجب کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ غزالی حضرت مسیح علیہ السلام کا قول و ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "جو شخص تم سے چادر لے لے تم خود اپنا ازار بھی اس کے حوالہ کردو"۔ کیا دنیا میں کوئی ایک بھی مسلمان یا عیسائی ایسا ہوگا جو اس قسم کے عجیب و غریب اخلاق کے زیور سے اپنے کو مزین کرنے کی جرأت کر سکتا ہو؟

ایک مقام پر غزالی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول حوالہ و سند کے طور پر لائے ہیں کہ "دنیا و آخرت دونوں کی محبت ایک ہی قلب میں اسی طرح جمع نہیں ہو سکتی جس طرح آگ اور پانی ایک ہی برتن میں جمع نہیں ہو سکتے"۔ ظاہر ہے کہ یہ تخیل قرآن حکیم کی اس آیت کے بالکل منافی ہے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ[1]۔

دوسری جگہ حضرت مسیح کا قول نقل کرتے ہیں۔

"پرندوں کو دیکھو کہ یہ نہ تو کاشت و زراعت کی مصیبت اٹھاتے ہیں نہ کچھ جمع کرتے ہیں لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہر روز انھیں رزق بہم پہنچاتے ہیں اگر تم یہ کہو کہ ہمارے پیٹ پرندوں سے بڑے ہیں تو جانوروں اور چوپایوں پر نظر کرو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کی روزی کا کیسا وافر اور معقول انتظام کر دیا ہے"۔

زندگی کا یہ نظریہ قرآن حکیم کی اس آیت کے سراسر مناقض و منافی ہے وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا[2] ظاہر ہے کہ دنیا سے جو شخص اپنا حصہ و نصیب حاصل کرنا چاہے گا اُسے لامحالہ طلب و سعی، تگ و دو، جد و جہد اور محنت و کاوش کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔

ان ایرادات و اعتراضات سے حاشا و کلا ہمارا مقصود حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت و

---

[1] اے پروردگار ہم کو دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی سے نواز اور آگ کے عذاب سے ہمیں محفوظ رکھ
[2] اپنے دنیا کے حصے کو نہ بھولو!

بعثت سے انکار ہرگز نہیں بلکہ مقصود صرف اتنا واضح کرنا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں نے شریعت عیسوی کے خد و خال ایسے بری طرح مسخ کر دئے ہیں اور ان کے اقوال میں ایسا اضافہ اور تصرف کیا ہے کہ ان مبالغہ آمیز حکایتوں میں اب اصل و حقیقت کا سراغ لگانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور صرف شریعت عیسوی ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کے تمام ادیان و شرائع کا کم و بیش یہی حشر ہوا ہے۔ اسلام پر ذرا نگاہ کیجئے۔ اسلام کے پاس قرآن حکیم، محکم اور زندہ و پائندہ حقیقتوں اور صداقتوں کی صورت میں آج بھی موجود ہے لیکن کیا لوگوں نے اس پر اکتفا کیا؟ کیا یہ سچ نہیں کہ بعض خود غرض اور غفلت شعار طبیعتوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ایسی احادیث و روایات گھڑ لی ہیں کہ اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نصرت و تائید مسلمانوں کے شامل حال نہ ہوتی تو ان احادیث کی وجہ سے اسلام کے چہرے کی ساری خوبی اور دلکشی غارت ہو گئی ہوتی اور مسلمانوں کی ساری قوت و شوکت کا آوا ہی آج بیٹھ گیا ہوتا۔

ہم اس سے ایک لمحہ کے لئے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ مسیحیت کی تعلیم کا سارا لب لباب اور حاصل و ثمر، زہد و انقطاع ہی کی دعوت ہے، اگر زہد و انقطاع کو مسیحیت سے خارج کر دیا جائے تو اس کے قائم کردہ اصول کی ساری عمارت ہی لرز جاتی ہے لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جو زہد اور ترک دنیا کی تبلیغ کی تھی وہ صرف اتنی تھی کہ جس کی وجہ سے انسانوں کے اندر طلب دنیا اور حرص و آز کے جذبات کی جو حدت و تیزی تھی وہ سرد اور ماند پڑ جائے۔ رہی زندگی سے فرار اور حلال و طیب چیزوں سے احتراز کی طرف دعوت سو اس کے داعی انبیاء و رسل کبھی نہیں ہو سکتے۔

کاش غزالی حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب اقوال و آراء کے نقل و اقتباس میں ذرا احتیاط سے کام لیتے اور یہ سب رطب و یابس قسم کی باتیں نہ سمیٹ لاتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ غزالی انتہائی صادق القلب اور مخلص انسان تھے لہذا انکی نوازہرات کی صحت و

صداقت کا یقین آ گیا حالانکہ علما کا شیوہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ یقین کی نسبت شک سے زیادہ کام لیں کیونکہ تنہا شک ہی سے پختہ و راسخ یقین کی طرف راہ نکلتی ہے۔

پانچویں فصل

غزالی کے اساتذہ اور احباب

فلسفہ، تصوف اور شرع کے اُن سرچشموں کی نشاندہی کے بعد کہ جن سے غزالی سیراب ہوئے اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس امر پر بھی مطلع کر دیں کہ غزالی ہر اس گھاٹ پر اترے ہیں جس پر ان کے اساتذہ اور احباب کبھی وارد ہوئے تھے۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ غزالی کے اکثر احباب کی طرح ان کے اساتذہ بھی عموماً صوفی تھے۔ غزالی کے مشہور اساتذہ و احباب یہ ہیں۔

(۱) امام احمد بن محمد راذکانی بڑے فقیہ اور متقی و صالح عالم تھے۔ غزالی نے طوس میں ابتدائی تعلیم انہیں سے حاصل کی۔

(۲) امام ابو نصر اسماعیلی۔ تقویٰ و ورع میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ غزالی نے جرجان میں ان سے تعلیم حاصل کی اور اپنی مشہور تعلیقات انہی کے سامنے مرتب کیں۔

(۳) امام الحرمین۔ اپنے زمانہ و عصر میں صلاح و تقویٰ کے لیے بہت بڑی شہرت رکھتے تھے غزالی نے نیشاپور میں ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ کہتے ہیں یہ غزالی کے علم و فضل کے معترف ہونے کے باوجود ان سے حسد کرتے تھے۔

(۴) ابو علی فارمذی۔ بہت بڑے عابد و زاہد اور ابوالقاسم قشیری کے اجلّہ تلامذہ میں تھے۔ غزالی نے ان سے تصوف پڑھا۔ سبکی نے ان کو اساتذہ کی بجائے غزالی کے احباب میں شمار کیا ہے۔

غزالی کی عقلی زندگی پر ان تمام اساتذہ و احباب نے بہت گہرا اثر کیا اور غزالی کے

ایک خاص نقطۂ نگاہ مرتب کرنے میں ان سب حضرات کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر کوئی صاحب ان کے حالاتِ زندگی کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو طبقات الشافعیہ کی طرف رجوع کریں کیونکہ ہم نے بھی یہ مختصر حالات اسی کتاب سے لئے ہیں۔ رہے غزالی کے تلامذہ سو ان کے ذکر و بیان کے لئے اس کتاب کے کسی اور باب کا انتظار کرنا چاہیئے۔

چوتھا باب

تالیفات

تمہید

ابن سبکی نے طبقات میں غزالی کی تالیفات کی مفصل فہرست دی ہے۔ زبیدی نے شرح احیاء میں جو فہرست درج کی ہے وہ طبقات ہی سے ماخوذ ہے مجلّہ "الہلال" مصر کے پندرھویں سال کے چھٹے جزو میں جرجی زیدان نے غزالی کی تصنیفات پر نہایت جامع اور مبسوط آرٹیکل حوالۂ قلم کیا ہے۔ اس آرٹیکل میں دو بڑی خوبیاں ہیں پہلی یہ کہ اس میں تصنیفات کو بترتیب موضوعات درج کیا گیا ہے۔ دوئم یہ کہ ان تصنیفات کے مخطوطہ یا مطبوعہ نسخوں کے متعلق پوری نشان دہی کر دی ہے کہ کون سا نسخہ کہاں اور کس لائبریری میں ہے۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ جرجی زیدان نے جن اکثر کتب کی نایابی کا گلہ کیا ہے وہ اب آسانی بازار میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

احیاء اور میزان العمل چونکہ اخلاق کے باب میں غزالی کی تالیفات میں احیاء العلوم سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لہذا ہم اس پر الگ اور مستقل ریویو کریں گے۔ دوسری تالیف میزان العمل ہے، ۲۱۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بچہ دقتِ نگاہ اور حسنِ بیان

کے اعتبار سے احیار العلوم پر بھی بھاری ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احیائے کے طویل مباحث کا سارا حاصل وملخص نہایت خوبی و اختصار کے ساتھ اس میں درج کر دیا گیا ہے۔ میزان العمل غزالی نے اپنی دوسری کتاب معیار العلم کے مقابلہ میں لکھی چنانچہ اس کے مقدمہ میں کہتے ہیں :-

"سب لوگوں کا مطلوب و مقصود سعادت و نجات ہے اور چونکہ یہ گرانبہا دولت بجز دولت علم و عمل کے میسر نہیں آسکتی اس لئے ضروری ہوا کہ علم و عمل کے حدود اور حقیقت و مقدار کا ایک عمدہ معیار قائم کر دیا جائے چونکہ علم کے باب میں ہم اس فرض سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں اس لئے اب مفید و غیر مفید عمل کے میزان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں"

اس کتاب میں غزالی نے اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ میں نے یہ کتاب تصوف کے انداز میں لکھی ہے

کتاب الاربعین احیار اور میزان کے بعد اسی کتاب کا مرتبہ ہے۔ صاحب کشف الظنون کی رائے ہے کہ اربعین جواہر القرآن[1] کا ایک حصہ ہے۔ غزالی نے احیار کے بعد یہ کتاب مرتب کی۔ موضوعات اور تبویب کے لحاظ سے یہ احیا سے بہت ملتی جلتی ہے۔

منہاج العابدین منہاج العابدین۔ غزالی کی سب سے آخری تصنیف ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کے مندرجات میں ضعف و اضطراب اور پیری و ناتوانی کے مظاہر جا بجا نمایاں ہیں۔ یہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ عزلت اور خلوت نشینی کی وجہ سے غزالی کی صحت کا نظام بالکل درہم برہم ہو چکا تھا۔ زبیدی نے ابن عربی کے مسامرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہ کتاب غزالی کی نہیں بلکہ ابو الحسن علی بن خلیل سبتی کی تالیف ہے۔ آپ عن قریب دیکھیں گے کہ کتنی جعلی تالیفات ہیں جو غزالی کی طرف یونہی منسوب کر دی گئیں۔

التبر المسبوک التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک۔ یہ کتاب غزالی نے سلطان محمد بن ملک شاہ کی خاطر لکھی، منشیوں کے آداب، سلاطین و امرا کے فرائض اور وزرا کے حقوق کے بارے میں غزالی کے آرا ہم نے اسی کتاب سے اخذ کی ہیں عن قریب غزالی کی طرف اس کتاب کی نسبت کی صحت و عدم صحت کے متعلق ہم اپنی ذاتی رائے پیش کریں گے۔ یہ کتاب ۱۲۴ صفحات

---

[1] غزالی کی ایک اور تصنیف کا نام ہے۔ مترجم

پر مشتمل ہے، اور گو غزالی نے اپنی ہر تصنیف میں بے شمار قصص و واقعات درج کیے ہیں لیکن یہ کتاب خاص طور پر حکایات و اخبار سے مشحون و لبریز ہے اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اس لیے کہ ترہیب و ترغیب کے سلسلے میں یہ طریق کار نہایت مستحسن اور مفید و کارگر ہے۔

المنقذ من الضلال یہ کتاب نہایت اہم ہے اس لیے کہ اس میں جہاں غزالی نے اپنی عقلی زندگی کی ہوبہو اور سچی تصویر کھینچ دی ہے وہاں اسی سے اُس زمانہ و عصر کے علمی چرچے کے متعلق غزالی کا نقطۂ نگاہ بھی بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں غزالی نے وہ کمالِ سادگی و بے تکلفی برتی ہے کہ جس کی وجہ سے ہم اُن کے پاک صاف اور سفید و شفاف دل کے اندر خلوص و محبت کو موجیں مارتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

المستصفیٰ یہ کتاب اصول فقہ میں ہے۔ حسن اور قبیح کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ اسی سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ غزالی کی نگاہ کتنی تیز رس اور اُن کا ذہن و دماغ کتنا دقیقہ سنج اور نکتہ پرور تھا۔

مشکاۃ الانوار جس جمالیاتی بنیادوں پر اس عالم کی عمارت استوار ہے اُن کے سمجھنے میں سب لوگ یکساں اور برابر نہیں ہیں اُن میں باہم ضرور کچھ فرق اور کچھ تفاوت موجود ہے۔ وہ کیا ہے کس نوعیت کا ہے؟ غزالی نے اس رسالہ میں اسی دلچسپ موضوع پر رائے زنی کی ہے۔ نیز اس کتاب میں قرآن حکیم کی آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ کی تفسیر میں بھی کمالِ نکتہ رسی اور دقیقہ پروری کا ثبوت دیا ہے۔

غزالی دنیا کے عظیم ترین مصنفین میں شمار ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ اگر ان کی سب تالیفات کو ان کی پوری زندگی پر تقسیم کیا جائے تو روزانہ اوسط چار کراسے[1] ہوتی ہے ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ان کی

---

[1] ایک کراسہ چار ورقوں کا ہوتا ہے گویا ۱۶ صفحات روزانہ۔ مترجم

تالیفات میں سب سے زیادہ اہم احیاء العلوم ہے اور اسی کتاب کی بدولت ان کو شہرت دوام اور حیات جاوید کی سند نصیب ہوئی۔

پہلی فصل

طریقِ تالیف

غزالی کا طریقِ تالیف نہایت عمدہ اور سلجھا ہوا ہے، وہ جس مذہب پر تبصرہ و تنقید کرنا چاہتے ہیں اول اُس مذہب کے عقائد و آراء بے کم و کاست مفصل بیان کر دیتے ہیں اور اُس کے بعد اُس کے نقد و تبصرہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس طریق کار پر اتنی سختی سے عامل و کاربند ہیں کہ کبھی اس سے انحراف نہیں کرتے مثلاً جب انھوں نے فلاسفہ کے رد میں تہافتہ الفلاسفہ لکھنا چاہی تو پہلے مقاصد الفلاسفہ لکھی چنانچہ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"ہم اس کتاب میں فلاسفہ کے عقائد و آراء بے کم و کاست بلا تمیز غلط و صحیح سب درج کریں گے اور اس کے بعد ایک الگ اور مستقل کتاب میں ان عقائد کی تردید کے لئے کمربستہ ہوں گے جس کا نام تہافتہ الفلاسفہ ہوگا۔"

جب باطنیہ کا رد لکھا تو اُس میں بھی بعینہٖ یہی انداز اور یہی طریق اختیار کیا منقذ من الضلال[1] میں کہتے ہیں:۔

"بعض اہل حق نے میرے اس طریق کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھا وہ کہتے ہیں کہ یہ حقیقت میں باطنیہ کی ایک گونہ تائید و نصرت ہے۔ اس لئے کہ اگر میں ان شبہات کو کرید کرید کر منظر عام پر نہ لاتا تو شاید خود باطنیہ کو بھی اپنے مذہب کی اعانت و تائید میں ایسے امور بیک وقت نہ سوجھتے۔"

---

[1] ص ۲۰، ۲۱۔

پھر جواب دیتے ہیں :۔

"میں نے دیانت و انصاف کا تقاضا یہی محسوس کیا کہ اول ان کے شبہات اور خدشات تا بحد امکان، بسط و تفصیل سے بیان کروں اور اس کے بعد کامل بصیرت کے ساتھ ان پر رد و نقض وارد کروں"

ہماری رائے بھی یہی ہے کہ غزالی کا یہ طریق نہایت مستحسن اور قابل تعریف ہے۔

غزالی کے طریق تالیف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قلوب کی اصلاح کے لئے سب سے زیادہ خطابیات پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہیں مثلاً جب وہ فضائل اخلاق میں سے کسی فضیلت و خوش خلقی کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس باب میں قرآن حکیم کی آیات درج کرتے ہیں اس کے بعد احادیث، اخبار، آثار، قصص اور حکایات کا ایک تانتا لگا دیتے ہیں جس سے پڑھنے والے کا دل پسیجنے لگتا ہے اور اس فضیلت و خوش خلقی کی عمدگی اور جاذبیت دل و دماغ پر نقش ہو جاتی ہے۔ جب رذائل اخلاق میں سے کسی رذیلہ یا بد خلقی کو بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی یہی پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ اس انداز کے ایجاد و اختراع کا سہرا غزالی کے سر نہیں ہے لیکن اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ غزالی نے اس انداز کو اس خوبی اور اس مہارت کے ساتھ ہاتھ میں لیا کہ اس کے مقابلہ میں باقی سب لوگوں کا انداز پھیکا اور ماند پڑ گیا۔ میں نے بعض اہل علم کو دیکھا ہے کہ وہ غزالی کے اس انداز کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے لیکن میری رائے میں یہ ان کی زیادتی ہے۔ اگر آپ مشہور انگریز مصنف سمیلز[1] کی تصنیفات کا مطالعہ کریں تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ عمدہ اور پسندیدہ اخلاق کی جانب لوگوں کو مائل اور راغب کرنے کے لئے قصص و حکایات کی ضرورت و اہمیت کتنی شدید ہے اور سمیلز کے معاصرین نے اس کے اس انداز کو کتنا سراہا اور کتنا اچھالا ہے۔ چونکہ غزالی نے اپنی اخلاقی کتب کسی خاص فرقے یا خاص جماعت کے لئے نہیں لکھیں اس لئے ان سے ہر شخص بلا تمیز عقیدہ و مشرب برابر

---

[1] متوفی ۱۶؍ اپریل ۱۹۰۴ء

استفادہ کر سکتا ہے

غزالی کی تالیفات کا بڑا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ کسی چیز کے حسن یا قبح کو بیان کرنے کیلئے ایسا اچھوتا اور نرالا انداز بیان اختیار کرتے ہیں کہ اس سے پڑھنے والے کا دل موہ لیتے ہیں اور وہ غفلت و سرشاری میں دل کے ساتھ دماغ بھی اُن کے حوالہ کر دیتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنے مربی اور محسن کے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ اُس کا یہ جذبۂ تربیت و احسان خود اُس کے ذاتی ارادے اور اختیار کا ممنون ہے۔ غزالی ایسے شخص کو اُس چیونٹی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جو کاغذ کے سفید صفحے پر سیاہ حروف دیکھ کر یہ سمجھتی ہے کہ یہ سارے نقوش قلم ہی کے رہین منت ہیں۔ اس چیونٹی کی نگاہ اس قدر قاصر اور کوتاہ واقع ہوئی ہے کہ وہ اس قلم کے علاوہ انگلی، ہاتھ، ہاتھ کی قوت محرکہ، ارادہ، ارادے کا سرچشمہ اور سب سے آخر اس قوت علم اور ارادہ کے مالک وغیرہ کے سلسلۂ دراز کی بے شمار کڑیوں میں سے کسی ایک کڑی کو بھی نہیں پا سکتی تنگ نظر اور فرومایہ شخص کو اُس گدھے کے ساتھ جو اصطبل میں بندھا ہوا ہے یا اُس مرغ کے ساتھ جو ڈربے میں بند ہے۔ تشبیہ دیتے ہیں جیسے یہ گدھا اور مرغ اپنے مالک کے رحم و کرم پر جیتے ہیں اور اُن کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی بعینہٖ اسی طرح ایک تنگ نظر اور فرومایہ شخص ہمیشہ غیر کے سہارے جیتا ہے وہ کسی بلند خیالی یا وسعتِ پرواز کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

جو شخص احیاء العلوم، الاربعین اور منہاج کا مطالعہ کرے گا اُسے ترغیب و ترہیب کے سلسلے میں قدم قدم پر حسن بیان کی نیرنگی، دل کشی اور دلآویزی کے مرغزار نظر آئیں گے۔ غزالی اپنی جادو بیانی، سحر انگیزی اور حسن تخیل کی وجہ سے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ایسی بُری طرح چھا جاتے ہیں کہ اس بے چارے کو خود اپنے وجود ہی میں شبہ اور شک ہونے لگتا ہے اور ناچار پھر نئے سرے سے اپنے وجود کا جائزہ لینے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ چونکہ غزالی کا یہ خاص پیرایۂ بیان صوفیہ کے وساوس و معرفات سے ماخوذ ہے جس پر طرح طرح کی ملمع کاری کی گئی ہے۔ اس لئے کوئی غافل اور ناآشنا شخص کسی قت

بھی ان چیزوں کو پڑھ کر گمراہی اور کجروی کا شکار ہو سکتا ہے۔ ان کانٹوں سے صرف وہی شخص اپنا دامن بچا سکتا ہے جو تخیل کے نشیب و فراز اور ناہمواریوں سے پوری طرح آشنا اور باخبر ہو۔

دوسری فصل

غزالی کی تالیفات میں یکسانی، یکرنگی اور تکرار

متقدمین کی نقل و محاکات کے علاوہ غزالی کی تالیفات میں افکار کی یکرنگی، مثالوں کی یکسانی اور عبارتوں کا تکرار اس درجہ موجود ہے کہ ایک شخص احیاء العلوم، اربعین، میزان منہاج، التبر المسبوک، الادب فی الدین، بدایۃ الہدایہ اور ان کی دوسری فقہ کی کتابیں پڑھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ غزالی کی دکانِ تالیف میں صرف ایک ہی قسم کی جنس و متاع ہے جس کو وہ مختلف نام اور رنگ دے کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اخلاص کے باب میں ان کی سب تصنیفات کا مطالعہ کیجیے ان میں باہم کوئی جوہری اور ٹھوس فرق نہیں اگر کوئی خفیف سا فرق ہے بھی تو ایجاز و اختصار یا اطناب و تطویل کا، باقی ہر جہت اور ہر پہلو سے بالکل متفق اور ہم رنگ ہیں۔

چونکہ غزالی صوفیہ کے مشرب کے دلدادہ اور شیدا تھے اس لیے ان کی ہر تصنیف میں تصوف کا رنگ کہیں زیادہ اور کہیں کم بہرحال موجود ہے۔ مثلاً منہاج میں یہ رنگ احیاء کی نسبت زیادہ اور شوخ ہے۔ احیاء میں انھوں نے بہت سارے ایسے امور سے اجتناب اور احتراز کیا ہے جن کے بیان میں منہاج میں کوئی تامل اور باک محسوس نہیں کیا۔

ہماری رائے ہے کہ غزالی کا کوئی ایسا خاص نصب العین یا مطمح نظر نہیں تھا جس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہوں۔ کبھی وہ شریعت کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اور جن امور کو شرع

نے حلال یا حرام یا مباح وغیر مباح قرار دیا ہے اُس کے مبلغ بن جاتے ہیں کبھی صوفیہ کے ہم آہنگ ہو کر وجود کے اسرار و رموز کی گتھیاں سلجھاتے نظر آتے ہیں مگر ہر جگہ یہ ساتھ ساتھ تصریح کرتے جاتے ہیں کہ مراقبہ و مکاشفہ کا علم کتابوں کی چیز نہیں ہے لہذا صرف خاص خاص قسم کے لوگوں ہی کو اس پر مطلع کیا جا سکتا ہے۔

گذشتہ تمام امور کا خلاصہ و ماحصل یہ ہے کہ جدت و اختراع کا ملکہ غزالی میں بالکل مفقود ہے اُن کی امتیازی خصوصیت صرف یہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے دوسروں کے ہاتھ کا بنا ہوا ناقوس اس زور سے پھونکا کہ لوگ چونک اُٹھے اِدھر اُدھر دیکھا تو بجز غزالی کے کوئی نظر نہ آیا دوڑ کر گئے اور ان کے گرد جمع ہو گئے۔ دیکھا کہ احیاء العلوم ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ یہ سادہ دل لوگ سمجھے کہ یہی نسخۂ شفا اور یہی نسخۂ کیمیا ہے اس لئے ہمیشہ کے لئے اسی پر قناعت کر کے بیٹھ گئے۔

تیسری فصل

احیاء العلوم

غزالی کے علم الاخلاق میں جو کتب تصنیف کیں اُن سب میں احیاء العلوم کا مقام بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ آخری ایام عمر میں جبکہ وہ دنیوی علائق سے دامن جھاڑ کر گوشہ نشین ہو گئے تھے اس وقت انھوں نے احیاء تصنیف کی اور پھر بغداد اور دمشق میں اس پر کئی مرتبہ نظر ثانی کی اور کئی ناموں سے اُس کے چھوٹے بڑے خلاصے لکھے۔

احیاء العلوم کے چار حصے ہیں ایک حصہ عبادات کے متعلق ہے اس میں علم اور بنیادی عقائد کے بیان کے علاوہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے اسرار، قرآن حکیم کی تلاوت کے آداب ادعیہ اور اذکار، مختلف اوقات میں مختلف اوراد و وظائف کی ترتیب شرح و بسط سے مذکور ہے۔

دوسرا حصہ عادات کے متعلق ہے اس میں مندرجہ ذیل امور کا بیان ہے۔

کھانے پینے اور شادی و نکاح کے آداب کمانے کے احکام، حلال و حرام کی تفصیل، انسانوں کے مختلف طبقوں سے مل جل کر رہنے کے آداب، گوشہ نشینی، سفر کے آداب، سماع اور وجد، امر بالمعروف نہی عن المنکر، آداب معیشت، اخلاق نبوت

تیسرا حصہ مہلکات کے بیان میں ہے اس میں مندرجہ ذیل مسائل کا ذکر ہے۔

عجائب قلب کی تشریح، ریاضت نفس، پیٹ، شرمگاہ، زبان، غصہ، کینہ اور حسد کے نقصانات دنیا، دولت، بخل، جاہ و منصب، ریا، اور نمائش، تکبر، غرور، اور فخر وغیرہ کی مذمت۔

چوتھا حصہ منجیات کا ہے، اس میں توبہ و انابت، صبر و شکر، خوف و رجا، فقر و زہد، توحید توکل، محبت، شوق، انس اور رضا، نیت، صدق اور اخلاص، مراقبہ و محاسبہ، تفکر اور موت کی یاد کا بیان ہے۔

مذکورہ بالا فہرست مضامین پر ایک نگاہ کرنے سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ غزالی نے احیاء کی تالیف میں کس قدر بلیغ اہتمام کیا ہے۔ ہم نے اس طویل فہرست کو اس لئے ذکر کیا ہے کہ اخلاق کے بارے میں غزالی کی ساری آراء ہم نے اسی کتاب پر بھروسہ اور اعتماد کیا ہے اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مفید اور جامع کتاب کے متعلق خود غزالی کی رائے نقل کریں۔ احیاء العلوم کے چاروں حصص کا ایک اجمالی خاکہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

مجھ سے پہلے بھی بعض لوگوں نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں لیکن میری یہ کتاب ان سب میں مندرجہ ذیل پانچ خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہے۔

(۱) قدیم تصنیفات میں جو اجمال تھا اس کی تفصیل

(۲) پراگندہ اور منتشر مضامین کی شیرازہ بندی اور ترتیب

(۳) طویل مضامین کا اختصار اور صرف مسلمات کے بیان پر اکتفاء

(۴) مکرر مضامین کا حذف اور متقدمین کی حتمی رائے کا اثبات۔

(ہ) بہت سے دقیق اور غامض مسائل کا حل جن کا قدیم تصنیفات میں ذکر و مذکور ہی نہ تھا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اس لئے کہ گو سب نے ایک ہی راہ اختیار کی لیکن عین ممکن ہے کہ ہر راہرو کو اس راہ میں بعض ایسے خاص امور سے سابقہ پڑا ہو جن سے اُس کے دوسرے ہم سفر ناواقف اور بے خبر رہے ہوں۔

چوتھی فصل

احیار العلوم پر اعتراضات

اب ہم ان اعتراضات کو بیان کرتے ہیں جو متقدمین نے احیار العلوم پر وارد کئے ہیں اس سے ایک تو آپ کو اس امر کا اندازہ ہو جائے گا کہ متقدمین کی نگاہ میں احیار کی کیا قدر و منزلت تھی، دوم اخلاق کے بارے میں غزالی کے نظریات پر ہم جو نقد و جرح کرنا چاہتے ہیں اُس کی ایک گونہ تمہید ہو جائے گی۔

پہلا اعتراض سبکی نے طبقات الشافعیہ میں نقل کیا ہے کہ ابو عبداللہ المازری سے جب احیار کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ بعض اوقات بالکل بے بنیاد اور بے سر و پا قسم کی باتوں کو غزالی مستحسن قرار دیتے ہیں مثلاً ناخن کاٹنے کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ اس کا آغاز انگشتِ شہادت سے ہونا چاہئے کیونکہ یہ تسبیح خوانی کی وجہ سے دوسری انگلیوں پر فضیلت و مزیت رکھتی ہے۔

دوسرا اعتراض زبیدی نے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے احیار میں غزالی کے اس قول پر اعتراض کیا ہے کہ "موجودہ عالم سے بہتر پیدا کرنا ممکن نہیں ہے" علمار کی رائے ہے کہ اس سے باری تعالیٰ کا عجز لازم آتا ہے اور یہ کفرِ صریح ہے۔ ہماری رائے ہے کہ چونکہ ان علما کی نگاہ صرف دینی علوم تک ہی محدود تھی اس لئے وہ اس بات کے مفہوم کو نہ سمجھ سکے

اگر علم و فن پران کی نگاہ فائر ہوتی تو سمجھ جاتے کہ غزالی کا یہ قول بھی جدت و اختراع کی جانب ایک ترقی پسندانہ اقدام ہے

تیسرا اعتراض شعرانی کی اجوبہ مرضیہ سے زبیدی نے نقل کیا ہے کہ غزالی کے اس قول پر بھی اعتراض کیا گیا ہے :-

"صوفیہ کے لئے غلبۂ حال کے وقت کپڑے پھاڑنا درست اور روا ہے کیونکہ ان کے ٹکڑوں سے دوسرے کپڑوں اور جائے نمازوں وغیرہ میں پیوند لگایا جا سکتا ہے اور اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کسی کپڑے کو پیوند لگانے کے لئے دوسرے کپڑے کو پھاڑنا پڑتا ہے"

آخر میں خود زبیدی نے اس اعتراض کا نہایت مضحکہ خیز جواب دیا ہے وہ کہتے ہیں :-

فرض کیجئے کہ ایک درویش بے نوا کو دنیا کے سارے خزانے میسر آجائیں اور وہ یہ سمجھے کہ اس ساری دولت کو تلف اور ضائع کئے بغیر اللہ کی خوشنودی اور تقرب کو حاصل نہیں کیا جا سکتا، اور وہ اپنے اس اجتہاد سے کام لے کر ساری دولت کو آگ لگا دے یا سمندر میں ڈبو دے تو جس طرح وہ ہرگز لائق ملامت نہیں اسی طرح جو شخص غلبۂ حال میں گریبان پھاڑ دے وہ بھی کسی زجر و توبیخ کا مستوجب نہیں ہے، لائق ملامت صرف وہی ہے جو حماقت یا اسراف کی وجہ سے کپڑے پھاڑ ڈالے یا دولت کو تلف کر دے"

زبیدی کو یہ بات نہ سوجھی کہ معترض کا مقصد تنہا یہی نہیں ہے کہ کپڑے پھاڑنے سے اسراف ہوتا ہے بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ ایسی حرکات علماء و صلحاء کے وقار اور جلالتِ شان کے خلاف ہیں کیونکہ شرع کا مقصد لباس سے زینت و آرائش کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مومن باوقار اور پُر تمکنت نظر آئے ۔

چوتھا اعتراض چوتھا اعتراض یہ ہے کہ غزالی احیاء میں کہتے ہیں :-

"ریاضت سے مقصود تصفیۂ قلب ہے اور یہ بجز کسی تنہا اور تاریک گوشے میں بیٹھنے کے حاصل نہیں ہو سکتا فرض کرو کہ اگر گوشہ تاریک نہیں ہے تو عابد کو چاہئے کہ اپنا

سر جھکا لے یا کوئی چادر اپنے سر پر ڈال لے کیونکہ وہ اسی صورت میں حق کی آواز کو سن سکتا
اور جلالِ ربوبیت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔"

غزالی کے ناقدین اس سے بے خبر نہیں ہیں کہ کم کھانے سے بعض اوقات انسان پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، کیا بعید ہے کہ گوشہ تنہائی میں بیٹھا ہوا عابد جس آواز کو حق کی آواز اور جس دنیا کو جلال ربوبیت کی دنیا سمجھتا ہے وہ حقیقت میں اسی کے وساوس اور اور فاسد خیالات ہی کی صدائے بازگشت ہو۔

پانچواں اعتراض حضرت جنیدؒ کے اس قول کی تائید پر لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ "جب شہوت حلال کی سزا اولاد کی صورت میں ملتی ہے تو بتائیے شہوت حرام کی سزا کتنی بڑی ہوگی۔"

چھٹا اعتراض بعض لوگوں کے اس قول کی تائید پر اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ "ایک شخص نے صرف اپنی توکل کا امتحان لینے کے لئے ایسے جنگل میں رات بسر کی جہاں درندے بہت تھے۔"

معترضین کی رائے ہے کہ جس شخص نے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت اور موت کے منہ میں ڈالنا چاہا غزالی کا فرض تھا کہ وہ ایسے شخص کی تعریف کی بجائے اس کی مذمت کرتے۔

ساتواں اعتراض غزالی کہتے ہیں کہ "ایک عابد کو جب ابتدائے کار میں راتوں کو عبادتِ الٰہی کے لئے بیدار رہنے میں کچھ گرانی اور کسل معلوم ہوا تو اس نے ایک طویل عرصے تک یہ التزام کیا کہ رات بھر سر کے بل کھڑا رہتا تاکہ اس کا نفس خوشی اور ارادہ و اختیار سے جاگنے کے لئے آمادہ و تیار ہو جائے۔ ایک اور زاہد نے جب مال و دولت کی محبت کا جرثومہ دل سے نوچ پھینکنا چاہا تو اپنا سارا مال و اسباب اور گھر کا اثاثہ کوڑیوں کے دام بیچ ڈالا اور اس خوف سے کہ اگر یہ رقم لوگوں میں تقسیم کردوں تو ریا کا شکار نہ ہو جاؤں یا لوگ جود و سخا

کے لئے میری تعریف نہ کرنے لگیں ساری رقم سمندر میں ڈال دی بعض زہاد علم و مردباری کے جذبہ کو فروغ دینے کے لئے کسی شخص کو ملازم رکھ لیا کرتے جو بھری محفل میں آکر انھیں گالی دیتا۔ ایک زاہد شجاعت کا ملکہ پیدا کرنے کے لئے سردی کے موسم میں متلاطم سمندر میں سفر کرتا۔ ایک زاہد کو جب عبادت میں نیند ستاتی تو اونچی دیوار پر کھڑا ہو جاتا تاکہ گرنے کے خوف سے نیند رفو چکر ہو جائے۔"

ابن قیمؒ کہتے ہیں :-

"مجھے ابو حامد (غزالی) کے باب میں سخت تعجب ہوتا ہے یہ کیسی کیسی عجیب و غریب اور خلاف شرع و اخلاق باتیں کرتے ہیں بھلا یہ کہاں کی شریعت ہے کہ کوئی شخص رات بھر سر کے بل کھڑا رہے، یا ساری دولت سمندر میں پھینک دے یا کسی اونچی دیوار پر اپنے آپ کو ٹانگ دے کہ اگر خدانخواستہ اونگھ آجائے تو گر کر اپنی گردن توڑ لے اور سیدھا موت کے منہ میں جائے، یہ کہاں کا اخلاق اور کہاں کی شرافت ہے کہ کسی کو بلا وجہ اور بلا سبب گالیاں دی جائیں یا کسی کو محض دشنام طرازی اور سب و شتم کے لئے ملازم رکھا جائے۔"

آٹھواں اعتراض

حضرت جنید کے شیخ ابن کریتی کی اس حکایت پر بھی اعتراض کیا گیا ہے ابن کریتی کہتے ہیں :-

"میں ایک مقام میں زہد و صلاح اور تقویٰ و ورع کے لئے مشہور ہو گیا، جس کی وجہ سے میرا دل پراگندہ اور مغموم رہنے لگا، میں نے اس کا علاج یہ کیا کہ حمام میں جا کر عمدہ عمدہ کپڑے چرا لئے اور انھیں پہن کر ان پر اپنی گلیم ڈالی اور حمام سے نکل کر آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا جب حمام والوں کو اس کی خبر ہوئی تو میرے تعاقب میں آئے اور مجھے پکڑ کر خوب زدوکوب کیا اور اپنے کپڑے اتر والئے اور لوگوں میں "حمام کا چور" میرا نام مشہور کر دیا۔ آخر یہ تدبیر کارگر ہوئی اور مجھے میری کھوئی ہوئی دلجمعی اور اطمینان و سکون خاطر کی دولت واپس ملی۔"

غزالی کہتے ہیں کہ

"اللہ کے صالح بندے ریا ر ا و رسمعت سے بچنے کے لئے ایسے ایسے طریقوں سے اپنے نفس کو سدھایا کرتے تھے۔ یاد رکھو کہ بعض صاحب دل اور صاحب نظر لوگ اپنے نفس کی اصلاح کے لیے ایسی ایسی تدبیریں کرتے ہیں جن کو ظاہر شرع کے مفتی و فقیہ ایک لمحہ اور ایک پل کیلئے بھی روا نہیں رکھتے، لیکن یہ اہل اللہ جانتے ہیں کہ اس خلاف شرع حرکت میں بھی کیا نکتہ ملحوظ ہے اور آخر وہ اپنے خلاف شرع عمل کی تلافی بھی کر لیتے ہیں جیسا کہ حمام کے اس واقعہ سے آشکارا ہے۔"

ابن قیم کہتے ہیں:۔

"سبحان اللہ! احیاء العلوم کی تصنیف نے ابو حامد (غزالی) کو فقہ سے کتنا دور جا پھینکا کاش وہ اس کتاب میں ایسی حکایات ہی درج نہ کرتے جن کے بارے میں کوئی ذی عقل اور دانشمند خاموش نہیں رہ سکتا۔"

اس کے بعد ابن قیم نے حضرت امام احمدؒ اور حضرت امام شافعیؒ کا متفقہ فتویٰ نقل کیا ہے اگر کوئی شخص حمام سے ایسے کپڑے چرائے جن کی حفاظت کا اہتمام موجود تھا تو ایسے چور کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔ پھر کہتے ہیں کہ حمام کے اس چور سے زیادہ تعجب اُس شخص پر ہے جس کے علم اور عقل دونوں کو تصوف نے چرا لیا۔ کاش ابو حامد فقہ کے قواعد کو پیش نظر رکھتے اور اس قسم کی بے سر و پا باتوں کے نقل و بیان سے باز رہتے۔

نواں اعتراض ابو الحسن دینوری کے اس قول کی تائید پر بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ:۔
"ابو الحسن نے ننگے پاؤں اور ننگے سر بارہ حج کئے۔"

ابن قیم کہتے ہیں:۔

"یہ بہت بڑی جہالت کی بات ہے۔ کیونکہ زمین کے بعض خطے ناہموار ہیں بعض سنگلاخ ہیں بعض خارزار ہیں۔ ان میں ننگے پاؤں چل کر اپنے آپ کو عذاب میں ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ صوفیہ نے شریعت محمدیہ کو پس پشت ڈال کر خود اپنی طرف سے

تصوف کی ایک نئی شریعت گھڑلی ہے جس کی حقیقت شیطان کے ایک دلکش اور رنگین فریب سے زیادہ نہیں۔ عوام چونکہ صوفیہ کی اس قسم کی حکایتوں کو درست اور صحیح سمجھتے ہیں اس لئے ان کے عقائد کے بگڑتے کوئی دیر نہیں لگتی اور وہ کسی وقت بھی گمراہی کا شکار ہوسکتے ہیں۔"

دسواں اعتراض ابو الخیر اقطع تیناتی کے اس واقعہ کی تائید پر بھی اعتراض کیا گیا ہے۔ تیناتی کہتے ہیں۔

"میں نے اللہ کے ساتھ عہد کیا کہ جس چیز کو میرا جی چاہے گا اُسے کبھی نہیں کھاؤں گا ایک روز بھول کر میں نے درخت سے ایک پھل توڑا اور ابھی کھا ہی رہا تھا کہ وہ عہد یاد آگیا جو منہ میں تھا میں نے فوراً پھینک دیا۔ اسی اثنا میں کیا دیکھتا ہوں کہ چند سواروں نے مجھے احاطے میں لے لیا اور کہا چلو اور مجھے پکڑ کر بحر اسکندریہ کے ساحل پر لے گئے۔ وہاں ایک حاکم بیٹھا تھا اور اس کے گرد حشم و خدم اور فوج موجود تھی۔ مجھ سے پوچھا تم بھی چور ہو اور پھر حبشی چوروں کے ایک گروہ کی طرف مخاطب ہو کر اُن سے دریافت کیا کہ کیا یہ بھی تمہارا ساتھی ہے۔ سب نے کہا نہیں ہم تو اس کی صورت سے بھی واقف نہیں لیکن حاکم کو ان کی بات کا اعتبار نہ آیا اور اُس نے ایک ایک کو آگے بلایا اور ہاتھ کاٹتا چلا گیا جب میری نوبت آئی تو کہا آگے آؤ اور ہاتھ بڑھاؤ چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور فوراً میرا ہاتھ کاٹ دیا۔"

علماء کہتے ہیں دیکھو جہالت کتنی بُری بلا ہے اگر تیناتی کو علم کی ہوا بھی لگی ہوتی تو اُن کی سمجھ میں آجاتا کہ ایسے وقت میں سکوت و اغماض قطعاً حرام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیطان کے پاس عُبّاد اور زُہّاد کو پھنسانے کے لئے جہالت سے زیادہ کارگر کوئی دام اور جال نہیں۔ میری رائے ہے کہ ان صوفیہ کی طرح کی حرکات صرف وہی شخص کرسکتا ہے۔ جو دیوانگی اور جنون کا شکار ہو۔

گیارھواں اعتراض غزالی کہتے ہیں:-

"علم ظاہر کی تحصیل واشتغال محض بیکار و فضول ہے۔"

ابن قیم کہتے ہیں :۔

یہ غزالی کی حد سے بڑھی ہوئی جہالت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ علم ظاہر کی اس شدت سے مذمت اس لئے کرتے ہیں کہ اس راہ سے اول تو انھیں بڑا وقار کسی صورت حاصل ہونے کی کوئی توقع ہی نہیں ہوتی اور فرض کیجئے ہو بھی تو اتنی جان جوکھوں میں ڈالنے کے بعد کہ اس کا تصور بھی صوفیہ نہیں کر سکتے، لیکن اس کے برعکس تصوف کی بدعات، خرقہ پوشی، راتوں کی زندہ داری دنوں کی روزہ داری، آستینوں اور جبّوں کی کثرت و زینت وغیرہ سے وہ آسانی کو گرامی سیادت و عزت کا مرتبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

بارھواں اعتراض ابو تراب نخشبی کے اس قول کے نقل کرنے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ نخشبی نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ اگر تم ابو یزید کو ایک دفعہ دیکھ لیتے تو خدا کے ستر دفعہ دیکھ لینے سے بہتر ہوتا۔"

ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ "یہ بات جنون سے بھی گئی گذری ہے۔"

تیرھواں اعتراض غزالی کہتے ہیں کہ شبلی نے یہ کہہ کر ساری دولت دجلہ میں غرق کر دی کہ اے دولت جس نے تجھے اپنے دل میں کوئی مقام بخشا اس نے اللہ کے ہاں اپنا مقام کھو دیا۔

ابن قیمؒ کہتے ہیں :۔

"میں ایسے جاہلوں کی عقل سوز حرکات سے زیادہ ابو حامد غزالی پر متعجب ہوں وہ ایسے جاہلوں کی باتیں مدح و تعریف کے انداز میں کیونکر بیان کرتے ہیں، اُن کا فرض تھا کہ ایسے لوگوں پر شدت سے نکیر کرتے۔ جب غزالی کی فقاہت کا یہ حال ہے تو کوئی ان سے علم و نقل کی باتوں کی توقع کیا رکھے؛ سب فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بلا وجہ کر دولت کو دریا برد کر دینا ناجائز ہے حرام ہے۔"

چودھواں اعتراض

ابوسلیمان دارانی کے قول کی تائید پر اعتراض کیا گیا ہے دارانی کہتے ہیں
"جب کسی شخص نے علم حدیث کی تحصیل شروع کی یا طلب معاش میں سفر
اختیار کیا یا شادی کرلی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی طرف مائل ہوگیا

معترضین کہتے ہیں یہ تینوں باتیں قواعدِ شرع کے خلاف ہیں۔ حدیث کی تحصیل وطلب سے پہلوتہی کیوں کر جائز ہوسکتی ہے؟ جب کہ کہا گیا ہے کہ "طالب علم پر فرشتے اپنے بازوؤں سے سایہ کرتے ہیں" طلب معاش کے لئے سفر اختیار کرنا کیسے ممنوع ہوسکتا ہے؟ حالاں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ "اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے جان دینے کی نسبت میں اسے ترجیح دیتا ہوں کہ رزقِ حلال کی طلب وجستجو میں سعی و کوشش کرتا ہوا مروں" شادی کرنے میں کیا دینی قباحت ہوسکتی ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی موجود ہے تناکحوا وتناسلوا فانی مُباہٍ بکم الامم یوم القیامۃ[1]

پندرھواں اعتراض

ابوحمزہ بغدادی کے قول کی تائید پر اعتراض کیا گیا ہے۔ ابوحمزہ کہتے ہیں:۔

"چونکہ میں توکل پر کامل یقین اور اعتماد رکھتا ہوں اس لئے مجھے حیا آتی ہے کہ کھانے سے پیٹ بھر کر جنگل کا سفر شروع کروں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری شکم پُری زادِراہ تیار کرنے کی مترادف سمجھی جائے"

معترضین کہتے ہیں کہ ابوحمزہ بغدادی کے اس قول کی غزالی نے جو توجیہ وتاویل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے۔ غزالی کہتے ہیں:۔

اور ابوحمزہ کا قول درست ہے لیکن بغیر زادِراہ ساتھ لئے سفر کرنے کے لئے دو شرطیں ہیں اول یہ کہ ایسے شخص کو لگ بھگ ایک ہفتے تک بھوک برداشت کرنے کی مشق اور قوت ہو، دوم کھانا نہ ملنے کی صورت میں گھاس پھونس کھا کر بھی زندہ رہ سکتا ہو اس لئے کہ

---

[1] نکاح کرو اور نسل انسانی کو بڑھاؤ میں قیامت کے روز تمہاری کثرت پر دوسری امتوں کے مقابلہ میں فخر کروں گا۔

ایک ہفتہ تک ضرور وہ کسی نہ کسی ایسے شخص تک پہنچ سکتا ہے جس کے پاس کھانا موجود ہو اور وہ اُسے کھلا دے یا یہی بادیہ نورد ایک ہفتے کی مدت میں اس بے آب و گیاہ جنگل سے نکل کر وہاں پہنچ سکتا ہے جہاں کچھ گھاس پھونس موجود ہو اور وہ اُسے کھا کر اپنے آپ کو موت کے پنجے سے بچا سکے"۔

ابن قیم کہتے ہیں :-

"ایک عالم سے اس قسم کی دوراز کار باتیں سن کر اور حیرت ہوتی ہے۔ بھلا یہ کیا ضروری ہے کہ ایک ہفتے میں ضرور اُسے ایسا شخص مل جائے جس کے پاس کھانا موجود ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بادیہ نورد صحیح راستے سے بھٹک جائے۔ ہو سکتا ہے کہ بیمار پڑ جائے اور گھاس پھونس کا تناول بجائے اُسے فائدہ پہنچانے کے اُلٹا نقصان پہنچائے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مل جائے جس کے پاس کھانا موجود ہو لیکن اُسے کھلانے سے انکار کر دے اور یہ بے چارہ سسک سسک کر وہاں ایسی حالت میں مرے کہ گور و کفن بھی نصیب نہ ہو"۔

سولھواں اعتراض غزالی سے کسی نے دریافت کیا کہ کچھ توشہ ساتھ لئے بغیر جنگل کا سفر جائز ہے یا نہیں غزالی نے جواب دیا، اللہ کے بندوں کا تو شیوہ ہی یہی ہے۔ سائل نے پوچھا اگر بھوک کی شدت سے اُس کی موت واقع ہو جائے تو؟ غزالی نے کہا کوئی مضائقہ نہیں"۔ معترضین کہتے ہیں شریعت کے مسائل سے جاہل و ناواقف ہی اس قسم کا فتویٰ دے سکتا ہے کیونکہ تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ بغیر زادِ راہ ساتھ لئے جنگل اور بیابان کا سفر ناجائز ہے۔ اگر کسی نے قصداً ایسا کیا اور بھوک سے مر گیا تو وہ مجرم و گنہگار ہوگا اور قیامت کے روز اس فروگذاشت پر اس سے باز پرس ہوگی۔

سترھواں اعتراض شقیق بلخی کی اس حکایت کے نقل کرنے پر اعتراض کیا گیا ہے، غزالی کہتے ہیں کہ شقیق بلخی نے جب ایک شخص کو دیکھا کہ روزہ افطار کرنے کے لئے روٹی ساتھ لئے ہوئے ہے تو یہ کہہ کر اُس سے قطع تعلق کر لیا کہ

"اللہ اکبر! تم صبح کی روٹی شام تک محفوظ رکھتے ہو؟"

اٹھارھواں اعتراض غزالی کے اس قول پر اعتراض کیا گیا ہے:
"دیکھو اہل تصوف کا رجحان علوم کی بجائے علوم لدنیہ کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کو علم ظاہر کی تحصیل کی تلقین نہیں کرتے ان کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص ہر لمحہ اللہ کے ذکر میں برابر معروف و مشغول رہے۔"

انیسواں اعتراض حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا "وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ" کی تفسیر کے تحت غزالی کہتے ہیں:
"اصنام سے مراد سونا اور چاندی ہے اور ان کی عبادت سے مراد ان کی محبت اور ان کا لگاؤ ہے۔"
ظاہر ہے کہ یہ تفسیر معنیٔ مراد کے بالکل خلاف ہے۔

بیسواں اعتراض سہل تستری کے اس قول کی تائید ہونے پر بھی اعتراض کیا گیا ہے تستری کہتے ہیں۔
"ربوبیت کا ایک ایسا بھید ہے کہ اگر وہ ظاہر ہو جائے تو نبوت بیکار ہو جائے۔ نبوت کا ایک ایسا بھید ہے کہ اگر وہ ظاہر ہو جائے تو علم و حکمت دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ علماء آخرت کا ایک ایسا راز ہے کہ اگر وہ منکشف ہو جائے تو شرائع اور احکام بالکل باطل ہو جائیں۔"

میں احیاء پر اعتراضات کی اسی مختصر فہرست پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ اسی سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے بارے میں علماء کی آراء کیا ہیں۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ غزالی کی مخالفت کا یہ طوفان ان کی زندگی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ان کی موت کے بعد بھی طویل عرصے تک قائم رہا۔ مجھے زبیدی کے باب میں سخت تعجب ہے کہ انھوں نے غزالی کے خلاف ہر ہر اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ کسی کی طرفداری کا یہ طریق کچھ مستحسن نہیں ہے۔ عرفِ عام یا شرع کی معقول اور ٹھوس بنیادوں پر کسی اعتراض کا رد کرنا تو ایک بات

لہ اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچائیو!

بھی ہو، مگر محض ڈھکوسلوں اور تصوف کی کمزور بے بنیاد دیواروں کا سہارا کتنی دیر تک مفید ہوسکتا ہے؟ جو صاحب ہماری اس رائے کی تصدیق چاہیں وہ زبیدی کی شرح[۱] احیاء العلوم کی طرف رجوع کریں۔

ناخن کاٹنے کی ترتیب کے سلسلے میں زبیدی نے غزالی کی طرف سے جو جواب دیا ہے وہ بے ہودگی میں اپنی مثال آپ ہے: کہتے ہیں کہ :-

غزالی نے یہ ترتیب اپنی طرف سے نہیں گھڑلی بلکہ بعینہٖ یہی ترتیب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول و مروی ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ یہ نقل پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی لیکن چونکہ اس ترتیب کے اختیار کرنے میں شرع کے اصول میں سے کسی اصل کی مخالفت نہیں ہوتی اس لئے کوئی حرج بھی نہیں۔ میں نے بعض صلحاء سے سنا ہے کہ ہم نے اس ترتیب پر عمل کیا اور نہایت نافع اور مفید پایا۔ جو شخص اس ترتیب پر مداومت کرے گا وہ آنکھ کے درد سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشعار یہ ہیں :-

"ناخن کاٹتے وقت داہنے ہاتھ کی چھنگلی سے شروع کرو اور انگشتِ شہادت پر ختم کردو پاؤں کے ناخن کاٹتے وقت بھی بعینہٖ یہی ترتیب ملحوظ رکھو۔ بائیں ہاتھ میں پہلے انگوٹھا پھر بیچ کی انگلی پھر چھنگلیا پھر انگشت شہادت اور آخر میں چھنگلی کے ساتھ کی انگلی پر ختم کرو، یہ ترتیب تمھیں آشوبِ چشم سے ہمیشہ محفوظ رکھے گی"

اس جواب کی بے ہودگی اور سخافت دن کی روشنی سے زیادہ واضح ہے بھلا ناخنوں کے کاٹنے اور آنکھ کے کسی مرض سے محفوظ رہنے میں کیا علاقہ ہے؟ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف ان اشعار کی نسبت بالکل غلط اور لغو ہے۔ آپ کی فصاحت و بلاغت مسلم الثبوت اور چار دانگ عالم میں شہرہ رکھتی ہے، ایسے بودے اور ناقص اشعار آپ کی زبان پر کیسے جاری ہوسکتے ہیں؟

---

[۱] شرح احیاء، از صفحہ ۲۷۳ تا ۴۸۳۔

واقعہ یہ ہے کہ قدیم زمانے کے فتنہ پرموضوعات میں سے غزالی کی ذات بھی ایک بہت بڑا موضوع ہے۔ ان کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے علماء اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ دنیا میں تنہا عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا حکم اور فیصلہ حق وناطق ہوسکتا ہے۔ اور قدامت پسندوں اور جمود پرستوں کے علی الرغم اللہ کی زمین عقل و دانش رکھنے والوں سے کبھی خالی نہیں ہوسکتی۔

پانچویں فصل

غزالی کی غفلت اور ضد وعناد

(۱)

غزالی کی غفلت و بے احتیاطی کی بیّن دلیل یہ ہے کہ انھوں نے تقریباً چھ سو ضعیف و موضوع احادیث کو اپنی کتابوں میں بلاتامل درج کر دیا۔

مجھے یقین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قصداً ایسی جھوٹی اور موضوع احادیث کو منسوب کرنے سے غزالی کا دامن بالکل پاک ہے کیونکہ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اس امر کا تصور نہیں کر سکتے کہ غزالی نے دیدہ و دانستہ ان احادیث کو اپنی تصنیفات میں درج کیا ہے بلکہ اس کے خلاف واقعہ وحقیقت یہ ہے کہ غزالی انتہائی سادہ دل اور غافل و غیر محتاط انسان تھے۔ ورنہ آپ ہی بتایئے انھیں اس قول کے حدیث ہونے کا یقین کیسے آگیا "اِنَّ الحسناتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئاتِ کما یُذْهِبُ الماءُ الوسخ"[1] بلاغت کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے ایسے الفاظ کبھی صادر نہیں ہوسکتے۔ یا انھوں نے اس فرضی واقعہ کو کس طرح صحیح اور سچا باور کر لیا کہ ایک دن حضرت جبریل

---

[1] نیک کام بُرے کاموں کو ایسے ہی دور کر دیتے ہیں جیسے پانی میں کچیل کو صاف اور دور کر دیتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر آپ چاہیں تو میں ان پہاڑوں کو سونے کا بنا دوں اور جدھر کو آپ تشریف لے جائیں یہ پہاڑ آپ کے ساتھ ساتھ چلیں۔

احیاء العلوم کی تمام موضوع وغیر مستند احادیث کی نقد وجرح یقیناً بہت طوالت و اطناب کا موجب ہوگی اس لئے ہم اُس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ طبقات الشافعیہ جلد چہارم میں کامل اٹھتیس صفحات اِن احادیث کے لئے وقف ہیں جن پر نگاہ کرنے سے اول وہلہ ہی میں انسان اس فیصلہ پر پہنچتا ہے کہ یہ سب ضعیف وموضوع اور درجۂ صحت وثقاہت سے بکلی زائل وساقط ہیں۔

(۲)

غزالی کی ضد وعناد کی بڑی دلیل یہ ہے کہ باوجودیکہ بے شمار لوگوں نے انھیں اغلاط پر واقف ومطلع کیا لیکن وہ اپنی ضد اور ہٹ پر بدستور قائم ومصر رہے اور ناقدین کو غبی، حاسد، جھوٹے اور معلوم نہیں کن کن خطابات سے نوازا، حالانکہ اُن کے شایانِ شان یہ تھا کہ مخالفین کے اعتراضات پر نہایت سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور اپنی تصنیفات میں جو انھوں نے رطب ویابس کی ایک بھرمار کی ہے اُس کا نئے سرے سے جائزہ لیتے لیکن افسوس ہے کہ غزالی نے کسی کی نہ سُنی اور اُس چٹان کی طرح جو کسی پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکنی شروع ہوئی ہو برابر آگے بڑھتے چلے گئے اور ناقدین کو کج رو، کج فکر اور فاسق وفاجر کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب غزالی کے معاصرین نے نہایت شد ومد سے اُن پر ایرادات واعتراضات کی بوچھاڑ شروع کردی تو غزالی کے تلامذہ کو یہ حرکت نہایت ناگوار گزری اور ایک شاگرد نے انھیں لکھا کہ آپ ان تمام عائد کردہ الزامات کا مبسوط اور تفصیلی رد لکھیں۔ چنانچہ غزالی اس پر راضی ہوگئے اور انھوں نے املاء فی اشکالات الاحیاء

کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ہم یہاں اس کتاب کا خلاصہ اور اختصار درج نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ خود لوگوں کے سامنے موجود ہے۔ ہم صرف اس کے مقدمے کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس کو پڑھ کر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ غزالی معاصرین کے اس احتجاج اور مخالفت سے کتنے دلگیر و مغموم اور شکستہ خاطر ہوئے۔ اس سے جہاں آپ کو غزالی کے اخلاق کا ایک پہلو سمجھنے میں مدد ملے گی وہاں کم سے کم یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اُن میں خود اعتمادی کس بلا اور کس شدت کی تھی اور احیاء العلوم کی صحت و واقعیت پر انھیں کس درجہ کمالِ ایمان و یقین تھا کہ ہر کے ناقدین کے آراء و نظریات کو ایک لمحہ اور ایک پل کے لیے بھی خاطر میں نہیں لائے۔ غزالی اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں :-

"اللہ تمہیں علم اور قرب و ولایت کے اعلیٰ و ارفع مقامات سے نوازے تم نے احیاء العلوم کے بعض اُن اشکالات کا ذکر کیا ہے جو کج فہم و کوتاہ فہم اور جاہل و کودن لوگوں سے حل نہیں ہو سکتے۔ ساتھ ہی تم نے اُس اضطراب اور غم و اندوہ کا بھی اظہار کیا ہے جو تمہیں ان ناہنجاروں کے ہاتھوں سہنا پڑا ہے۔ یاد رکھو یہی لوگ ہیں جو اسلام کی پیشانی پر بدنما داغ اور مذہب و ملت کے لیے باعثِ ننگ و عار ہیں۔ ان خام مغزوں نے احیاء کے سمجھنے میں بہتیرا سر مارا لیکن پھر بھی جب کچھ پلے نہ پڑا تو کبھی تو اس میں رخنے نکالنے اور اس کی مخالفت کرنے میں ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کر دیا کبھی اس کے مصنف کو ضلالت و گمراہی کے ساتھ متہم و بدنام کیا لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا اور سارا معاملہ اللہ پر چھوڑتا ہوں۔ قیامت کے کھلے میدان میں میرا اور ان کا فیصلہ ہوگا۔ جو کچھ یہ کیے جا رہے ہیں کیئے جانے دو ان کی ہر ہر حرکت اور ہر ہر عمل برابر لکھا جا رہا ہے اور آخر انھیں اس کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا فستکتب شہادتھم ویسئلون یہ ستم شعار اور جفا پیشہ لوگ عن قریب جان لیں گے کہ ان کا ٹھکانا اور منزل کہاں ہے وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ان کے لئے بہتر یہی تھا

کہ اپنی طرف سے کوئی رائے قائم نہ کرتے اور اللہ کے رسول اور اہلِ علم کی طرف رجوع کرتے
تاکہ وہ اپنے علم و اجتہاد کی وجہ سے سب باتوں سے ان کو باخبر کر دیتے وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ
وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ لیکن ان کور ذوقوں کے ایسے نصیب کہاں
یہ تو حق و صداقت کی راہ سے کوسوں اور منزلوں دور ہیں اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ
ان کی اس ساری غوغا آرائی کا موجب دراصل یہ ہے کہ ان کا علم نہایت ادھورا اور
ان کا فہم نہایت ناقص ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ۔ جب اپنے قصورِ فہم
کی وجہ سے کسی بات کے سمجھنے سے عاجز و قاصر رہے تو لگے کہنے کہ یہ تو ساری باتیں ہی سراسر
جھوٹی اور بے سر و پا ہیں اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لئے کہ اخیار اور اہلِ بصیرت
لوگ رخصت ہو گئے۔ حق جوئی اور نکتہ رسی کا دور آخر ہوا۔ انسانوں کی اکثریت پر جھوٹ
اور فسق و فجور کا جادو چل گیا۔ ان کی ساری کائنات چند خرافات اور موضوع و غیر مستند
حکایات ہیں جن پر انھوں نے طرح طرح کی تلبیس اور ملمع کاری کر رکھی ہے، ان کا علم نہایت
بے بنیاد اور ناپائدار اور ان کے دلائل تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور اور بودے ہیں ان کی
ساری جد و جہد، دنیا طلبی اور اپنے لئے مدح و تعریف کی دریوزہ گری تک محدود ہے، ان کے
باہم دوستانے گناہوں کی بنیاد پر قائم ہیں۔ ان سب نے پوری طرح ایکا اور اتحاد کر لیا
ہے کہ حق و صداقت کو جہاں کہیں بھی پائیں گے اس کے خلاف نبرد آزما ہوں گے۔ مکر و خدیعت
سے جہاں دوچار ہوں گے اسے سر اور آنکھوں پر بٹھائیں گے اگر کوئی انھیں اس باب
میں نصیحت کرے تو اس کے گلے پڑ جاتے ہیں۔ اگر کوئی خاموش رہے تو اور زیادہ متمرد
اور سرکش ہو جاتے ہیں حقیقت میں ان لوگوں کی آنکھوں پر جہالت و غفلت کی پٹیاں
بندھی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے باب میں بھی اپنی جانوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں، ان کو
فوز و فلاح کی دولت کبھی نصیب نہ ہوگی۔ یہ اور ان کے متبعین اللہ کی نگاہِ کرم سے ہمیشہ

لہ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ

محروم رہیں گے۔ ان پر آفتاب ہدایت کی کرن کبھی نہیں چمکے گی۔ یہ علم و معرفت سے ہمیشہ عاری اور کورے رہیں گے۔ ان پر ایک گھڑی اور ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی اللہ کی خشیت طاری نہیں ہوگی۔ نقبار، نجبار، بدلار اور اوتاد کی کشف و کرامات کی انھیں ہوا بھی نہیں لگ سکتی

اے کاش یہ اپنے اندر غور کرتے تا کہ باطن کے دروازے ان پر وا ہو جاتے "۔ الخ

گذشتہ بالا اقتباس میں بادنیٰ تامل ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ناقدین کی شدت تنقید اور شدت مخالفت کے باوجود غزالی نے صوفیہ کا دامن ہاتھ سے نہ دیا اور جس جہت اور جس پہلو سے اُن پر حملہ کیا گیا انھوں نے تصوف ہی کی سپر لے کر اس کا مقابلہ کیا۔ آخر ان کے کلام میں نجبار، بدلار، نقبار اور اوتاد وغیرہ کے جو القاب ہیں ان سے مراد کون لوگ ہیں؟ یقیناً ان سے مراد وہ صوفیہ ہیں جو غیر مباح کو مباح اور ناجائز کو جائز قرار دیتے ہیں۔

غزالی کی تصنیفات میں جن نحوی اغلاط پر گرفت کی گئی اُن کا جواب غزالی نے نہایت دلچسپ دیا ہے۔ کہتے ہیں " مجھے نحو پر زیادہ عبور نہیں ہے " پھر اپنے تلامذہ کو تلقین کرتے ہیں کہ " اگر میری تصنیفات میں کہیں نحوی اغلاط پاؤ تو تمھیں حق و اختیار ہے کہ ان کو درست کر دو "۔ کاش وہ اس تصحیح و اصلاح کو نحوی اغلاط تک ہی محدود نہ رکھتے اور انھیں اس امر کا عام اور کلی اختیار دیتے کہ وہ جس نوع اور جس قسم کی غلطی بھی اُن کے کلام میں پائیں اسے صحیح اور درست کر دیں۔

غزالی کی طرف جعلی تالیفات کی نسبت

اس امر پر واقفیت و اطلاع ضروری ہے کہ غزالی بھی جعل سازوں کے ہاتھوں نہ بچ سکے اور ان خام کاروں نے کئی کتابیں غزالی کے نام سے لوگوں میں رائج اور مشہور کر دیں مثلاً

السر المکتوم فی اسرار النجوم السر المکتوم فی اسرار النجوم کے متعلق زبیدی کی یہی رائے ہے وہ کہتے ہیں کہ یہی کتاب امام رازی کی طرف بھی منسوب ہے لطف یہ ہے کہ جب رازی سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے سختی سے انکار اور تردید کی

تحسین الظنون النفخ والتسویہ مضنون بہ علی غیر اہلہ

تحسین الظنون، النفخ والتسویہ اور مضنون بہ علی غیر اہلہ کا بھی یہی حال ہے۔ آخری کتاب کے متعلق ابن صلاح کہتے ہیں کہ یہ کتاب غزالی کی تالیف کبھی نہیں ہوسکتی۔ اور اس کے وضعی اور جعلی ہونے کے کئی دلائل بیان کیے ہیں۔ زبیدی کہتے ہیں کہ ابن صلاح کی رائے بالکل صحیح اور صائب ہے، کیونکہ اس کتاب میں قدمِ عالم اور انکارِ علمِ جزئیات کا عقیدہ واعتراف موجود ہے حالانکہ غزالی اور دوسرے تمام اہل سنت اس قسم کے نظریات رکھنے والے کی تکفیر پر متفق و متحد ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ کتاب غزالی کی تالیف ہو۔

ڈاکٹر عنانی نے جامعہ مصریہ کے لیکچروں میں ذکر کیا ہے کہ غزالی کی تالیف مضنون بہ علی غیر اہلہ یقیناً اس کتاب سے مختلف ہے جو اس نام سے آج کل لوگوں میں رائج اور مشہور ہے کیونکہ اس کتابچہ میں کہیں ایسے مسائل کا ذکر نہیں جن پر غزالی عوام کا مطلع ہونا پسند نہ کرتے ہوں۔ ڈاکٹر موصوف کی رائے ہے کہ مضنون بہ علی غیر اہلہ یقیناً کوئی ضخیم کتاب تھی جس کے فلسفیانہ مندرجات کے متعلق غزالی کی رائے تھی کہ ان سے عوام گوش آشنا نہ ہونے پائیں۔

میرے خیال میں ڈاکٹر عنانی کی رائے دو وجہ سے درست ہے اول یہ کہ غزالی ہمیشہ تلقین کیا کرتے تھے کہ عوام سے صرف سیدھی سادی باتوں پر اکتفاء کرنا چاہیے اس لئے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ ممکن ہے غزالی کے بعض ایسے فلسفیانہ نظریات ہوں جن کو انھوں نے احیاء وغیرہ میں بیان نہ کیا ہو مضنون بہ علی غیر اہلہ میں بیان کر دیا ہو۔ دوم یہ کہ زبیدی خبر دیتے ہیں کہ مضنون بہ علی غیر اہلہ میں قدمِ عالم اور انکارِ علمِ جزئیات کی تصریح موجود ہے لیکن موجودہ متداول نسخہ میں ان مسائل کا کہیں ذکر تک نہیں۔

جرجی زیدان نے تاریخ آداب عربیہ میں اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ التبر المسبوک بھی جعلی ہے۔ جرجی زیدان کی اس رائے کی تحقیق و تصدیق کے لئے جب میں نے کتابوں کی طرف رجوع کیا تو کسی خاطر خواہ نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ بعض دلائل اس رائے کے حق میں جاتے ہیں اور بعض اس کے

خلاف، اس رائے کے حق میں بڑی دلیل یہ ہے کہ جس شخص نے اس کتاب کا فارسی سے ترجمہ کیا ہے اُس کا نام ساقط کر دیا گیا ہے اور اکثر موضوعات میں وہ شگفتگی مفقود ہے جو غزالی کی کتابوں کا لاینفک خاصہ ہے۔ اس رائے کے خلاف دلیل یہ ہے کہ التبر المسبوک کے مندرجات اکثر و بیشتر احیاء العلوم وغیرہ کے مندرجات سے نہایت مشابہ اور ملتے جلتے ہیں، ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ جاعل نے کمال عیاری سے کام لے کر ہر ہر قدم پر غزالی کا اتباع اور پیروی اس لئے کی ہو کہ تاکہ اس کتاب کے مجعول ہونے کا کسی کو وہم وگمان تک بھی نہ ہو۔ بہرکیف اتنی بات بلاشبہ درست ہے کہ غزالی کے نام پر ایک سے زائد کتابیں وضع کی گئیں گو ہم یقین اور وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا کیا اور کون کون سی ہیں؟

اس باب کے آخر میں ہم اس امر پر بھی مطلع کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ایک ہی باب میں غزالی کے مختلف نظریات کے جہاں اور کئی اسباب ہو سکتے ہیں وہاں بڑا سبب ان کے سن وسال کا تغیر واختلاف اور صحت کی ہمواری وناہمواری بھی ہے۔ غزالی نے مختلف زمانوں میں کتابیں لکھیں کبھی ان پر عقل اور شرع کا غلبہ تھا اور کبھی وہ صوفیہ کے اوہام و وساوس کا شکار تھے۔ اور اگر سچ پوچھیئے تو وہ اس باب میں ایک گونہ معذور بھی ہیں کیوں کہ اُنھوں نے اُس زمانے میں کتابیں تصنیف وتالیف کیں جو زمانہ کسی طرح بھی لکھنے پڑھنے کے لیئے مساعد وسازگار نہ تھا۔ اس لیئے کہ مؤلف کے لیئے بھی بعینہٖ وہی شرط ہے جو ایک قاضی کے لیئے ہے یعنی صحت کی عمدگی وہمواری اور اطمینان وسکونِ خاطر۔

پانچواں باب

اخلاق سے چند قریبی تعلق رکھنے والے مسائل

اس باب میں سب سے پہلے ہم یہ بیان کریں گے کہ عمل کی فی حد ذاتہ قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا وہ خیر ہے یا شر؟ مستحسن ہے یا غیر مستحسن؟ مفید ہے یا مضر؟ اور اس کے بعد ارادہ، ضمیر، اغراض و نتائج اور وسائل و مقاصد کو زیر بحث لائیں گے اس سلسلے میں طریق کار ہم نے یہ قرار دیا ہے کہ بحوث فیہ مسئلے میں پہلے فلاسفہ کے نظریات باختصار کے ساتھ بیان کر دیے جائیں تاکہ ان کے مقابل جب غزالی کا نظریہ بیان کیا جائے تو اس تقابل سے مسئلہ بآسانی ذہن نشین ہو سکے۔

پہلی فصل

خیر و شر

خیر و شر: جس کام کا کرنا ضروری ہو یا جس کا کرنا زیبا و لائق ستائش ہو وہ خیر اور جس کام سے مجتنب رہنا ضروری ہو یا جس کا ارتکاب نا زیبا اور ناشائستہ ہو وہ شر ہے

گویا خیر و شر دونوں کے کئی درجے اور کئی مرتبے ہیں۔

واجب مستحب حرام ۔ مکروہ اور مباح

اس مسئلہ کو واضح کرنے کا یہ جدید انداز و اسلوب ہے غزالی کا انداز اس باب میں ہم سے بہت مختلف ہے کبھی تو وہ ایسے کام کو جس کا کرنا لابدی اور ضروری ہو اسے واجب، جس کا کرنا مستحسن ہو اسے مستحب، جس سے اجتناب ضروری ہو اسے حرام، جس کا کرنا نازیبا و ناشائستہ ہو اسے مکروہ اور اُن کے علاوہ باقی تمام اعمال کو مباح کہتے ہیں اور کبھی افعال کی تین قسمیں کرتے ہیں۔ حرام، واجب اور مباح۔ حرام وہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اُسے چھوڑ دو اور اس کے قریب بھی کبھی نہ پھٹکو۔ واجب وہ ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ اسے کرو اور کبھی نہ چھوڑو مباح وہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے کرو تو تمہاری مرضی نہ کرو تو تمہاری مرضی۔

حسن اور قبیح

مستصفیٰ میں غزالی نے عمل کی جن تین قسموں (حسن قبیح اور مباح) کو ذکر کیا ہے ان کا مجمل بیان یہ ہے۔

حسن اور قبیح کا اطلاق تین طریقوں پر ہوتا ہے۔

(۱) فاعل کے اعتبار سے افعال کی تین قسمیں ہیں حسن، قبیح اور عبث۔ جو کام فاعل کی غرض اور منشا کے مطابق ہو وہ حسن اور جو مخالف ہو وہ قبیح اور جس میں فاعل کی غرض کی موافقت و مخالفت دونوں میں سے کسی کا بھی دخل نہ ہو وہ عبث کہلاتا ہے۔

(۲) جس فعل کی وجہ سے شرع نے فاعل کی تعریف کی ہو وہ حسن ہے۔ عام اس سے کہ یہ فعل فی نفسہٖ مستحب ہے یا واجب لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس اعتبار سے مباح بھی حسن نہیں ہوسکتا۔

(۳) جس فعل کا فاعل مجاز ہو وہ حسن ہے تو اس معنی میں دوسرے مامورات کے ساتھ مباح بھی حسن کے تحت داخل ہو جائے گا۔

حسن اور قبیح کے گزشتہ تینوں اطلاقات کا مآل اس معنی میں ایک ہے کہ کوئی عمل فی حد نفسہ اچھا یا برا نہیں ہے۔ بلکہ اچھا وہ ہے جسے شرع نے اچھا کہا ہو، برا وہ ہے جسے شرع نے برا کہا ہو۔ یہیں سے غزالی کا یقین اس امر پر اور پختہ ہو جاتا ہے کہ کسی عمل کے حسن اور قبح پر اطلاع پانے کے لئے اس عمل کے جوہر ذات میں غور و فکر کرنے کی بجائے شرع کی پیشانی کی طرف نگاہ اٹھانی چاہئے۔ حقیقت میں غزالی کی یہ رائے معتزلہ کے نظریہ پر ایک ضرب کاری کا حکم رکھتی ہے۔ کیونکہ معتزلہ کہتے ہیں۔

بعض اعمال ایسے ہیں جن کے حسن کو ہم شرع کا سہارا لئے بغیر بھی محض عقل کے توسط سے معلوم کر سکتے ہیں مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ ڈوبتے ہوئے کو بچانا یا کسی اور مصیبت میں گرفتار کو نجات دلانا اچھا عمل ہے سچ بولنا فی نفسہ اچھا اور مستحسن ہے۔ بعض اعمال ایسے ہیں جن کی برائی کو ہم مذہب کی شمع ہاتھ میں لئے بغیر بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ مثلاً احسان فراموشی، بے گناہ کو ضرر پہنچانا، بے وجہ جھوٹ کے ساتھ زبان کو آلودہ کرنا وغیرہ

اس باب میں معتزلہ کی سب سے بڑی وزنی دلیل یہ ہے کہ اگر سچ اور جھوٹ دونوں ایک ہی بھیس میں کسی صحیح الدماغ اور صحیح العقل آدمی کے سامنے آئیں تو وہ بلا تامل سچ کو جھوٹ سے متمیز کر کے سچ ہی کی طرف دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھائے گا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا اس کی تنہا وجہ یہی نہیں کہ سچ کے ذاتی خد و خال میں وہ رونق، وہ دل کشی، اور وہ دلفریبی موجود ہے جس سے جھوٹ کا چہرہ محروم ہے۔

ایک قوی و توانا شخص چاہے وہ ملحد ہی کیوں نہ ہو جب کسی کمزور اور ناتواں کو مصیبت کے پنجے میں گرفتار دیکھتا ہے تو فوراً اس کی امداد و اعانت کے لئے دوڑ پڑتا ہے ظاہر ہے کہ وہ کسی مذہب یا شرع کا قائل نہیں کہ اس کے موعودہ اجر و ثواب کے لالچ نے اس کے قدموں کو حرکت دی ہو، اس میں اس کی کوئی ذاتی غرض اور منفعت بھی نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ تو اپنی جان کو خود عذاب میں ڈال رہا ہے بلکہ اہلِ دانش و بینش کا

فیصلہ ہے کہ اگر کسی شخص کے گلے پر چھری رکھ کر بھی اُسے افشائے راز یا عہد شکنی پر مجبور کیا جائے تو اسے صبر اور موت کا تلخ گھونٹ گوارا کر لینا چاہیے لیکن راز کے بتانے یا عہد کے توڑنے پر کسی قیمت راضی نہ ہونا چاہیے۔

غزالی جواب دیتے ہیں کہ مبینہ خوبیاں یقیناً لوگوں میں بہت شہرت رکھتی ہیں اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مذہب کی تحریص یا ذاتی غرض و منفعت کا مطلقاً دخل نہیں لیکن ان کا دقیق تجزیہ کرنے پر یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ ان کے پیچھے بھی کہیں نہ کہیں مذہب یا کسی ذاتی غرض کے تصور کا ہاتھ برابر کام کرتا ہے۔

غلط اندیشی کے وجوہ و اسباب

بعض حالتوں میں انسانی اغراض اس قدر دقیق اور باریک ہوتے ہیں کہ اُن کو صرف ایک باریک بین اور دقیقہ رس نگاہ ہی پا سکتی ہے۔ اس لئے غزالی نے غلط اندیشی کے اسباب کو بھی بیان کر دیا ہے کہ وہ تین ہیں۔

(۱) انسان کے مقصد کے خلاف جو چیز ہو اُسے وہ قبیح اور بُرا سمجھتا ہے چاہے دوسرے شخص کے مقصد کے عین مطابق ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ تمام انسانوں کے اغراض باہم متفرق اور مختلف ہیں اور خود غرضی و خود پسندی ہر شخص کی مٹی اور خمیر میں داخل ہے جب کسی چیز کو دیکھا کہ وہ طبع کے خلاف ہے فوراً فتویٰ صادر کر دیا کہ "یہ چیز مطلقاً بری ہے۔ برائی اور قباحت اس چیز سے کبھی منفک نہیں ہو سکتی" تو گویا اس شخص نے بیک وقت تین فیصلے صادر کئے۔

(۱) یہ چیز قبیح ہے

(۲) یہ چیز مطلقاً قبیح ہے

(۳) قباحت اس چیز کے اصل اور جوہر ذات میں داخل ہے۔

اس کا پہلا فیصلہ درست اور باقی دونوں فیصلے غلط ہیں غلطی یہ ہوئی کہ اُس نے قباحت کو اس چیز کی ذات کی طرف منسوب کر دیا اور اس بات کا خیال نہ رکھا کہ قباحت اس کی ذات

میں نہیں بلکہ اس شخص کی اپنی ذاتی غرض کی مخالفت کی وجہ سے ہے۔ دوم اس نے اس چیز کی مطلق قباحت کا فیصلہ کر لیا، حالانکہ عین ممکن ہے کہ کسی دوسرے شخص کی غرض کی مطابقت کی وجہ سے یہ چیز دائرۂ قباحت سے خارج ہو جائے۔ بلکہ دوسرے شخص کا ذکر ہی جانے دیجئے خود اس شخص کے بعض احوال ایسے ہو سکتے ہیں جن میں وہ چیز جو آج اس کی غرض کے خلاف ہونے کی وجہ سے قبیح ہے کل یہی چیز اس کی دوسری غرض کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے مستحسن اور اچھی ہو جائے۔

(۲) زندگی کی بعض استثنائی حالتوں کو چھوڑ کر ایک شخص کسی چیز کو ہمیشہ اپنی غرض اور اپنی رائے کے خلاف پاتا ہے۔ وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ چیز ہمیشہ بری ہوتی ہے، رہی بعض استثنائی حالتیں سو اُن کا وقفہ اور عرصہ اس قدر قلیل اور بے ثبات ہوتا ہے کہ زیادہ عرصہ تک ذہن اُن کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اس فیصلہ میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتا۔

(۳) ایک شخص نے زندگی میں کسی چیز سے گزند اور نقصان اٹھایا ہے۔ اب اُس چیز کا رنگ، صورت اور شکل اس کے حافظہ و ذہن میں محفوظ ہو گئی۔ اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جہاں کہیں یہ رنگ اور صورت پائے جائیں گے اُن سے بعینہٖ یہی گزند اٹھانا پڑے گا۔ مثلاً ایک شخص کو کبھی سانپ نے کاٹ لیا ہو اب وہ اس سانپ کی ہم رنگ رسّی سے بھی بدک جاتا ہے اس لئے کہ وہم سے زیادہ کسی چیز کو نفس پر تسلّط اور قابو نہیں۔ آخر یہ واہمہ کی کارپردازی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک شخص جانتا ہے کہ مردہ حرکت نہیں کر سکتا، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص رات کو تنہا مردے کے پاس نہیں رہ سکتا کیونکہ اُس کا واہمہ رہ رہ کر اُسے ڈراتا ہے کہ شاید مردہ ابھی چلنے پھرنے لگے یا ابھی بولنے لگے۔

معتزلہ کی دلیل کا ردّ و ابطال

غلط اندیشی کے یہ مختلف اسباب بیان کرنے کے بعد غزالی نے معتزلہ کی دلیل کا رد کیا ہے۔ غزالی کی رائے ہے کہ ایک ملحد اور بے دین اگر کسی شخص کو مصیبت اور تکلیف سے نجات

دلاتا ہے تو اُس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں اول یہ کہ اس کا دل اُس مظلوم پر پسیجنے لگتا ہے اور
یہ رقت ایک ایسا خاصہ ہے جو بہت کم انسان سے جدا ہوتا ہے۔ انسان جب کسی کو دکھ
اور درد میں مبتلا دیکھتا ہے تو فوراً اس کی جگہ اپنے آپ کو فرض کر لیتا ہے، پھر وہ محسوس
کرتا ہے کہ لوگ مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے میں لیت ولعل اور پہلوتہی سے کام
لے رہے ہیں۔ اس لئے اس کے دل میں ایسے لوگوں کے خلاف ایک نفرت وحقارت
کا جذبہ موج زن ہو جاتا ہے۔ اب جس وقت وہ یہ حالت کسی اور مظلوم کی دیکھتا ہے تو فوراً
اس کی اعانت و دستگیری کے لئے دوڑنے لگتا ہے ہاں اگر ایسا واقعہ کسی جانور یا سنگدل شخص
کو پیش آئے تو انھیں اس بات کا تصور ہی نہیں ہوتا، دوم اس زندیق کے سامنے مذہب کے
موعودہ اجر و ثواب کا لالچ نہ سہی لیکن لوگوں کی تعریف و ستائش کا لالچ موجود ہے اگر
کہیں ایسے مقام میں کسی کی امداد کر رہا ہے کہ جہاں کوئی تعریف کرنے والا موجود نہیں ہے
تو بھی ممکن ہے کہ اُس کے ذہن میں یہ بات موجود ہو کہ کبھی نہ کبھی کسی کو میرے اس کارنامہ کی
خبر ہو جائے گی اور وہ اس کی تعریف کرے گا۔ فرض کیجیے کہ اس کارنامے کی کبھی بھی کسی کو
خبر نہیں ہو سکتی تو بھی اُس کی مثال ایسی ہے جیسے سانپ کا کاٹا رسی سے اس لئے ڈرتا ہے
کہ اُس نے اسی کے رنگ کی چیز سے گزند اُٹھایا ہے۔ بعینہ یہاں بھی یہی قصہ ہے اُس ملحد نے
دیکھا کہ جب کوئی شخص ایسا کارنامہ انجام دیتا ہے تو اُس کی تعریف کی جاتی ہے تو اب یہاں
گو کوئی تعریف کرنے والا موجود نہیں لیکن اُس نے یہی سمجھا کہ یہ واقعہ بھی اُسی نوع اور اُسی قبیل
کا ہے جس کی ہمیشہ تعریف کی جاتی ہے کیونکہ مشہور ہے کہ محبوب سے ملتی جلتی اور نسبت رکھنے
والی چیز محبوب اور مبغوض سے نسبت و تعلق رکھنے والی چیز مبغوض ہوتی ہے۔ جس مقام پر
عاشق اپنے معشوق کے وصل کے مزے لوٹتا ہے، لاکھ کچھ ہو جائے لیکن وہ اُس مقام کو کبھی نہیں
بھول سکتا جب کبھی اُس مقام پر گذر ہو گا آنسوؤں کا ایک دریا بہا دے گا۔ اسی لئے شاعر نے
کہا ہے:۔

جب لیلیٰ کے وطن سے گزر ہوتا ہے تو کبھی اس دیوار کو کبھی اس دیوار کو چومتا پھرتا ہوں اس لئے نہیں کہ مجھے ان در و دیوار سے کچھ عشق ہے بلکہ اس لئے کہ میں ان پر مرتا ہوں جو ان در و دیوار کے پیچھے رہتے ہیں"

ابن رومی کہتا ہے :۔

لوگوں کو وطن اس لئے عزیز ہوتا ہے کہ ان کے شباب کی کچھ یادیں اس سے وابستہ ہوتی ہیں جب وہ وطن کا تصور کرتے ہیں تو ان کی نگاہوں کے سامنے بچپن کی تصویر کھنچ جاتی ہے اور وہ وطن کی یاد میں تڑپنے لگتے ہیں"

اخفائے راز اور ایفائے عہد کی تلقین دانشمند اس لئے کرتے ہیں کہ اس میں بے شمار مصلحتیں پنہاں ہیں۔ جو شخص آخر دم تک کوئی خفیہ راز نہیں بتاتا یا عہد نہیں توڑتا اور ان کی راہ میں ہر طرح کی مصیبت اور تکلیف برداشت کر لیتا ہے تو اس کی وجہ بھی مدح پسندی اور مدح طلبی کا جذبہ ہے۔ اگر اس کو ایسے مقام میں فرض کیا جائے جہاں اس کا یہ کارنامہ سراہنے والا کوئی موجود نہیں تو بھی یہی کہا جائے گا کہ اس نے اس کارنامہ کو اس نوع اور اس قبیل کا سمجھا ہے جس کی ہمیشہ تعریف کی جاتی ہے۔

گزشتہ بحث پر مناقشہ

اہلِ سنت کی تائید اور معتزلہ کی تردید میں آپ غزالی کی رائے کا خلاصہ پڑھ چکے ہیں۔ اہلِ سنت کی رائے کے مطابق نتیجہ یہی نکلا کہ کوئی چیز شرع کے فیصلہ سے قبل اچھی ہے نہ بُری، باعثِ ثواب ہے نہ باعثِ عقاب لیکن یہ رائے بدو وجہ غلط اور باطل ہے۔

(اول) یہ رائے شریعت کے جوہر حقیقت و ماہیت کے منافی ہے۔ کیونکہ شریعت کی ضرورت انسان کو اس لئے لاحق ہوئی تاکہ وہ اس سے ہدایت و رہنمائی کا کام لے سکے اور ہدایت و رہنمائی کا اس کے بغیر کوئی معنی نہیں کہ وہ ہر چیز کے ذاتی حسن اور قبح پر مطلع کر دے تاکہ انسان اچھے اعمال انجام دے سکے اور بُرے اعمال سے مجتنب رہے اگر تمام اعمال فی حد نفسہٖ حسن

اور قبیح سے عاری اور خالی تھے تو پھر انسان کو شرع کا احتیاج ہی کیا تھا اور خواہ مخواہ اس کے سر پر شرع کا بوجھ لاد کیوں دیا گیا؟

(دوم) اس رائے سے انسانیت کے مقام کی بڑی اہانت و تذلیل ہوتی ہے جب شرع کے بغیر عقل نکمی اور بے کار تھی تو اس کا معنی یہ ہوا کہ انسان مذہب کے سہارے کے بغیر خود بخود حقائق اشیا کے سمجھنے سے قاصر و عاجز ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس بے بسی اور بے مائگی کے باوجود انسان کے کاندھوں کو مذہب کی امانت کے بوجھ سے تھکایا کیوں گیا؟

واقعہ یہ ہے کہ اشاعرہ حسن اور قبح کی تشخیص کو شرع کی جانب منسوب کر کے عقل کی مٹی خوب پلید کرتے ہیں۔ اشاعرہ کی رائے میں زنا اس لئے برا نہیں کہ عقل نے اس کا تقاضا کیا بلکہ اس لئے برا ہے کہ شرع نے اسے برا کہا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر شرع اس کو برا نہ کہتی تو یقیناً زنا میں کوئی قباحت نہ ہوتی اور اشاعرہ اس کے حسن و خوبی پر بڑے بڑے وزنی دلائل قائم کرتے۔ آپ جانتے ہیں کہ مذہب کو ان بے ہودہ عقائد کی وجہ سے کتنا بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ لوگوں نے اصل مذہب سے غفلت اور بے گانگی برتی اور انہیں غلط خرافات کو مذہب کی روح رواں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس کی طرف تحریف کا ہاتھ نہ بڑھا ہو اگر آپ خلوص اور نیک نیتی سے چاہیں کہ عقل کا چراغ ہاتھ میں لے کر شرع کے کھرے اور کھوٹے احکام میں تمیز کریں تو جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگ مذہب اور دین کی حمایت کا نعرہ لگا کر آپ کے گلے پڑ جائیں گے اور آپ کے خلاف ایک قیامت برپا کریں گے اور کہیں گے ہمیں عقل و دانش سے کیا سروکار ہم نے تو اپنے بڑوں کو ایسے ہی کہتے سنا ہے۔ ایسے ہی کرتے دیکھا ہے اس لئے ہم ان کا نقش قدم کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

مضر اور مفید

جیسا کہ دوسرے علمائے اخلاق، شر اور مضر میں فرق کرتے ہیں غزالی کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔ حالانکہ واقع میں ان دونوں میں فرق ہے کیونکہ ممکن ہے بعض اوقات میں

ایسا کام کریں جو مضر تو ہو لیکن شر نہ ہو کیونکہ اُس میں بری نیت نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود حق وصواب کی راہ مجتہد پر مخفی رہی لیکن نہیں، غزالی اسی پر مصر ہیں کہ جو عمل مضر ہے وہ یقیناً ساتھ ہی شر بھی ہے کیونکہ غزالی کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ اعمال کے خیر و شر کا معیار ہی یہی ہے کہ وہ واقع میں نفع بخش اور مفید یا نقصان دہ اور مضرت رساں ہیں احیاء[1] میں کہتے ہیں

"جھوٹ کی ذات میں کوئی قباحت نہیں اگر کوئی قباحت ہے تو اس وجہ سے کہ اس سے مخاطب یا کسی اور شخص کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

جہاں انھوں نے حرام کے مختلف اقسام بیان کیے ہیں وہاں بھی اُن کی رائے یہی معلوم ہوتی ہے، کہتے ہیں :-

"کوئی چیز یا تو اپنی ذات کی کسی صفت کی وجہ سے حرام ہوتی ہے یا اس لئے کہ اُس سے دوسرے کو نقصان پہنچتا ہے۔"

تو گویا ایسی جعد نباتات جن کے کھانے سے نقصان نہیں پہنچتا حرام نہیں ہوں گی نباتات میں صرف وہ چیزیں حرام ہوں گی جن کی وجہ سے عقل زائل ہو جاتی یا انسان کی صحت کمزور پڑ جاتی یا اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب زہر اتنا تھوڑا ہو کہ اُس سے مضرت کا کھٹکا نہ رہے یا اُس کو کسی اور چیز کے ساتھ ملا کر بے ضرر بنا دیا جائے تو حرام نہیں ہوگا۔ دوسرے کا غصب کیا ہوا مال اس لئے حرام ہے کہ اس سے مغصوب عنہ کو ضرر از نقصان پہنچتا ہے۔ مضر چیز ہر حال میں شر اس لئے قرار پائی ہے کہ خیر و شر کا قاضی و حاکم عقل کی جگہ شرع کو تسلیم کیا گیا ہے اور شرعی احکام کی تحصیل واکتساب ہر [illegible] پر فرض ہے اور ان احکام سے جہالت و بے خبری اُسی وقت عذر اور بہانہ ہو [illegible] جب کوئی شخص ابھی تازہ تازہ اسلام لایا ہو اور اُسے ان احکام کے جاننے کی فرصت اور مہلت ہی نہ ملی ہو ظاہر ہے کہ اس قسم کے اتفاقات ہوں گے بھی تو بہت کم اور شاذ ونادر ہوں گے۔

---

[1] جلد ۳ ص ۱۳۹

عمل اور اعتقاد

جب کوئی شخص کمال تلاش و جستجو کے بعد بھی خیر کا سر رشتہ گرفت میں نہ لا سکے اور وہ شر ہی کو خیر سمجھ کر اپنے تمام اعمال و افعال کو اسی سانچے میں ڈھالنا شروع کر دے تو ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایسے شخص کے متعلق غزالی کی بارگاہ سے کیا حکم اور کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔

غزالی کی تالیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ عملی خیر اور اعتقادی خیر میں فرق ہے چنانچہ احیاء[1] میں کہتے ہیں۔

"جب مفتی کے قلب نے کسی چیز کی صحت کا فتویٰ دے دیا تو گویہ فتویٰ واقع میں درست نہ ہو لیکن اس کے باوجود مفتی اجر و ثواب کا مستحق ہوگا بلکہ اگر کسی شخص نے سمجھا کہ اس نے وضو کر لیا ہے تو اس کے لئے نماز پڑھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز کے بعد اسے یاد آیا کہ میں نے وضو نہیں کیا تھا تو بھی اس کو نماز کا اجر و ثواب ملے گا۔ مجرم اور گنہگار وہ ہے جس نے دیدہ و دانستہ بے وضو نماز پڑھی اگر کسی شخص کے بستر پر اجنبی عورت لیٹی ہوئی تھی اور اس نے بیوی سمجھ کر اس سے صحبت کر لی تو اس پر کچھ مواخذہ نہیں۔ اگر کسی شخص کے بستر پر اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی اور اس نے غیر عورت سمجھ کر اس سے جماع کر لیا تو وہ عاصی اور مجرم ہوگا۔"

المنقذ[2] من الضلال میں کہتے ہیں:۔

"علمائے طبیعیات نے عالم الطبعی اور حیوانات و نباتات کے اعجوبہ کاریوں میں بڑی تفتیش اور جستجو سے کام لیا ہے۔ علم تشریح میں ان کی تحقیقات لائق صد داد و تحسین ہیں وہ ان علوم کے واسطہ و مطالعہ سے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس تمام کارخانہ عجائب کے پیچھے کسی بڑی ہی دانا و حکیم ذات کا ہاتھ کار فرما ہے، اور اسی پر کیا موقوف ہے، جو بھی ان علوم کا مطالعہ کرے گا وہی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ تمام حیوانات بالعموم اور انسان بالخصوص کسی حکیم علی الاطلاق کی حکمت و

---

[1] ج ۳ ص ۷۰ [2] ص ۱۱

صنعت کا کامل نمونہ و مرقع ہے لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود ماہرین طبیعیات کی بڑی بدبختی اور بدنصیبی یہ ہے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ اعتدال مزاج کو حیوانات کے قویٰ میں بہت بڑا دخل ہے تو انھوں نے یہ سمجھا کہ انسان کی قوت عاقلہ بھی اُس کے مزاج کے تابع ہے اور جب انسان کے مزاج کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے تو اس کی قوت عاقلہ کا شیرازہ بھی خود بخود ایسا بکھر جاتا ہے کہ پردۂ عدم سے ادھر اُسے کہیں پناہ ہی نہیں ملتی، اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز عدم محض میں چلے جانے کے بعد دوبارہ وجود کے خلعت سے سرفراز نہیں کی جا سکتی۔ اس نکتہ کی بنا پر انھوں نے یقین کر لیا کہ انسان کا نفس ابدالآباد کے لئے فنا اور معدوم ہوجاتا ہے اور اعادۂ معدوم چونکہ محال ہے اس لئے قیامت وغیرہ کا تصور ہی سرتاپا لغو اور بیکار ہے۔ یاد رکھو یہ گروہ بھی لادینی اور زندقہ کا شکار اور ایمان کی روشنی سے بالکل محروم ہے۔ کیونکہ اصل ایمان، ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کا نام ہے۔ یہ گروہ گو اللہ کی ذات وصفات پر تو ایمان لایا لیکن آخرت پر ایمان لانے کی اسے توفیق نہ ہوئی۔

غزالی کی لغزش اس باب میں واضح وظاہر ہے وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو شخص علم تشریح اور علم وظائفِ اعضا کا مطالعہ کرے گا وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس تمام کارخانۂ ہست و بود کے پیچھے کوئی بہت بڑی مدبّر و حکیم ذات سلسلہ جنبانی کر رہی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا ایمان اُس شخص کی نسبت کہیں زیادہ قوی اور مضبوط ہوگا، جس نے ان علوم کا مطالعہ نہیں کیا، لیکن یہ ماہر علم تشریح جب صبح وشام دیکھتا ہے کہ نفسِ انسانی مزاج سے متاثر ہو کر کبھی قوی و توانا اور کبھی ضعیف و کمزور ہوتا ہے تو وہ کیسے اس نتیجے پر نہ پہنچے گا کہ مزاج کے عدم و فنا کے ساتھ نفسِ انسانی بھی معدوم و فنا ہوجاتا ہے حیرت ہے غزالی ایسے شخص کو زندیق کہتے ہیں، حالانکہ وہ خود یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ اگر کسی شخص سے اجتہادی لغزش ہوجائے اور وہ کسی غیر عورت کو اپنی بیوی سمجھ کر اس سے صحبت کرلے تو وہ مجرم و عاصی نہیں ہے۔

غزالی نے اپنی تالیفات میں متعدد جگہ اس امر کی تصریح کی ہے کہ جس شخص کو جبراً شراب پلا دی جائے اس پر کوئی تعزیر نہیں۔ میزان العمل میں کہتے ہیں:-

"اخلاق کا سنورنا اور بگڑنا اختلاف امزجہ کے تابع ہے"

تو گویا غزالی کی نگاہ میں شرعی مواخذہ اور گرفت کے لئے انسان کی مرضی اور اختیار شرط ہے جیسا کہ انھوں نے احیاء العلوم جلد ثالث میں حدیث النفس کے تحت کہا ہے تو پھر حیرت ہے کہ وہ ایسے شخص کی تکفیر کیوں کرتے ہیں جس کے علم اور مطالعہ نے اُسے اس نتیجہ پر پہنچایا ہو کہ مزاج کے ساتھ نفس انسانی بھی معدوم اور فنا ہو جاتا ہے۔ کیا علم تشریح کا پڑھنا غزالی کے نزدیک حرام اور جرم ہے۔ جب شرع خود عقل کو حاکم و قاضی قرار دیتی ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں جا بجا مذکور ہے تو کیا اس کا معنی صرف یہی نہیں کہ شرع تنہا کسی امر میں کوئی فیصلہ دینا نہیں چاہتی ورنہ ہمیں صاف اعتراف کرنا چاہیئے کہ شرع اپنا ہر حکم اور ہر فیصلہ تلوار کے زور سے منوانا چاہتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ غزالی ایمان کی صحت و درستی کی بحث میں عوام کی رضا جوئی اور خوشنودی حاصل کرنے کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ:-

"بعض اوقات انسان لاعلمی اور بے خبری میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو موجب کفر ہوتی ہیں"

المنقذ من الضلال میں غزالی کی یہ رائے کتنی عجیب و غریب اور دلچسپ ہے:-

"ارسطو نے افلاطون اور سقراط وغیرہ دوسرے علمائے الٰہیات کی تردید میں گو کوئی دقیقہ اور قصر اٹھا نہیں رکھی لیکن افسوس ہے کہ ان فلاسفہ کے ہاتھوں نے جو کفر کا جام بھرا تھا ارسطو نے بھی اس سے چند گھونٹ پی لئے اس لئے ارسطو اور اس کے متبعین ابن سینا اور فارابی وغیرہ کی تکفیر و تضلیل ضروری ہے"

وہ غزالی جنھوں نے ایمان کے باب میں اس قدر مبالغہ و اسراف اور شدت و سختی سے کام لیا ہے جب لوگوں سے حسن ظن رکھنے کی تلقین کرتے ہیں تو وہاں نہایت معتدل اور روشن خیال نظر آتے ہیں چنانچہ کسی کو دل سے بُرا سمجھنے کی حرمت میں فرماتے ہیں:-

کسی کو بُرا سمجھنے کا حق اُسی وقت پہنچتا ہے جب تمہارے پاس اُس کی بُرائی کے ایسے واضح اور روشن دلائل جمع ہو جائیں جو کسی توجیہ اور تاویل کو قبول نہ کرتے ہوں، فرض کرو کسی شخص سے اگر شراب کی بو آتی ہے تو اُس کی حد اور تعزیر جائز نہیں کیونکہ ممکن ہے اُس نے پی نہ ہو صرف اُس سے کلی کی ہو، یا پی ہو تو اپنی مرضی اور ارادے سے نہیں بلکہ اپنی طبیعت کے خلاف جبراً پی ہو۔ اس لئے حسن ظن کا تقاضا یہی ہے کہ تم اُس سے کوئی تعرض نہ کرو"

میری رائے یہ ہے کہ کسی شخص کی تکفیر صرف اُسی وقت جائز ہو سکتی ہے، جب اُس نے دیدہ و دانستہ حق و صواب کی راہ چھوڑ کر کفر و باطل کی راہ اختیار کی ہو، جس فیلسوف نے کمالِ نیک نیتی اور تفتیش و جستجو کے بعد کوئی ایسا مسلک اختیار کیا ہو جو رائے عامہ اور سوادِ اعظم سے مختلف اور دین کی تعلیمات سے براہِ راست ٹکراتا ہو تو بھی وہ فیلسوف یقیناً ناجی ہے غزالی کا فرض تھا کہ ابنِ سینا اور فارابی کی محض تکفیر پر ہی اکتفاء نہ کرتے بلکہ اس دعوے کی تائید میں کچھ دلائل بھی لاتے۔

خیر و شر کا معیار

باوجودیکہ غزالی عمل کے حسن و قبح کا سارا معاملہ شرع کے حوالہ کرتے ہیں اور اس میں عقل کی مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات جب وہ خود کسی عمل کے خیر و شر ہونے کا فیصلہ کرنے نکلتے ہیں تو عقل اور شرع دونوں کی کسوٹی ہاتھ میں لئے نظر آتے ہیں اور جب تک کسی عمل کو ان دونوں کسوٹیوں پر کس نہیں لیتے اُس کے خیر و شر کے قائل نہیں ہوتے۔

گو غزالی نے اس بحث کے لئے کوئی الگ اور مستقل باب قائم نہیں کیا لیکن ضمناً ان مسائل کو کئی جگہ بیان کیا ہے۔ میزان[1] العمل میں سخاوت کی تعریف میں کہتے ہیں :-

"مقتضائے عقل و شرع کسی چیز کو مرضی اور خوشی سے صرف کرنے یا نہ کرنے کا نام سخاوت ہے"

---

[1] ص ۸۱

اسی کتاب میں دوسری جگہ[1] کہتے ہیں:۔

"اعضاء و جوارح کی نیکی اور عفت کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ ان کو صرف ایسے کاموں میں صرف کیا جائے جن کو عقل و شرع دونوں نے روا رکھا ہو"

احیاء العلوم[2] میں کہتے ہیں:۔

"عقل اور شرع دونوں کے متحدہ تقاضے کے تحت شہوت اور غصے کے ضبط کا نام قوت عدل ہے"

عمل صالح کی تعریف میں کہتے ہیں:۔

"عمل صالح وہی ہے جس کو عقل اور شرع دونوں کے ترازو دوں میں اچھی طرح تول لیا گیا ہو"

اپنے قائم کردہ معیار سے غزالی کی غفلت اور انحراف

آپ دیکھ چکے ہیں کہ خیر اور شر کے پرکھنے میں غزالی شرع کے ساتھ عقل کی کسوٹی کو بھی بیکار نہیں سمجھتے لیکن یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ عقل اور شرع غزالی کے ہاں ہے کیا؟

خود غزالی نے اخلاق کے بارے میں بعض ایسے احکام کا ذکر کیا ہے جو ایک لمحہ اور ایک پل کے لئے بھی عقل یا شرع کے ساتھ میل نہیں کھاتے، مثلاً کھانے کے سلسلے میں میزان[3] میں کہتے ہیں:۔

"کھانے کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ تمام اچھائیوں اور برائیوں کا منبع و سرچشمہ معدہ ہے ــــــ اس کے بھی تین درجے ہیں پہلا درجہ یہ ہے کہ بقدر ضرورت و کفایت کھایا جائے اور قدر ضرورت سے مراد یہ ہے کہ جس سے سد رمق کا کام لیا جائے اور بدن کی صحت اور عبادت کی قوت کو بحال رکھا جائے۔ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اتنا کم کھانے کا عادی بنایا جا سکتا ہے کہ دس بیس روز تک اس سے صبر کیا جا سکے بعض زاہدوں کے متعلق منقول ہے کہ وہ اتنا کم کھانے کے عادی ہو گئے تھے کہ صرف ایک دانہ نخود پر قناعت کر سکتے تھے بعض بیس اور بعض چالیس روز تک متواتر فاقے سے رہ سکتے تھے لیکن یہ انتہا

---

[1] ص ۱۳۶ [2] ج ۳ ص ۵۰ [3] ص ۱۸۴

بلند مقام ہے کہ خال خال لوگوں کو ہی میسر آسکتا ہے۔"

احیاء العلوم کے رُبع ثالث میں بھوک کے فضائل کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر کہتے ہیں:۔

"حضرت مسیح علیہ السلام ساٹھ دن تک خالی شکم اللہ کی عبادت میں مستغرق رہے ایک دن اتفاق سے روٹی کا خیال جو دل میں گذرا تو عبادات و مناجات کی ساری لذت جاتی رہی دیکھا تو سامنے ایک روٹی رکھی تھی اور پاس ہی ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام رونے لگے اور اس بوڑھے سے کہا اے ولی اللہ تمہیں خدا برکت سے نوازے میرے لئے دعا کرو تاکہ عبادت و مناجات کی لذت وکیفیت مجھے دوبارہ مل جائے۔ پیر مرد نے ہاتھ اٹھا کر کہا "اے اللہ تیری معرفت کے بعد اگر کبھی میرے دل میں روٹی کا خیال بھی گذرا ہو تو میری مغفرت نہ کیجیو! پھر کہا جب کبھی کسی کھانے کی چیز کا تصور ہوا بغیر کسی دھیان اور توجہ کے اُسے کھایا۔"

آگے چل کر کہتے ہیں۔

"بھوک کے فوائد میں سے ساتواں فائدہ یہ ہے کہ اس سے عبادت پر مداومت میں امداد ملتی ہے لیکن اس کے برعکس کھانے میں بہت نقصانات ہیں کچھ وقت کھانا کھانے میں ضائع ہوگا، کچھ وقت اشیائے خوردنی کے خریدنے، پکانے اور پھر برتن کے صاف کرنے اور دانتوں کے خلال کی نذر ہو جائے گا اور پھر جب پیٹ بھر کر کھانا کھایا جائے گا تو لامحالہ پانی پینے کی ضرورت زیادہ لاحق ہوگی اس لئے بار بار آب خانے کی طرف جانے کی ضرورت لاحق ہوگی غور کیجئے اگر یہ سارا وقت اللہ کی عبادت میں صرف ہوتا تو روح کو کتنی نشاط اور کتنی بالیدگی حاصل ہوتی۔"

پہلے اقتباس میں آپ نے دیکھا کہ تقلیلِ طعام پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ ایک دانہ نخود پر قناعت کرنے اور بیس سے چالیس دن تک بھوکا رہنے کی تلقین فرماتے ہیں

بتائیے یہ کہاں کی عقل اور کہاں کی شرع ہے کیا غزالی چاہتے ہیں کہ مومن سے خوشی و مسرت اور قوت و توانائی کا ذرہ ذرہ چھین لیں تاکہ وہ محض اپاہج ہو کر رہ جائے کیا وہ ایمان و شرع کے اس تقاضے کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہر مومن کو ایک قوی و توانا سپاہی کی زندگی بسر کرنی چاہئے تاکہ جہاں وہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کا کام خوبی سے انجام دے سکے وہاں کفار و مشرکین کے دلوں میں خوف و ہراس کی لہر بھی دوڑا سکے۔

دوسرے اقتباس میں غزالی نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعریف نامناسب پیرائے میں کی ہے کیا کسی نبی کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ خالی شکم متواتر ساٹھ دن تک اللہ کی عبادت و مناجات میں مصروف رہے۔ کیا یہ نبی دین کی دعوت و تبلیغ کے لئے اللہ کے ہاں مسئول نہیں ہے؟ کیا وہ اس ضعف و ناتوانی کے ساتھ دین کی نشر و اشاعت کا کام انجام دے سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء و رسل کے متعلق اس قسم کی باتیں کرنا بہت بڑی جرأت اور بہت بڑی جسارت کا کام ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ انبیاء زور و قوت اور بہادری و شجاعت کا کامل نمونہ ہوتے ہیں۔ یہ ترک دنیا جس کی طرف غزالی داعی ہیں انسان میں بجز کاہلی و سستی اور ضعف و گمنامی کے اور کیا پیدا کر سکتی ہے؟ اور ہمارا ایمان ہے کہ انبیاء سست اور کاہل کبھی نہ تھے۔

تیسرے اقتباس میں نصیحت کرتے ہیں کہ وقت کو کھانے پینے اور اشیاءِ خوردنی کے خریدنے پکانے اور بدن کو صاف کرنے اور دانتوں میں خلال کرنے میں ضائع نہیں کرنا چاہئے معلوم نہیں اگر لوگ خیر و شر کا معیار یہی قرار دیں تو ان کا انجام کتنا دلسوز اور عبرتناک ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ غزالی کی تمام اخلاقی تالیفات تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ میزان العمل کے متعلق تو خود انھوں نے تصریح کر دی ہے کہ اس کے اکثر مسائل کی بنیاد تصوف پر رکھی گئی ہے اور آپ جانتے ہیں تصوف زندوں کی نہیں مردوں کی چیز ہے، آخر وہ بھی کوئی مشرب ہے جو غزالی کو مستقبل کے متعلق یہ تصور اور یہ فکر دیتا ہے۔

سب سے بڑا مقام اور بڑا درجہ یہ ہے کہ انسان ہر دن کو زندگی کا آخری دن اور ہر گھڑی کو زندگی کی آخری گھڑی شمار کرے اور ہر لمحہ یہ سمجھے کہ شاید ابھی اس دنیا سے کوچ کر جاؤں"

میں سمجھتا ہوں جس قوم کے ہاں اخلاق کا تصور یہ ہو وہ زندہ قوموں کے دوش بدوش کش مکش کی زندگی میں کبھی حصہ نہیں لے سکتی۔ آخر میں یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ غزالی کا قائم کردہ معیارِ اخلاق آزاد اور غیور انسانوں کی نسبت غلاموں کے زیادہ مناسب ہے۔

دُوسری فصل

ارادہ

(۱)

ارادے کا لفظ غزالی کی کتب میں کئی معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کبھی تو وہ اس سے سلوک فی طریق اللہ یعنی اللہ کی راہ میں سیر و سفر مراد لیتے ہیں اور اسی سے مرید کا لفظ مشتق کرتے ہیں جو ان کی تالیفات میں کئی جگہ موجود ہے۔ اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کی راہ پر گامزن ہے اور اللہ کی راہ آپ جانتے ہیں غزالی کی رائے میں صرف صوفیہ کی راہ ہے۔

جب ارادہ کا مذکورہ بالا مفہوم مراد لیا جائے تو اس کے لئے شرط اول یہ ہے کہ صاحبِ ارادہ (مرید) سب سے پہلے اُن دیواروں کو گرا دے جو اللہ اور اس کے مابین حائل ہیں۔ اور یہ دیواریں چار ہیں۔

(۱) دولت	(۲) جاہ و منصب
(۳) تقلید	(۴) معصیت

دولت کی دیوار گرانے کی صورت یہ ہے کہ بقدر ضرورت کچھ اشیا اپنے پاس رکھ کر باقی سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دے۔ جاہ و منصب کا حجاب اُٹھانے کا طریق یہ ہے کہ

گوشہ نشینی اور ترکِ علائق سے کام لے اور اُن راہوں سے ہی دوری اختیار کرے جو جاہ و منصب تک پہنچاتی ہوں، تقلید کا بند توڑنے کا معنی یہ ہے کہ مختلف مشربوں کا یکساں اور برابر احترام کرے اور کسی مشرب کی طرف سے دل میں میل نہ چھوڑے۔ معصیت کا مرحلہ یقیناً کچھ کٹھن اور مشکل ہے لیکن اس کو بھی توبہ کے آنسوؤں، ندامت کی بے کلی اور بے چینی اور مستقبل میں اس سے مجتنب اور باز رہنے کے عزمِ راسخ اور مظالم سے بکلی تبری و خروج کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔

مرید یا سالکِ راہ کے لئے ان چاروں پردوں کا اٹھانا غزالی کی رائے میں ایسا ہی ضروری ہے جیسے نماز کے لئے طہارت اور وضو۔ جس طرح نماز کے لئے کسی امام کا ہونا ضروری ہے اسی طرح مرید کے لئے مرشد کا ہونا بھی لازمی اور ناگزیر ہے۔ غزالی نے مرشد کے سامنے مرید کے بعض آداب کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کا بیان کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم یہاں صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ میزان، منہاج اور احیاء میں غزالی نے جو مرید کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے اس سے مراد کیا ہے۔

(۲)

کبھی غزالی ارادہ سے مراد وہ جذبہ لیتے ہیں جو علم و معرفت سے پیدا ہوتا اور انسان کی قدرت و طاقت کو مسخر کر کے اس سے کام لیتا ہے۔ علمائے اخلاق کی رائے میں بھی ارادہ کا مفہوم بعینہٖ یہی ہے۔ غزالی کے ہاں اس کے علاوہ ارادے کے اور بھی کئی نام ہیں۔ جب نفسِ انسانی کو قوتِ عالمہ اور قوتِ عاملہ کی طرف تقسیم کرتے ہیں تو قوتِ عاملہ کا نام ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

"قوتِ عالمہ کے تقاضے کے مطابق جو قوت جزوی اور فکری اعمال و افعال کی جانب بدن انسانی کی حرکت کا مبدا اور موجب بنتی ہے وہ قوت عاملہ کہلاتی ہے[1]۔"

---

[1] میزان ص ۲۶

کبھی ارادے کو نیت کا نام دیتے ہیں مثلاً اربعین اور احیا رمیں جہاں ارادہ کا ذکر کیا ہے وہاں ان مسائل کا عنوان نیت ہی دیا ہے۔ اگر آپ ان دونوں کتابوں کی فہرست مضامین پر اس غرض سے نگاہ ڈالیں کہ غزالی نے کن کن فصول میں ارادے سے بحث کی ہے اور پھر ان فصول کو چھانٹ کر تنہا ان ہی کا مطالعہ کریں تو آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان کے ہاں ارادے کا مفہوم وہ ہرگز نہیں جو علمائے اخلاق کے ہاں ہیں بلکہ غزالی کے ہاں ارادے کا مفہوم وہ ہے جو صوفیہ مراد لیتے ہیں اور جس سے مرید کا لفظ مشتق کرتے ہیں۔ رہا وہ ارادہ جو علم الاخلاق کے منجملہ موضوعات کے ہے سو اس کو غزالی ارادہ نہیں نیت کہتے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی لمبی چوڑی تشریح کرتے ہیں۔

(۳)

غزالی کہتے ہیں :-

"نیت، ارادہ اور قصد ایک ہی معنی و مفہوم کی مختلف تعبیریں ہیں اور یہ معنی و مفہوم قلب کی ایک ایسی حالت وکیفیت کا نام ہے جو علم اور عمل دونوں میں گھری ہوئی ہے۔ علم عمل پر مقدم ہے کیونکہ یہ اصل اور شرط ہے۔ اور عمل بمنزلہ ثمر اور شاخ ہے اور یہ اس لئے کہ ہر عمل (یعنی انسان کا ہر اختیاری سکون اور حرکت) بجز تین امور کے تمام اور مکمل نہیں ہوتا علم، ارادہ اور قدرت؛ کیونکہ جب تک انسان کو کسی شے علم نہ ہوگا اس کا قصد اور ارادہ کیسے کر سکتا ہے۔ تو گویا پہلے علم کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد جب تک کسی شے کا ارادہ نہ کیا جائے اُس کے سلسلے میں عمل کا قدم اٹھ نہیں سکتا تو دوسرے درجے میں ارادے کا وجود بھی ضروری ہوا اور ارادہ کا معنی یہ ہے کہ قلب اُس شے کی طرف مائل ہو جو حال یا مآل میں غرض اور مقصد کے مطابق و موافق ہے[۵]۔"

دوسری جگہ نیت کی تعریف میں کہتے ہیں :-

---

[۵] احیا، ج ۴ ص ۳۸۱

نیت اُس ارادے کا نام ہے جو علم کے سرچشمے سے اٹھ کر قدرت و طاقت کو حرکت میں لاتا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ آپ کے تمام اعمال و افعال اسی وقت معرض وجود میں آ سکتے ہیں جب قدرت، ارادہ اور علم تینوں جمع ہو جائیں۔ علم ارادے کا چراغ روشن کرتا ہے اور قدرت اور طاقت اس روشنی میں عمل کے نقش و نگار آراستہ کرتی ہے تو گویا قدرت و طاقت ادنیٰ سے ادنیٰ اور چھوٹے سے چھوٹے عمل کے انجام دینے کے لئے بھی ارادے ہی کے چشم و ابرو کے اشارے کی منتظر رہتی ہے[1]"

ظاہر ہے کہ ارادے کی تعریف جو آج کل کی جاتی ہے اُس میں اور غزالی کی تعریف میں کوئی فرق نہیں کیونکہ آپ غزالی کے گذشتہ کلام میں اور جول سیمون کے اس قول میں کوئی اختلاف نہیں پائیں گے جول سیمون کہتا ہے

"واقعہ یہ ہے کسی عمل کے لئے شرط اول یہ ہے کہ ہم اُس کا ارادہ کریں اور ارادہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ ہم کس چیز کا ارادہ کر رہے ہیں اور کیوں[2]"

(۳) ۱۔

غزالی کہتے ہیں:-

"کسی عمل کا ارادہ اور اُس کی طرف اقدام کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ہمیں اس عمل کے حق و صواب کا علم ہو جائے بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے دل میں اس بات کو بھی پوری طرح جگہ دیدے کہ یہ عمل میری غرض اور میری منشا کے عین مطابق ہے کیونکہ جب یہ یقین پختہ اور راسخ ہو جائے گا اور شک کے کانٹے ایک ایک کر کے نکل جائیں گے تو ارادے کے پیدا ہونے اور قدرت و طاقت کے بڑھنے کا راستے میں زیادہ وقفہ اور دیر نہیں لگے گی"

دوسری جگہ کہتے ہیں:-

---

[1] اربعین ص ۲۶۲ [2] واجب ص ۱۹

کسی عمل کو انجام دینے کے لئے طاقت کی آمادگی اور کمر بستگی کا کبھی تو صرف ایک سبب ہوتا ہے اور کبھی دو سبب ثانی صورت میں کبھی ان دو سببوں میں سے ہر سبب قدرت و طاقت کو سہارا دینے کے لئے تنہا کافی ہوتا ہے اور کبھی ہر سبب مستقلاً تو کافی نہیں ہوتا لیکن دونوں کے باہمی اتحاد اور تعاون سے طاقت و قدرت کو سہارا ملتا ہے اور کبھی ایک کی موجودگی ہی کافی ہوتی ہے لیکن دوسرا سبب اس کی اعانت و امداد کے لئے آموجود ہوتا ہے تو گویا اس حالت میں دوسرا سبب شریک یا رفیق یا معین کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس تقسیم سے معلوم ہوا کہ اعمال کے خیر و شر ہونے میں اسباب و بواعث کے خیر و شر ہونے کو بڑا دخل ہے کیونکہ عمل بہر حال اپنے سبب کے تابع ہے اور اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو سبب کا ہے اگر سبب خیر ہے تو عمل بھی خیر اور اگر سبب شر ہے تو مسبّب یعنی عمل بھی شر بلکہ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ نیت کی قدر و قیمت عمل سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے نِيَّةُ المرءِ خيرٌ من عَمَلِهٖ[1] اور اسی لئے غزالی کہتے ہیں:۔

"اعضاء و جوارح کے صالح اعمال صرف اس لئے مطلوب ہیں کہ ان سے قلب متاثر ہوتا اور انہیں کی وجہ سے خیر کی طرف مائل اور شر کی طرف سے نفور رہتا ہے"[2]

ارادے کی تربیت اور نشو و نما

غزالی کی رائے میں کسی اچھے اور عمدہ میلان کے مقتضیٰ پر بار بار عمل پیرا ہونے اور برے میلان کے مقتضیٰ کی بار بار خلاف ورزی کرنے سے ارادے کی تربیت اور نشو و نما ممکن ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

"جب علم کے ذریعے کسی چیز کی طرف میلان پیدا ہو جائے تو اس کے مقتضیٰ پر بار بار

---

[1] انسان کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ [2] اربعین ص ۲۶۳

عمل کرنے سے اس میلان کو جلا اور قوت ملتی ہے کیونکہ احوالِ قلب کے مقتضیات پر مداومت و مواظبت کرنا گویا ان احوال و صفاتِ قلب کو ایک گونہ غذا اور خوراک دینا ہے مثلاً جو شخص طلبِ علم یا طلبِ جاہ کی طرف مائل و راغب ہے اُس کا یہ میلان اور رغبت ابتدا میں نہایت معمولی اور کمزور ہوتے ہیں لیکن یہی شخص جب عمل کی راہ کی طرف قدم بڑھاتا ہے یا عمل کا قدم بڑھانے کے لیئے تیاری اور سامان کرتا ہے تو یہ رجحان و میلان اور قوی ہو جاتا ہے تاآنکہ رفتہ رفتہ یہ معاملہ اُس کے حدِ اختیار سے نکل جاتا ہے۔ ہاں اگر وہ ابتدا ہی میں اس رجحان کی پرواہ نہ کرے تو یہ کمزور ہوتے ہوتے آخر فنا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ابتدا ہی میں جب کسی حسین کو دیکھتا ہے تو اُس کے قلب میں اس کی طرف ایک ہلکا سا رجحان بیدار ہوتا ہے اگر وہ اس رجحان کی آواز پر کان دھر کر اس حسین سے نشست و برخاست اور ہم کلامی و ہم نشینی یا اس سے بھی زیادہ اختلاط پیدا کر لیتا ہے تو یہ رجحان اس قدر قوی اور مضبوط ہو جاتا ہے کہ اس سے مخلصی اور نجات ناممکن اور محال ہو جاتی ہے لیکن یہی شخص اگر ابتدا میں احتیاط کا دامن سختی اور مضبوطی سے تھامے رکھے اور اس رجحان کی آواز پر مطلقاً کان نہ دھرے تو یہ رجحان غذا نہ ملنے کی وجہ سے خود بخود کچھ عرصے میں ختم ہو جائے گا کیونکہ اعضا اور قلب میں ایک ایسا رشتہ اور تعلق ہے جس کی وجہ سے ہر ایک دوسرے سے برابر متاثر ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قلب ایک متبوع یا بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اعضا خدام و رعایا کی طرح اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں"

غزالی کی نگاہ میں نیت یا یوں کہیئے ارادے کے بغیر عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے تو گویا سارا دار و مدار نیت پر ہے۔ اس لئے عمل سے پہلے نیت کو زیادہ قوی ہونا چاہئے کیونکہ کسی اچھے کام کی طرف رغبت جس قدر قوی اور برے کام کی طرف سے نفرت جس قدر شدید ہوگی اُسی قدر انسان اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ اگر وہ خیر کو دل و جان سے اچھا اور

شر کو دل و جان سے بُرا سمجھتا ہے تو اُس کا اجر بھی بہت بڑا ہوگا۔ اور اگر اس اچھا اور برا سمجھنے میں کچھ فرق اور اختلاف ہوگا تو اُس کے اجر میں بھی یہی فرق و اختلاف رونما ہوگا غزالی نے کئی مقامات میں تصریح کی ہے کہ سارا انحصار دل پر ہے بعض اوقات اصرار و مداومت اور سہل انگاری کی وجہ سے گناہ صغیرہ کبیرہ میں بدل جاتا ہے لیکن جب کسی سے اتفاقاً کبیرہ سرزد ہو جائے اور اس پر اُسے سخت ندامت اور پشیمانی ہو تو بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے عفو و درگزر سے کام لے چنانچہ احیاء العلوم[1] میں کہتے ہیں :-

"انسان اپنے گناہ کو جس قدر بڑا سمجھتا ہے اسی قدر وہ گناہ اللہ کی نگاہ میں ہلکا اور حقیر ہو جاتا ہے لیکن اس کے برعکس انسان جس گناہ کو ہلکا اور حقیر سمجھتا ہے وہی گناہ اللہ کی نگاہ میں بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کسی گناہ کو بڑا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا قلب اُسے مکروہ سمجھتا ہے اور اس سے متنفر ہے اور یہ نفرت کا جذبہ اُس شخص کے دل کو گناہ کے خراش سے بچائے جاتا ہے لیکن کسی گناہ کو حقیر سمجھنے کا معنی یہ ہے کہ وہ اس گناہ سے مانوس و آشنا ہے اور اس انس و آشنائی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا دل گناہ کی ضرر سے بُری طرح گھائل اور زخمی ہو جائے۔ غرضیکہ جس دنیا کو عبادت و طاعت کی روشنی سے منور رکھنے اور گناہ کی ظلمت و تاریکی سے بچانے کی تلقین کی گئی ہے وہ دنیا دل ہی کی دنیا ہے۔"

ارادے کی اہمیت

مسئولیت اور جزا کے لئے ارادہ شرط ہے لہذا جو شخص نسیان یا غفلت کا شکار ہو کر کوئی اچھا یا برا کام کرتا ہے وہ کسی جزا و سزا کا مستحق نہیں کیونکہ غزالی کی رائے میں جو کام غفلت میں کیا جائے اُس سے قلب متاثر نہیں ہوتا اور یہ تو آپ خوب جانتے ہیں کہ غزالی کے ہاں جو کچھ ہے قلب ہی ہے نیکی صرف اس لئے نیکی ہے کہ وہ قلب کی اصلاح کرتی یا اس کی

---

[1] ج ۴ ۔ ص ۳۲

اصلاح کا موجب بنتی ہے۔ بدی صرف اس لئے بدی ہے کہ وہ قلب کو بگاڑتی یا اس کے بگاڑ
کا سبب بنتی ہے۔ تردد یا اضطراب کے عالم میں انسان سے کتنا بڑا اور کتنا ہولناک جرم
بھی سرزد کیوں نہ ہو جائے وہ شخص غزالی کی رائے میں کوئی قابل گرفت نہیں کیونکہ انسان
جس کام کو مجبور ہو کر یا مکروہ سمجھ کر انجام دیتا ہے ایسا کام دل پر کوئی اثر اور کوئی نقش
نہیں چھوڑتا لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنی خوشی اور رضا سے ہلکا سے ہلکا گناہ بھی
کرتا ہے تو اس کا انجام بڑا خوفناک ہو سکتا ہے کیونکہ گناہ کی صورت جتنی خوش آئند اور
خوش منظر ہوگی اس کا عکس قلب پر اتنا ہی برا اور اتنا ہی سیاہ پڑے گا بلکہ ایک ہی گناہ کا اگر
عالم اور جاہل دونوں ارتکاب کریں تو ہو سکتا ہے کہ یہ گناہ عالم کی نسبت سے کبیرہ اور جاہل
کی نسبت سے صغیرہ قرار پائے کیونکہ علم کی سطح جتنی بلند ہوگی ارادہ بھی اتنا ہی قوی اور بلند
ہوگا اس لئے کہ علم بمنزلہ اصل ہے اور ارادہ بمنزلہ شاخ و ثمر۔

ایک طویل بحث کے بعد غزالی کہتے ہیں:۔

"تمام عبادات و طاعات کا یہی اثر سمجھنا چاہئے کیونکہ ان سے مراد اعضاء و جوارح کی حرکت
و سکنت یا تھکانا نہیں بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اس حرکت و سکنت سے دل کی دنیا یکسر تبدیل
ہو جائے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سجدے سے صرف غرض یہ ہے کہ پیشانی اور زمین کو باہم ملا دیا جائے
حاشا و کلا ایسا نہیں بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ اس تدبیر سے انسان کے دل میں تواضع و انکسار
کا ملکہ پیدا ہو۔ جب آپ کسی یتیم بچے کو دیکھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور اسے چومتے ہیں تو
اس سے آپ کے دل میں رقت کے جذبات کو پرورش پانے میں بہت بڑی امداد ملتی ہے"

جبر و اختیار

جبر و اختیار کی نزاع بہت پرانی ہے کچھ لوگ اس طرف ہیں کہ ارادہ مجبور و پابزنجیر
ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ آزاد و خودمختار ہے کچھ کہتے ہیں نہ مجبور ہے نہ مختار بلکہ دونوں کے بین بین ہے۔
میں آخری رائے کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ وراثت، صحت، ماحول اور ایسے ہی دوسرے

احوال وظروف اور موثرات وجود سے ہم کسی صورت انکار نہیں کر سکتے جو بعض اوقات انسان کے ارادہ کے لئے ایک ایسی خاص اور متعین راہ تجویز کرتے ہیں جس سے انسان کسی صورت انحراف نہیں کر سکتا۔ ہاں اس کے علاوہ دوسرے امور میں ارادہ آزاد و مختار ہے جس شخص نے اپنے آباء و اجداد سے کچھ اخلاق و عادات وراثت میں پائے ہیں وہ ان کے موافق اعمال انجام دینے کے لئے مجبور ہے۔ جو شخص کسی مرض یا کسی اور تکلیف کی وجہ سے بد مزاج اور جھگڑالو ہو گیا ہے اس عادت و خصلت کو چھوڑ نہیں سکتا۔ جو شخص ایسے ماحول اور ایسے طبقے میں رہتا ہے جس میں ایک مخصوص قسم کے لباس کو قدر و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ شخص ایسا ہی لباس اور ایسی ہی وضع قطع اختیار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ میں لاکھ کہوں کہ میں آزاد و مختار ہوں لیکن واقع میں ایسا نہیں مثلاً میں پگڑی چھوڑ کر ترکی ٹوپی سر پر رکھ سکتا ہوں لیکن ہیٹ ہرگز نہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ میں اُس طبقے کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہوں جس میں چوبیں گھنٹے زندگی بسر کرتا ہوں۔ جو شخص احوال و ظروف کے تقاضے سے مجبور ہو کر کوئی جرم کرتا ہے وہ ہرگز آزاد و مختار نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے بعد جرم کی مسئولیت کے لئے پہلے اُن احوال و ظروف کا تجزیہ کیا جائے گا۔ جن میں یہ جرم عمل میں آیا ہے تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ مجرم اس جرم کے لئے مسئول و جوابدہ ہو بھی سکتا ہے یا نہیں کیونکہ اکثر اوقات نہایت معصوم اور بے گناہ قسم کے لوگ سزا کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب اختیار کے تمام موانع دور ہو جائیں تو اس وقت ارادہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں آزاد کہلا سکتا ہے اور اُسی وقت کسی عمل پر خیر یا شر کا حکم لگا کر نیک و بد کو جزا یا سزا دی جا سکتی ہے، کیونکہ ان کے سامنے نیکی اور بدی دونوں کی راہیں باز تھیں اور ان کے پاؤں دونوں پر چلنے کے لئے کھلے اور آزاد تھے لیکن جب کوئی شخص بحالت مجبوری و اضطرار نیک یا بد کام کرتا ہے تو وہ میری رائے میں ثواب اور عقاب دونوں میں سے کسی کا بھی مستحق نہیں۔

غزالی نہ تو ارادے کی مطلق حریت و آزادی کے قائل ہیں نہ مطلق مجبور و پابزنجیر ہونے کے

بلکہ کہتے ہیں :-

"قدرت و مقدور اور اختیار و مختار سب کا خالق خدا ہے۔ قدرت و طاقت انسان کی صفت سہی لیکن انسان کی مخلوق نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح حرکت اپنے فعل و مقدور میں انسان کی منت پذیر ہے لیکن خلق و اختراع میں اللہ ہی کی جانب محتاج ہے تو گویا ہم حرکت کو ہم ایک اعتبار سے قدرت اور دوسرے اعتبار سے کسب اور صنعت کہہ سکتے ہیں۔ ان تمام امور کے باوصف حرکت احاطۂ جبر سے باہر ہے کیونکہ حرکت اختیاری اور کپکپی دونوں میں ہر شخص بالبداہت فرق محسوس کرتا ہے۔ حرکت انسان کی مخلوق کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ انسان کا علم نہایت ناقص اور ادھورا ہے وہ اپنی اکتسابی حرکات کے اجزاء و اعداد کی تفاصیل سے بھی بالکل ناآشنا اور بے خبر ہے۔ جب دونوں شقیں باطل ہو گئیں تو نتیجہ اعتدال کے ہاتھ رہا یعنی اعتقاد یہ ہونا چاہیئے کہ حرکت ابتداء اور اختراع کے اعتبار سے اللہ کی مقدور اور اکتساب و تحصیل کے اعتبار سے انسان کی مقدور ہے۔"[1]

واقعہ یہ ہے کہ غزالی کی اس رائے سے انسان کے اعمال میں اختیار کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب اختیاری حرکت کپکپی سے مختلف ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ انسان کو اپنی حرکات میں ایک گونہ اختیار حاصل ہے۔ لیکن چونکہ انسان کو اپنی حرکات کی تفاصیل کا علم نہیں ہے اس لئے اس کی حرکات اختیاری نہیں ہو سکتیں۔ بنا بریں اختیار اس امر پر کب موقوف ہے کہ انسان کو پہلے اجزاء اور اعداد کا علم ہو۔ بسا اوقات ہم ایک اختیاری عمل کے ضروری اجزاء و لوازم سے بے خبر اور بے گانہ ہوتے ہیں لیکن یہ بے خبری اور غفلت ہمارے اختیار میں کوئی مانع اور خلل انداز نہیں ہو سکتی۔

غزالی کہتے ہیں :-

"اعمال و افعال کا کاسب گو انسان ہے لیکن یہ اس کے منافی نہیں کہ یہ اعمال اللہ کی مشیت اور مراد کے مطابق ہوں کیونکہ زمین و آسمان میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت بھی ایسی نہیں جو اللہ

---

[1] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۲۰

کی قضا، اور قدرت سے باہر ہو، آنکھ کی جھپک دل کی کھٹک نگاہ کی بھٹک سب پر اللہ مطلع ہے، خیر و شر، نفع و ضرر، کفر و اسلام، معروف و منکر، کامیابی و ناکامی، ہدایت و گمراہی، طاعت و نافرمانی، شرک و توحید سب اللہ کی مشیت اور ارادے سے وقوع و وجود میں آتے ہیں۔[۱]

میں یہ سمجھنے سے عاجز و قاصر ہوں کہ یہ کسب یا اکتساب کیا چیز ہے جس کو اہل سنت اور اہل سنت کی تقلید و پیروی میں غزالی بھی ثابت کرتے ہیں۔ وہ انسان کو مجبور و مضطر تو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ کہیں اپنے حریف مقابل "جبریہ" کے کیمپ میں نہ پہنچ جائیں کہ وہ اہل سنت کی رائے میں اول درجے کے مجرم و خطا کار ہیں۔ آزاد و مختار اس لئے نہیں کہتے کہ کہیں معتزلہ سے بغل گیری کی نوبت نہ آ جائے حالانکہ وہ ان کے بغلی دشمن ہیں۔ آخر ناچار اپنے لئے تیسری راہ تجویز کرتے ہیں کہ انسان نہ تو مطلق آزاد ہے اور نہ مطلق مجبور بلکہ کاسب و محصل ہے اور پھر یہ کسب و تحصیل بھی اللہ کی مشیت اور ارادے کے تحت وجود میں آتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ جب یہ سب کچھ اللہ کے حوالہ ہو گیا تو بے چارے انسان کے پاس باقی رہا تو کیا رہا؟

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ سنت ایک غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ بنیاد اس غلط فہمی کی یہ ہے کہ انھوں نے یہ سمجھا کہ اگر ہم نے ارادہ کو آزاد کہا تو یہ اللہ کے باب میں بہت بڑا سوءِ ادب اور بہت بڑی گستاخی ہو گی۔ اسی لئے غزالی نے اس مسئلے کو ایک ایسے جاگیردار کی مثال سے واضح کیا جو اپنی جاگیر میں کسی کارندے کے عمل دخل کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا حالانکہ ایسی لاطائل مثالوں کی ضرورت و حاجت ہی نہ تھی کیونکہ انسانی ارادے کی حریت سے بھلا اللہ کو کیا نقصان پہنچتا ہے۔ آنکھ کا جھپکنا جو ایک طبعی فعل ہے اس کو اللہ کی مشیت اور ارادے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔؟

بعض فریب خوردہ حضرات کا یہ قول کہ

قدرت و طاقت کے باب میں اللہ کی تخلیق و اختراع کا اعتراف ہی واقع میں انسان کے

---

[۱] احیاء ج ۱ ص ۱۳۰

کسب و تحصیل کے اعتراف کے لئے کافی ہے"
بالکل بے جان اور بے قیمت ہے کیونکہ اس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں کہ قدرت و طاقت کا منبع و سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اللہ جب چاہتا اور جدھر کو چاہتا ہے انسان کی قدرت کا رُخ پھیر دیتا ہے، ورنہ ہم ہر ملا اور ڈنکے کی چوٹ کہیں گے کہ انسان کو اوامر و نواہی کا مکلف بنانا ہی سرے سے عبث اور بے سود تھا۔ یہ حضرات کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں مگر ہم یہی فیصلہ دیں گے کہ انسان کا ارادہ حُر و آزاد ہے یہی اللہ کا قانون اور یہی ناموسِ فطرت ہے۔

آپ ابھی ابھی ارادے کی تربیت اور نشو و نما امکان پڑھ چکے ہیں۔ جب میرا ارادہ اللہ کے ارادے کے تابع ہے اور بجائے خود کوئی وقعت و حقیقت نہیں رکھتا تو پھر غزالی کس ارادے کی نشو و نما کو ثابت کر رہے ہیں ملاحظہ فرمائیے یہ تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟

ابھی تک ہمارے حافظے میں یہ بات تازہ ہے کہ غزالی احیاء العلوم میں ایک جگہ کہتے ہیں "نیت اختیار کے تحت داخل نہیں ہے"۔ یہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ غزالی ارادے ہی کو نیت سے تعبیر کرتے ہیں اور ارادے کے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ جبر و اختیار دونوں میں گھرا ہوا ہے تو آپ ہی بتائیے کہ غزالی کا کبھی تو یہ کہنا کہ نیت آزاد ہے اور کبھی یہ کہنا کہ مجبور ہے، یہ دونوں فیصلے باہم تناقض و تنافی ہیں یا نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ جس ارادے کو غزالی مجبور کہتے ہیں وہ ارادہ بمعنی تعمد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ صحیح اور سچا ارادہ ہے جس کے فوراً بعد عمل کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تو ممکن ہے کہ میں جس وقت میں جو کام چاہوں انجام دوں لیکن یہ میرے بس میں ہرگز نہیں ہے کہ ہر کام کو ہر وقت میں سچی رغبت اور سچی توجہ سے انجام دے سکوں اس باب میں غزالی کہتے ہیں۔

"بعض اوقات نیت آسانی سے ہاتھ آجاتی ہے اور بعض اوقات مشکل سے جس شخص کے قلب میں دین ایک خاص اور ممتاز مقام رکھتا ہو اس کے لئے اچھے کاموں کی نیت

پیدا کر لینا چنداں دشوار نہیں کیونکہ قلب دین کی طرف بالجملہ مائل تو ہے ہی صرف بعض تفاصیل وجزئیات کی طرف اس کا راغب ومائل کرنا باقی ہے سو یہ داعیہ بھی تھوڑی سی محنت وتوجہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ہاں جس شخص کے قلب پر دنیا کا جادو چل گیا ہو اس کے لئے اچھے اعمال کی نیت پیدا کرنا واقعی مشکل ہے۔ یہ بے چارہ تو فرائض کو بھی نہایت دقت اور تکلیف اٹھانے کے بعد انجام دیتا ہے۔ کبھی جنت کی طمع اور کبھی جہنم کے خوف سے دل میں نیکی کا ایک خفیف سا داعیہ پیدا کر لیتا ہے سو اس کو اجر وثواب بھی اسی رغبت اور نیت کے برابر اور مساوی ملے گا۔

غزالی کی رائے کا خلاصہ وماحصل یہ ہے کہ انسان تمام اعمال وافعال کی جانب رُخ کرنے میں آزاد ہے اگرچہ یہ رُخ کرنا بھی حقیقت میں اللہ ہی کی مشیت اور ارادے کو پورا کرنے کے مرادف ہے لیکن چونکہ انسان کی نیت ہر وقت میں خالص نہیں ہو سکتی اس لئے نیت کو جنت کی ترغیب اور جہنم کی تخویف کے ذریعہ خالص وپاک بنانا چاہیے

آخر میں ہم یہ عرض کریں گے کہ غزالی نے اچھے اخلاق کے نشوونما کی ایک صورت یہ بھی بتائی ہے کہ انسان اچھے ماحول اور اچھی سوسائٹی میں رہے ظاہر ہے کہ ان کا یہ قول ضمناً اس بات کا اقرار واعتراف ہے کہ ماحول اور سوسائٹی کو انسان کے ارادے کے بعد اس کے ضعیف وقوی بنانے میں بہت بڑا دخل ہے۔ گو یہ بھی ایک گونہ جبر ہی ہی لیکن ہے معقول جبر۔

تیسری فصل

ضمیر

کسی عمل کی جزاء وسزا کی امید وخوف کے بغیر وہ آواز جو خود انسان کے قلب کی گہرائیوں سے اُٹھ کر اس کو خیر کی طرف قدم بڑھانے اور شر سے باز رہنے کی تلقین کرتی ہے ضمیر

کہلاتی ہے۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ غزالی کسی عمل کے حسن لذاتہ اور قبیح لذاتہ ہونے کے قائل نہیں ہیں ان کی رائے میں اعمال پر حسن اور قبح کی مہر لگانا شرع کا کام ہے اور شرعی احکام و تعلیمات چونکہ سماوی ہیں اس لئے ضمیر کے لئے کسی الگ اور مستقل باب کی ضرورت و گنجائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ضمائر کا لفظ جو غزالی کے کلام میں عموماً آتا ہے اس سے مراد مکنونات الصدر یا سرائر یعنی سینوں کے مخفی راز ہیں۔ کوئی شخص ان کی رائے میں ضمیر کی آواز پر کان دھرنے کا مکلف و مسئول اس لئے نہیں ہے کہ وہ بیچارہ تو ضمیر کے نام ہی سے آشنا نہیں، اگر مسئولیت ہے تو تنہا اللہ کی آواز پر کان دھرنے اور ظاہر و باطن میں اُسی سے ڈرتے رہنے کے متعلق ہے شرائع کے علاوہ خود انسان کے اندر کوئی ایسی طاقت و قوت نہیں جو اُس کو نیک و بد پر مطلع کرتی رہے۔ خیر و شر کے معاملہ میں ہدایت و بصیرت بخشنے والی ذات صرف اللہ کی ہے جو آنکھوں کی ہلکی سے ہلکی خیانت اور دلوں کے مخفی سے مخفی راز پر مطلع ہے اور انسان تنہا اللہ ہی کے خوف اور خشیت کے بارے میں مسئول و جوابدہ ہے۔

ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیئے کہ بعض اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے ضمیر کو نشوونما میں امداد ملتی ہے مثلاً جو شخص فلسفے کا مطالعہ کرے گا وہ بعض امور و جوانب کے بارے میں اپنے اندر ایک گونہ مسئولیت محسوس کرنے لگے گا۔ علم اخلاق کے کثرت مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان میں اپنے واجب اور اپنی ذمہ داری کا شعور و احساس بیدار ہونے لگتا ہے۔ جو شخص کسی خاص مذہب کا تبع و پیرو ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کے اندر ایک خاص قسم کا ذوق اور وجدان رہ رہ کر چٹکیں لیتا ہے

غالباً یہ قرار دینا غلط نہ ہوگا کہ غزالی ضمیر کی آخری قسم کے قائل ہیں گو انھوں نے اس امر کی صراحت کہیں نہیں کی لیکن ان کی تالیفات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ احیاء[1] میں کہتے ہیں:۔

---

[1] ج ۱ ص ۸۵

منجملہ یہ کہ انسان کو اپنے علوم میں اوراق و کتب اور دوسروں سے سنی سنائی باتوں کی تقلید سے زیادہ اعتماد اپنی بصیرت اور قلب و ذہن کی صفائی پر ہونا چاہیئے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کئی جگہ لائے ہیں (الاثم ما حاک فی صدرک وان افتوک وافتوک[1]) ظاہر ہے کہ یہ رائے اور یہ تخیل اُس اندرونی قوت کے اعتراف کے مرادف ہے جو حق و صواب کی راہ گم کر دینے پر انسان کی ہدایت اور رہنمائی کا موجب بنتی ہے لیکن یہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ غزالی کے نزدیک کتاب و سنت کی نص قطعی کے مقابلے میں ضمیر کی آواز کوئی معنی اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

ضمیر کے باب میں غزالی کی غفلت کا گلہ و شکوہ اس لئے نہیں کہ ضمیر فی ذاتہ کوئی حقیقت و وجود ہی نہیں رکھتا، اس کی ساری حقیقت، وضعی یا سماوی قوانین کی مرہون منت ہے چونکہ ہر قوم کے موروثی عقائد و تقالید مختلف ہیں اس لئے ہر قوم کے ضمیر کے تقاضے بھی مختلف ہوں گے مثلاً چوری کا جرم بعض اقوام میں خوبی اور بہادری کا کام سمجھا جاتا تھا۔ ان کے ہاں جس شخص میں چوری کی جرأت و ہمت نہ ہوتی اُسے عوام بھی حقیر نگاہوں سے دیکھتے تھے اور خود اُس کا ضمیر بھی اُسے ملامت کرتا تھا بعض بربری قبائل میں آج تک کسی مسافر کو لوٹ لینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی۔ ظاہر ہے کہ ان اقوام و قبائل کے ضمیر کے تقاضے دوسری مہذب اقوام کے ضمیر کے تقاضوں سے یکسر مختلف ہیں۔ ان عقل سوز حرکات کے ارتکاب کے وقت نہ ان کی قوم ان سے تعرض کرتی ہے نہ خود ان کا ضمیر انہیں ملامت اور تنبیہ کرتا ہے۔ بلکہ ایک ہی شخص کے ضمیر کے تقاضے سن و سال اور احوال و ظروف کے اختلاف سے قوت و ضعف میں مختلف ہو سکتے ہیں مثلاً تیس برس کی عمر میں ضمیر کا جو تقاضا ہوگا وہ بیس برس کی عمر کے تقاضے سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہوگا اسی لئے شاعر کہتا ہے۔ شعر

جب لوگ پوچھتے ہیں کہ تیس برس کے بعد بھی لہو و لعب کا کوئی وقت ہے؟ تو میں کہتا ہوں

---

[1] گناہ وہ ہے جو تمہارے سینے میں کانٹا بن کر کھٹکے گے چاہے لوگ کچھ کا کچھ کہیں

کیا تیس برس سے پہلے بھی کوئی وقت تھا؟"

دوسرا شاعر کہتا ہے۔ شعر

لڑکپن کا زمانہ جب تک رہا سو رہا لیکن جب سر پر بڑھاپے کی سفیدی چھانے لگی تو میں نے

باطل اور لہو ولعب سے کہا خدارا اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو"

میری رائے یہ ہے کہ ضمیر کا تخیل اگر واقعی کوئی عام تخیل ہے تو یقیناً اس کا سارا تعلق انسانی ہمدردی اور انسانی بہبودی سے ہے بایں معنیٰ کہ ضمیر ہی وہ قوت اور وہ جذبہ ہے جس کو کسی انسان کا دکھ درد دیکھ کر صدمہ اور ٹھیس لگتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس دکھ اور درد میں مبتلا انسان کا مشرب، مذہب اور وطن کیا ہے۔ کیونکہ انسانیت کا رشتہ باہم ایسا قوی اور مضبوط ہے کہ اس کو مذاہب کا فرق و اختلاف، زمانوں کی علیحدگی و جدائی، مرز و بوم کی تمیز و بعد مسافت، غرضیکہ کوئی ہاتھ بھی نہیں کاٹ سکتا۔

چوتھی فصل

اغراض اور نتائج

کیا کوئی عمل نتیجے کے اعتبار سے اچھا ہوتا ہے یا غرض اور مقصد کے اعتبار سے یا بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ کوئی عمل اس لئے اچھا ہے کہ میں نے اس سے اچھائی کا ارادہ کیا ہے یا اس لیئے کہ گو اس میں میرے ارادے کی اچھائی کو تو کوئی دخل نہیں لیکن اس کا نتیجہ ہی خود بخود اچھا نکلا؟

غزالی سے اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اعمال کے مختلف اقسام میں ان کی رائے معلوم کریں تاکہ عمل کے ہر نوع میں ان کی مستقل رائے معلوم کی جا سکے۔

غزالی انسانی اعمال کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں طاعات، معاصی، مباحات، طاعات صرف نیت یا جدید اصطلاح میں صرف غرض ہی کی وجہ سے خیر یا اچھی ہو سکتی ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

"عمل، حکم میں اپنے باعث و محرک کے تابع ہے اسی واسطے کہا گیا ہے اعمال کا سارا دارومدار نیات پر ہے[1] کیونکہ نیات متبوع اور عمل تابع ہے اور یہ مسلم ہے کہ تابع کا حکم بعینہٖ وہی ہوتا ہے جو متبوع کا ہو"

اس بنا پر غزالی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص روزہ اس لئے رکھے کہ اس سے پیٹ کا نظام درست ہو جاتا ہے۔ یا کوئی شخص غلام کو اس لئے آزاد کر دے کہ جب اپنی جان کے لالے پڑ رہے ہیں تو اسے کہاں سے کھلاؤں گا، یا کوئی شخص حج اس لئے کرے کہ سیر و تفریح اور آب ہوا کی تبدیلی سے صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا یا کوئی شخص جہاد میں حصہ اس لئے لے کہ اس سے سامان جنگ سے اطلاع و واقفیت بہم پہنچے گی تو ایسے اشخاص کی یہ ساری عبادتیں اکارت گئیں کیونکہ غزالی کی رائے میں نیت اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ تمام آلودگیوں اور آلائشوں سے بالکل خالص و پاک اور اللہ کی قربت کی موجب و سبب نہ بنے۔ وہ اس سے انکار نہیں کرتے کہ کسی عبادت کے محرک اصلی کے ساتھ کوئی دوسرا محرک بھی جمع ہو جائے جسے یہ اپنی اصطلاح میں باعثِ نفسی کہتے ہیں۔ صرف شرط یہ ہے کہ باعثِ نفسی باعثِ اصلی کی نسبت کمزور ہو اگر دونوں باعث مساوی اور برابر ہو جائیں تو عمل کا کرنا اور نہ کرنا برابر ہوگا۔ اگر باعثِ نفسی باعثِ اصلی پر غالب آجائے تو یہ عمل بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر اور موجبِ عذاب ہوگا۔

غزالی نصیحت کرتے ہیں کہ عمل شروع کرنے سے قبل اس امر کا اچھی طرح جائزہ لے لینا چاہئے کہ کون سا باعث و محرک قوی و غالب اور کون سا کمزور و مغلوب ہے۔ کون سا حصہ اس میں زیادہ ہے۔ شیطان کا حصہ یا اللہ کا حصہ، لیکن پھر کہتے ہیں:۔

"اس کے باوجود ریاء وغیرہ کے خوف سے عمل کو ترک نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ شیطان کی عین آرزو ہے۔"

---

[1] انما الاعمال بالنیات

گو مقصود یہی ہے کہ خلوص نیت کا دامن ہاتھ سے نہ جائے لیکن جب نیت کے ساتھ عمل کی دولت بھی ہاتھ سے جاتی رہی تو اب ایک نہیں دو نقصان جمع ہو گئے"۔

غزالی کا پہلے یہ کہنا کہ جس عمل میں محرک نفسی غالب اور محرک اصلی مغلوب ہو وہ عمل مضر اور موجبِ عقاب ہوتا ہے اور اب یہ کہنا کہ ریا، وغیرہ کے خوف سے عمل کو ترک نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ شیطان کی عین آرزو ہے۔ یہ دونوں قول باہم متناقض ہیں کیونکہ جو عمل مضر اور موجب عقاب ہو اس کا ترک شیطان کی عین آرزو کیسے ہو سکتا ہے؟ مناسب یہ تھا کہ غزالی پہلے عمل کی ذات اور عامل کی غرض کے مابین فرق کرتے کیونکہ خواہ غرض بُری کیوں نہ ہو اچھا عمل اپنی ذات میں اچھا ہی رہے گا۔ اس تمام بحث کے لئے مفروضہ یہ ہے کہ ہم اُن اعمال سے بحث کر رہے ہیں جو شرع کی اصطلاح میں طاعات کہلاتے ہیں اور جب طاعات نفس الامر اور واقع میں سراپا خیر اور نافع و مفید ہیں تو صرف نیت کے بدل جانے سے ان کی حقیقت و ماہیت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

غزالی نے اجتماعی اور انفرادی اعمال میں کوئی فرق نہیں کیا لیکن یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ بعض اعمال ایسے ہیں جن سے تنہا کسی ایک ہی ذات اور کسی ایک ہی فرد کو فائدہ پہنچتا ہے مثلاً عبادات۔ بعض اعمال ایسے ہیں جن کی برکات سے پورا اجتماع اور پورا معاشرہ بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اجتماعی اعمال میں نیت اور غرض کتنی ہی بُری کیوں نہ ہو پھر بھی غزالی ان سے منع نہیں کرتے کیونکہ ان سے کم سے کم اتنا تو فائدہ ضرور ہو گا کہ نفس کو اچھے اعمال کی عادت اور مشق ہو جائے گی۔ غزالی کئی جگہ تصریح کرتے ہیں کہ بتکلف کسی عادت و خلق کو اپنانا اس بات کا موجب ہوتا ہے کہ یہی عادت اور خلق ایک دن طبیعت کا جزو بن جائے۔ معلوم ہوا کہ جب کوئی عمل جمہور و عوام کے لئے مفید ہو تو اس کی طرف دعوت دینے میں کوئی مضائقہ اور کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ عامل کے لئے حسن نیت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اگر چاہے تو کسی وقت بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

معاصی چونکہ ہر حال میں بُرے ہیں اس لئے غزالی ان میں نتائج کا اعتبار کرتے ہیں جو شخص جہالت
کی وجہ سے شر کا ارتکاب کرے وہ بھی گنہگار رہے اور اس کا کوئی عذر بغیر اس کے مسموع نہیں کہ وہ
تازہ تازہ اسلام لایا ہو اور اسے شرعی احکام کا علم حاصل کرنے کا ابھی موقع ہی نہ ملا ہو، ظاہر ہے کہ اس قسم
کے اتفاقات بہت کم اور بہت محدود ہوں گے۔ یہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ غزالی کی رائے میں
معصیت، شر اس لئے ہے کہ وہ مضر ہے اور معصیت کا مرتکب گنہگار ہے، خواہ وہ اس گناہ کی وجہ
اور سبب سے غافل ہی کیوں نہ ہو تو انجام کار فیصلہ یہی قرار پایا کہ یہاں اعتبار نتائج کا ہے اغراض
کا نہیں بخلاف طاعات کے کہ وہ بعض اوقات نیت کی تھوڑی سی خرابی سے معاصی میں بدل جاسکتے
ہیں مثلاً کوئی شخص علم اس لئے حاصل کرتا ہے کہ تاکہ لوگوں کے قلوب اس کی طرف مائل ہوں[۱]۔

پانچویں فصل

وسائل اور مقاصد

جب غایت و مقصد شریف اور عمدہ ہو تو ضروری نہیں کہ اس کے لئے ہمیشہ ذریعہ اور وسیلہ
بھی جائز اور عمدہ ہو بلکہ بعض اوقات مقصد کی شرافت و عمدگی کی وجہ سے ناجائز اور غیر مستحسن وسیلہ
بھی جائز اور مستحسن ہو جاتا ہے۔ جن مقامات میں غزالی نے جھوٹ کے جواز کا ذکر کیا ہے وہاں اس مسئلے
کو بھی کمال وضاحت و تفصیل سے بیان کیا ہے، کہتے ہیں:۔

> "مختلف مقاصد تک پہنچنے کے لئے کلام ایک ذریعہ و وسیلہ ہے۔ جس جائز و عمدہ مقصد تک سچ
> اور جھوٹ دونوں کی راہوں سے پہنچنا ممکن ہو، وہاں سچ سے کام لینا ضروری اور جھوٹ سے
> کام لینا حرام ہے۔ جس مقصد تک صرف جھوٹ ہی کے توسط سے رسائی ممکن ہو وہاں اگر مقصد

---

[۱] تو گو علم کی تحصیل فی نفسہ طاعت اور خیر ہے لیکن طالب العلم کی نیت چونکہ خالص نہیں اس لئے یہ طاعت بھی معصیت
میں تبدیل ہو جائے گی۔ مترجم

مباح ہے تو جھوٹ بولنا بھی مباح، اگر مقصد واجب ہے تو اس کے سلسلے میں جھوٹ بولنا بھی واجب ہے، مثلاً کوئی مسلمان کسی ظالم وسفاک سے بھاگ کر کہیں روپوش ہو گیا اور ہمیں اُس کا پتہ ونشان معلوم ہے لیکن چونکہ مسلمان کی جان کا بچانا واجب ہے اس لئے اس موقع پر لاعلمی کا اظہار بھی واجب اور ضروری ہے۔ جنگی مقصد، اصلاح ذات البین، مظلوم کی دلجوئی اور دلہی جب بغیر جھوٹ کے ممکن نہ ہو تو ایسے موقعوں پر جھوٹ سے کام لینا بھی مباح ہے[۱]

تین مقامات صلح، جنگ اور بیوی سے گفتگو میں جھوٹ کا جواز بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:۔

ان تین مقامات میں صراحتاً استثنا وارد ہے۔ ان کے علاوہ جہاں اپنا یا کسی اور کا جائز اور صحیح مقصد ہو وہاں بھی بعینہ یہی حکم ہے[۲]۔

اس کے بعد مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی ہیں۔

(۱) کسی شخص کو کوئی ظالم پکڑ کر مال و دولت کے متعلق سوال کرے تو اُس کے لئے مکر جانا جائز ہے

(۲) جب بادشاہ کسی سے ایسے گناہ کے متعلق دریافت کرے جس کا ارتکاب اُس نے اللہ اور اپنے مابین کیا تھا تو اُس جرم سے برائت کے لئے اُس کا انکار کر دینا جائز ہے کیونکہ جھوٹ سچ ہر طرح سے اپنی جان، مال اور آبرو کی حفاظت لازمی اور ضروری ہے۔

(۳) اپنی مختلف بیویوں میں صلح وصفائی باقی رکھنے کی خاطر ہر ایک سے یہ کہنا کہ سب میں تم ہی مجھے زیادہ عزیز ہو جائز ومستحسن ہے۔

چونکہ غزالی اس مسئلے کی نزاکت واہمیت سے پوری طرح واقف وباخبر تھے اس لئے تصریح کر دی ہے کہ جھوٹ کے جواز کے لئے صرف یہی دیکھنا کافی نہیں ہے کہ اس سے فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ساتھ ہی اس امر پر بھی نگاہ کرنا ضروری ہے کہ یہ فائدہ سچ کے فائدے کی نسبت زیادہ قوی اور غالب ہے یا نہیں ورنہ بصورت دیگر سچ ہی کو ترجیح اور فوقیت دی جائے گی غور فرمایئے کہتے ہیں:۔

---

[۱] احیاء ج ۳ ص ۱۳۹ [۲] ج ۳ ص ۱۴۱

معیار اس میں یہ ہے کہ جھوٹ ممنوع اور قبیح ہے۔ اب انسان کو اچھی طرح موازنہ کر لینا چاہئے کہ اگر سچ سے کام لے گا تو اس سے اتنی بڑی قباحت لازم آئے گی کہ اس کے مقابلہ میں جھوٹ کی شرعی قباحت ہیچ ہے تو اس حالت میں جھوٹ سے کام لینا روا اور جائز ہے۔ اگر مقصود شرعی کے مقابلہ میں وہ مقصود جو جھوٹ بول کر حاصل کیا جا رہا ہے حقیر اور ہیچ ہے تو اس صورت میں سچ سے کام لینا واجب ہے۔ بعض اوقات انسان اس راجح اور مرجوح میں کوئی فرق نہیں کر سکتا کیونکہ دونوں پلڑے برابر ہوتے ہیں تو اس حالت میں بھی سچ ہی کو اختیار کرنا اولیٰ اور احسن ہے، کیونکہ جھوٹ صرف اشد شدید حاجت وضرورت کے لئے مباح ہے۔ پس اگر اس ضرورت کی اہمیت میں تھوڑا سا بھی شک اور شبہ آگیا تو وہاں جھوٹ حرام اور ممنوع قرار پائے گا۔[۱]

یہ ساری احتیاط صرف اپنے ذاتی اغراض ومقاصد کے لئے ہے لہٰذا کذب بیانی میں اگر اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو بلکہ اس سے مقصود صرف دوسرے کی فائدہ رسانی ہو تو اس حالت میں کچھ ایسی زیادہ احتیاط درکار نہیں ہے۔ غزالی کی یہ رائے واقعی بڑی ہی دور اندیشی پر مبنی ہے۔

معاصی میں تشدید اور فضائل اعمال میں اپنی طرف سے احادیث گھڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینا اس دروغ مصلحت آمیز سے بالکل خارج اور مستثنیٰ ہے کیونکہ احادیث کا وضع کرنا اُن کبائر معاصی میں سے ہے جن کو کسی غرض اور کسی مصلحت کے لئے بھی جائز ومباح نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

وضع قصص

موقعہ کی رعایت ومناسبت سے اتنا اور بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غزالی احیاء العلوم[۲] میں کہتے ہیں:۔

بعض لوگ فضائل وطاعات کی جانب مائل وراغب کرنے والی حکایات کے گھڑ لینے میں کوئی مضائقہ اور کوئی قباحت نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ اس سے ہمارا مقصود صرف دعوت الی الحق ہے۔"

---

[۱] احیاء، ج ۳ ص ۱۴۱ [۲] ج ۱ ص ۱۳۰

غزالی کہتے ہیں :-

"یہ شیطانی فریب اور شیطانی وسوسہ ہے کیونکہ دعوتِ الی الحق کے لئے اتنا بڑا سچا اور کھرا مواد موجود ہے کہ اس کے پیش نظر ادنیٰ سے ادنیٰ جھوٹ کی بھی کوئی گنجائش اور کوئی ضرورت نہیں نکل سکتی۔"

لیکن غزالی کا یہ فیصلہ زیادتی پر مبنی ہے کیونکہ قصص وحکایات کی وضع و تالیف اگر واقع میں کوئی قابل مواخذہ جرم ہے تو غزالی سب سے پہلے اس کے لئے قابل مواخذہ ہیں۔ انبیاء و صالحین کے بعض ایسے ایسے بے سر وپا واقعات انھوں نے اپنی تالیفات میں درج کئے ہیں کہ جن کی صحت پر معمولی سے معمولی دلیل بھی قائم نہیں کی جا سکتی، اور آپ واقف ہیں کہ جھوٹی حکایات کی روایات ان کی وضع و تالیف سے کسی صورت بھی کم خطرناک نہیں ہے۔

کسی بڑے مقصد کے لئے جس طرح جھوٹ بولنا جائز ہے اسی طرح غیبت کرنا بھی جائز ہے غزالی نے مندرجہ ذیل مقامات میں غیبت کو جائز قرار دیا ہے۔

(۱) فریاد رسی۔ جو شخص کسی حاکم یا قاضی کو ظلم، خیانت اور رشوت ستانی وغیرہ کے ساتھ متہم کرتا ہے وہ یقیناً اس بدگوئی اور غیبت کے لئے گنہگار اور مجرم ہے لیکن جس پر قاضی نے ظلم کیا ہو، اس کے لئے جائز ہے کہ دادخواہی کے لئے اس قاضی کے خلاف بادشاہ کی عدالت میں نالش کرے۔ اور میں حیران ہوں کہ ظالموں کی عزتیں اور منصب غارت کیوں نہیں ہو جاتے۔

(۲) جب مقصود کسی بری بات کا دور کرنا اور گنہگار کو نیکی اور طاعت کی راہ پر لانا ہو۔

(۳) استفتاء۔ مثلاً کوئی شخص مفتی سے کہے "میرے باپ، یا میری بیوی، یا میرے بھائی نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ میں اس ظلم سے کیسے نجات حاصل کروں گا۔" گو بہتر یہاں بھی یہی ہے کہ تعریض اور اشارے سے کام لیا جائے لیکن چونکہ عذر معقول ہے اس لئے کسی معین اور خاص شخص کا نام لینا بھی مباح ہے۔

(۴) کسی مسلمان کو شر سے واقف و آگاہ کرنا مقصود ہو۔ مثلاً آپ کسی عالم و فقیہ کو کسی فاسق و فاجر اور مبتدع کے پاس روز آتا جاتا دیکھتے ہیں اور خائف ہیں کہ کہیں اس کی بدعت و فسق کا یہ

عالم بھی شکار نہ ہو جائے تو آپ کے لئے جائز ہے کہ اُس عالم کے سامنے اُس کی بدعت اور فسق کا اظہار کر دیں مگر شرط یہ ہے کہ اس اظہار کا محرک صرف مذکورہ بالا خطرہ ہی ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ حسد اور رشک کی وجہ سے اس حرکت کا ارتکاب کر بیٹھیں۔

(۵) جس کی غیبت کی جا رہی ہے وہ برملا فسق اور فجور کا ارتکاب کرتا ہو اور اس کے چرچے میں کوئی باک اور کوئی عار محسوس نہ کرتا ہو۔

اس مقام پر غزالی نے کمالِ احتیاط اور کمال دور اندیشی سے کام لیا ہے کہتے ہیں :-

"فاسق و بدعمل کی صرف اُسی بدعملی اور فسق کا اظہار جائز ہے جس کا ارتکاب وہ علی الاعلان اور برملا کرتا ہو۔ مثلاً ایک شخص شراب تو برملا پیتا ہے لیکن یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اس کے زنا کا راز کسی کے سامنے کھلے اس حالت میں اُس کی شراب نوشی کے ذکر میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کے زنا کا ذکر ہر حالت میں ناجائز اور ممنوع ہے۔"

غرض اور مقصد کی شرافت و عمدگی کے پیشِ نظر جھوٹ اور غیبت کی طرح کسی کے خلاف چغلی کھانا بھی جائز ہے جس چغلی سے مقصود کسی مسلمان کا فائدہ یا کسی گناہ اور معصیت کا ازالہ ہو اس میں کوئی حرج نہیں مثلاً ایک شخص کسی کو دیکھتا ہے کہ وہ کسی غیر کے مال و دولت پر ہاتھ صاف کر رہا ہے تو دیکھنے والے کا فرض ہے کہ اُس لٹیرے کے خلاف شہادت دے تاکہ جس کا مال ضائع ہوا ہے اُسے بھی فائدہ پہنچے اور یہ لٹیرا بھی قرار واقعی سزا پانے کی وجہ سے اس معصیت سے باز آئے اس مثال میں گو چغلی کھانا ظالم کے باب میں ضرر اور نقصان کا موجب ہے لیکن مظلوم کے باب میں فائدہ اور نفع کا موجب ہے اور ظاہر ہے کہ ظالم کی نسبت مظلوم زیادہ امداد اور اعانت کا مستحق ہے بلکہ غور کیجئے تو یہ چغلی ظالم کے معاملے میں بھی حال و مآل دونوں کے اعتبار سے مفید ہے بشرطیکہ وہ اس معصیت سے باز آنے کے لئے آمادہ اور مستعد ہو۔

چھٹا باب

اخلاق

تمہید

اخلاق کا لفظ غزالی سے پہلے بھی موجود تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مکارم الاخلاق[1] یونانی لٹریچر کے جس حصے سے عربوں کو واقفیت ہوئی اس میں ارسطو کی کتاب الاخلاق بھی تھی۔ ابن مسکویہ نے فن اخلاق میں ایک کتاب تصنیف کی جس میں اخلاق کا تصور اکثر و بیشتر وہی پیش کیا جو فلاسفۂ یونان اور اُن کے متبعین مسلم فلاسفہ پیش کیا کرتے تھے۔

سب سے پہلے ہمیں اس امر کی جانب متوجہ ہونا چاہیے کہ غزالی کے ہاں اخلاق کا تصور ہے کیا؟ میں ان کی تالیفات کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کے نزدیک اخلاق کا تصور مجددینِ فلسفۂ یونان کے تصور سے یکسر مغائر اور مختلف ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کے مبیّنہ احکام و تعلیمات اور صوفیہ اور ان کے ہم مشرب فقہاء کی قرار دادہ آراء کے مطابق سیر و سلوک کے مختلف طرق کی شرح و تفسیر ان کے نزدیک علم الاخلاق کہلاتی ہے۔ علم اخلاق کو غزالی اپنی تالیفات میں کئی ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ مثلاً علم طریقِ آخرت، علمِ صفاتِ قلب، اسرارِ معاملاتِ دین اور

[1] عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لئے میں مبعوث ہوا ہوں۔

اخلاقِ ابرار، جو ان کی ایک کتاب کا نام بھی ہے۔ اخلاق کے بارے میں سب سے اہم کتاب کا نام انھوں نے احیاء علوم الدین رکھا تو گویا غزالی کے نزدیک نفس کو شریعت اسلامیہ کے ساختہ پرداختہ قالب میں ڈھالنا اور انبیاء، صدیقین، شہداء، صوفیہ اور دوسرے علمائے اسلام کے نقش قدم کی طرف نفس کو مائل و راغب کرنے کا نام علم اخلاق ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں ابن مسکویہ مختلف مسائل میں ارسطو اور جالینوس کے کلام کو بطور سند و دلیل پیش کرتے اور رواقی حکماء کے اقوال و آراء کو نقل کرتے ہیں وہاں غزالی مختلف مسائل میں ابن ادھم، تستری، محاسبی اور دیگر صوفیہ کے کلام کو بطور استشہاد لاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے آثار و مرویات کو بھی درج کر دیتے ہیں۔

خُلق کی تعریف

حسنِ خلق کی تعریف میں غزالی کہتے ہیں

"قوتِ تفکر، قوتِ شہوت اور قوتِ غضب کی اصلاح و اعتدال کا نام حسن خلق ہے[1]۔"

دوسری جگہ کہتے ہیں:

"اُن افعال کا کرنا جو عموماً طبیعت کے خلاف ہوتے ہیں حسن خلق کہلاتا ہے[2]۔"

اور اس کی تائید میں حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشھوات[3] کی حدیث اور عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم[4] کی آیت پیش کی ہے۔ ایک اور مقام میں کہتے ہیں

"حسن خلق اس کا نام ہے کہ وہ تمام بری عادتیں ترک کر دی جائیں جن کی تفصیلات شرع نے بیان کر دی ہیں اور ان سے ایسا ہی پرہیز کیا جائے جیسا کہ عام نجاستوں سے کیا جاتا ہے اور ان کے مقابلے میں تمام اچھی عادتوں کو اس طرح اپنا لیا جائے کہ طبیعت ان کی طرف ایک گونہ

---

[1] میزان ص ۵۶ [2] ص ۶۴

[3] وہ اعمال جو انسان کو عموماً بار گزرتے ہیں اُن میں جنت اور جو عمدہ اور لذیذ معلوم ہوتے ہیں اُن میں جہنم گھری ہوئی ہے

[4] بعید نہیں کہ جس چیز کو تم برا سمجھتے ہو وہ حقیقت میں تمہارے لئے اچھی اور جس کو تم اچھا سمجھتے ہو وہ حقیقت میں تمہارے لئے بری نکلے۔

کشش اور شوق محسوس کرنے لگے اور تمام بری عادتوں سے نفور ہو کر ہر وقت ان ہی کے درپے ترجیح رہنے میں خوشی اور تسکین پائے۔[1]

یہ مبہم تعریفات کہ جن سے خلق کی کسی منطقی تعریف کا کام نہیں لیا جا سکتا، صرف اس لئے ذکر کر دی گئی ہیں تاکہ ان سے خطابیات کی طرف غزالی کے میلان کا اندازہ کیا جا سکے کیونکہ بعض اوقات غزالی کی اخلاقی تالیفات کا کوئی صفحہ بھی ان سے خالی نہیں ہوتا۔

احیاء العلوم میں ایک جگہ غزالی نے خلق کی بڑی عمدہ اور دقیق تعریف کی ہے کہتے ہیں:۔

خلق نفس کی اس ہیئت راسخہ کا نام ہے جس سے تمام افعال بلا تکلف صادر ہوں، اگر یہ افعال عقلاً اور شرعاً عمدہ اور قابل تعریف ہوں تو اس ہیئت کو خلق نیک اور اگر برے اور قابل مذمت ہوں تو اس ہیئت کو خلق بد کہتے ہیں۔[2]

آخر میں بتایا ہے کہ اچھے یا برے کام کرنا یا اچھے اور برے کاموں پر قدرت رکھنا یا اچھے اور برے کاموں میں تمیز کر لینا خلق نہیں کہلاتا بلکہ خلق اس ہیئت کا نام ہے جس کی وجہ سے نفس کسی کام کو کرنے یا اس سے باز رہنے کے لئے اپنے آپ کو مستعد اور آمادہ کر لیتا ہے تو گویا نفس کی ہیئت و صورت باطنی ہی کا نام خلق ہے

پہلی فصل

خلق کا نشو ونما

انسانی فطرت کے باب میں غزالی کی کوئی مخصوص رائے نہیں ہے۔ کبھی تو وہ اس کو ایسا سادہ اور بے رنگ سمجھتے ہیں کہ ہر صورت و نقش کو قبول کرنے کے لئے صالح و مستعد ہے۔ مگر کبھی کہتے ہیں نہیں، شر کی نسبت خیر کی جانب اس کا میلان زیادہ ہے۔ مثلاً ایک مقام پر کہتے ہیں:۔

---

[1] میزان ص ۴۷

[2] احیاء ج ۳ ص ۵۱

"جب نفس عادت اور مشق کی وجہ سے باطل اور مذموم افعال کی طرف مائل اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے تو بھلا جب اس کا رُخ حق کی جانب پھیر کر اُس پر مداومت و مواظبت کی جائے تو اُس کی طرف کیوں مائل نہ ہوگا؟ بلکہ مذموم اعمال کی جانب نفس کی کشش اور میلان انسانی فطرت و طبیعت کے خلاف ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے بعض لوگوں کو آہستہ آہستہ مٹی کھانے کی عادت ہو جاتی ہے مگر اس کے برعکس حکمت، اللہ کی محبت، اور اس کی عبادت و معرفت کی طرف نفس کی کشش ایسی ہے جس طرح کھانے اور پینے کی طرف، کیونکہ یہ فطرت و طبیعت کے عین مطابق اور قلب کی عین آرزو ہے اور قلب کیا ہے ایک الٰہی امر ہے جس کا مقتضیاتِ شہوت کی طرف میلان اُس کی حدِ ذات سے خارج اور اس پر عارض و طاری ہے۔[1]

ہم غزالی سے اس رائے میں الجھا نہیں چاہتے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ خیر کی طرف نفس کی کشش کی طرح شر کی طرف کشش بھی انسانی فطرت کا ایک جز ہے اور مقتضیاتِ شہوت کی طرف رجحان بھی تقریباً کھانے اور پینے کے رجحان سے ملتا جلتا ہے۔ جس طرح کے احوال و ظروف سے سامنا ہو فطرتِ انسانی اسی طرح کے اعمال کے لئے نفس کو استعمال کرتی ہے۔ جیسے انسان ہر وقت کھانے اور پینے کی خواہش نہیں رکھتا اسی طرح ہر وقت نیک یا بد ہونے کی خواہش بھی نہیں رکھتا جب شر کا موجب و سبب پایا جائے تو اس کا میلان شر کی طرف اور جب خیر کا موجب و سبب پایا جائے تو اس کا میلان خیر کی طرف ہو جاتا ہے بلکہ یہ اسباب و موجبات بعض اوقات ایسے قوی ہو جاتے ہیں کہ نیک کو بد اور بد کو نیک ہوتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ اگر خیر و شر دونوں کی استعداد فطرت میں موجود نہ ہوتی تو ہمیں اخلاقی تربیت کا کوئی احتیاج بھی نہ ہوتا۔

کسی خُلق کا نشوونما کیونکر ممکن ہے؟

غزالی کی رائے ہے کہ بعض لوگ فطرتاً ایسے خوش خُلق ہوتے ہیں کہ انھیں کسی تعلیم و تادیب

---

[1] احیاء ج ۳ ص ۶۳

کی مطلقاً ضرورت ہی نہیں ہوتی جیسے حضرت عیسیٰؑ، حضرت ذکریا، اور دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام، کیونکہ یہ امکان سے خارج نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کی طبیعت و فطرت ہی میں بعض چیزیں ایسی موجود ہوں، جو دوسروں کو تحصیل و اکتساب کے بعد حاصل ہوتی ہوں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ سخاوت، جرأت اور سچ کے نام سے بعد میں واقف ہوتا ہے لیکن سخی، جری، اور سچا پہلے ہوتا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ یہ چیزیں اُس کی خلقت اور جبلت میں موجود تھیں۔

انبیاء تعلیم و تادیب کے محتاج ہوتے ہیں یا نہیں؟ ہم غزالی پر اس بحث میں کوئی حرف گیری کرنا نہیں چاہتے صرف اتنا ذکر کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تبلیغِ رسالت کے علاوہ باقی تمام امور میں انبیاء کی عصمت کا مسئلہ ہمیشہ علما کا موضوعِ بحث اور مختلف فیہ رہا ہے۔ خود قرآنِ حکیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گذشتہ اور آئندہ گناہوں کی مغفرت پر کئی شواہد اور دلائل موجود ہیں۔

غزالی کی رائے میں کسی خلق کے نشو و نما کا طریق تخلّق (بہ تکلف کسی خلق کا اپنا لینا) ہے یعنی مطلوبہ خلق جن اعمال کا متقاضی ہے ان کا نفس کو عادی بنایا جائے۔ مثلاً جو شخص سخاوت کا خلق پیدا کرنا چاہتا ہے اُس کا فرض ہے کہ بہ تکلف سخاوت سے کام لے کر دولت کو صرف کرے تاآنکہ یہ بات اُس کی طبیعت کا جزو بن جائے۔

مکارمِ اخلاق میں سے کسی بھی خلق کو پیدا کرنے کے لئے غزالی ریاضت اور مشق پر بہت زور دیتے ہیں اُن کی رائے میں کسی خلق کو بہ تکلف اپنانے پر آخر اُس کا جزوِ طبیعت بن جانا اُس عجیب و غریب تعلق کا مظہر ہے، جو قلب اور ظاہری اعضاء و جوارح کے درمیان موجود ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:-

"جو صفت بھی قلب میں ظاہر ہوگی لامحالہ اُس کا اثر اعضاء و جوارح پر ہوگا بایں معنیٰ کہ گویا تمام اعضا اپنی حرکت میں قلب کے فیصلے کے منتظر رہتے ہیں۔ اسی طرح جو فعل اعضا سے سرزد ہوگا اُس کا کچھ نہ کچھ اثر قلب پر ضرور پڑے گا۔ قلب اور اعضا کا یہ باہمی تعلق ایک مثال سے واضح ہوگا۔ فرض کیجیے ایک شخص چاہتا ہے کہ کتابت میں مہارت اُس کے نفس کی صفت اور طبیعت کا جزو بن جائے تو اُس کی صورت یہی ہے کہ وہ ایک ماہر کاتب کی طرح اپنے

ہاتھ کے ساتھ کتابت کی مشق کرے اور ایک طویل عرصہ تک خوبصورت خط کی نقل و محاکات سے کام لے کر ایک ماہر کاتب کے ساتھ بتکلف مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اس مشق پر اتنی مواظبت اور مداومت کرے کہ کتابت اس کے نفس کی صفت راسخہ بن جائے اور جو چیز ابتدا میں بتکلف صادر ہوتی تھی اب بلاتکلف صادر ہونے لگے ظاہر ہے کہ خوشنویسی کی مشق ہی نے اس شخص کو خوش نویس بنایا لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ یہ عمل ابتدا میں تکلف سے خالی نہ تھا۔ اب چونکہ ہاتھ کی مشق کا اثر دل پر اور دل کا اثر ہاتھ پر ہوتا ہے تو یہ خوش خطی اس کی طبیعت کا جزو بن گئی اسی طرح جو شخص فقیہ بننا چاہتا ہے اس کا فرض ہے فقہا کے اعمال اختیار کرے کیونکہ یہ فقہ کے اعادے اور تکرار کے مرادف ہے آخر وہ دیکھے گا کہ اس طریق کار کا اثر قلب پر نہایت عمدہ اور خوشگوار ہوتا ہے اور فقہ اس کی طبیعت کا جزو بن گئی ہے۔

یہیں سے غزالی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تنہا کسی ایک کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے کوئی شخص دائمی اور ابدی عذاب کا مستحق نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک کسی عمل کا بار بار اعادہ اور تکرار نہ کیا جائے وہ عمل نفس کی صفت نہیں بنتا اور دائمی بدبختی اور عذاب کا مطلب یہ ہے کہ کوئی قباحت کسی انسان کے قلب پر مستولی ہو کر اس کی طبیعت کا جزو بن گئی ہے۔

دوسری فصل

کسی خلق کے بدلنے کا امکان

گذشتہ فصل کے ساتھ اس فصل کا ربط و تعلق واضح و ظاہر ہے کیونکہ کسی اچھے خلق کا نشو و نما اس امر پر موقوف ہے کہ اس سے پہلے بُرے خلق کو بکلی زائل کر دیا جائے۔ اخلاق کا بدل جانا غزالی کے نزدیک ممکن ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی

حَسِّنُوا اَخْلَاقَکُم کی شرح میں کہتے ہیں :۔

اگر اخلاق کا بہتر بنانا ممکن نہ ہوتا تو آپ تحسین اخلاق کی تلقین ہی نہ فرماتے اگر اخلاق کا بدل جانا محال اور ممتنع ہوتا تو تمام مواعظ اور وصایا باطل اور بیکار ہو جاتے اور ترغیب و ترہیب کا سارا نظام بالکل درہم برہم ہو جاتا کیونکہ تمام اعمال و افعال اسی طرح اخلاق کا نتیجہ ہیں جس طرح کسی بوجھل اور وزنی چیز کا نیچے کی طرف گرنا ثقل طبعی کا نتیجہ ہے۔ جب جانوروں اور جنگل کے وحشیوں تک کو اپنے ساتھ مانوس کر لینا ممکن ہے۔ جب بڑے سے بڑے منہ زور اور سرکش گھوڑے کو سدھا کر تابعِ فرمان بنا لینا کچھ مشکل نہیں تو انسان جس پر عقل و شعور کا استیلاء اور تسلط مسلم ہے اُس کی تہذیب و تربیت سے کس کو مجال انکار ہو سکتی ہے ؟

معلوم ہوتا ہے کہ غزالی اُن لوگوں سے واقف تھے جو خَلق[۵۲] کی طرح خُلق کو بھی اس لئے ناقابل تغیر سمجھتے تھے کہ اس سے اللہ کی مخلوق میں ایک گونہ تغییر کی بو آتی ہے۔ چنانچہ غزالی کہتے ہیں :۔

" اللہ کی مخلوق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں، جیسے آسمان اور ستارے دوسری وہ جس میں بشرطِ تربیت بعد کے کمال کے لئے قوت و استعداد موجود ہے اور یہ تربیت ہماری قدرت اور ہمارے اختیار میں ہے۔ مثلاً کھجور کی گٹھلی کہ ہم اسے سیب کہہ سکتے ہیں نہ کھجور فرق صرف یہ ہے کہ اس میں سیب کا پودا بننے کی صلاحیت بالکل مفقود ہے لیکن کھجور کا تنا ور درخت بننے کی قوت و استعداد بدرجۂ اتم موجود ہے بشرطیکہ اس کی نشوونما اور تربیت کی طرف خاص توجہ کی جائے "

آخر میں کہتے ہیں :۔

" اس لئے اگر ہم چاہیں کہ اس عالم میں رہ کر غضب اور شہوت کی قوت کو اپنے سے باہر نوچ پھینکیں تو یہ ناممکن ہے ہاں البتہ ریاضت اور مجاہدے کے ساتھ ان کی اصلاح اور اعتدال ہمارے بس میں ہے "

---

[۵۱] اپنے اخلاق کو عمدہ اور بہتر بناؤ۔

[۵۲] ظاہری شکل و صورت

طبائع کے مختلف اقسام

اس کے بعد غزالی نے وجود میں اولیت اور سبقت کے لحاظ سے جبلتوں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ سریعۃ القبول اور بطیئۃ القبول کسی خلق و عادت کے بدل دینے کے اعتبار سے انسانوں کے چار مراتب بیان کئے ہیں۔ (اول) وہ غافل انسان جو حق و باطل اور کھرے کھوٹے میں تمیز ہی نہیں کر سکتا تمام قسموں میں یہی سب سے زیادہ قابل علاج ہے کیونکہ اس کو صرف رہنما یا کوئی ایسا ہی دوسرا باعث و سبب درکار ہے۔ جو اس کو تقلید و اتباع پر آمادہ کر دے۔ دوم وہ جو بدعملی کی برائی اور قباحت کو تو خوب سمجھتا ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو نیک عملی کا عادی اور خوگر نہیں بنایا۔ اس کی بدعملی ہی مزین و آراستہ صورت میں ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرتی ہے وہ اپنی حسن رائے سے منہ پھیر کر خواہش نفسانی کے تقاضوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا پھرتا ہے۔ چونکہ اس کا مرض سخت اور قوی ہے اس لئے اس کا علاج بھی پہلے شخص کی نسبت قدرے مشکل اور دشوار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ان بے ہودگیوں سے نجات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے اور آہستہ آہستہ نفس کا رخ نیک عملی اور صلاح کی طرف پھیرتا رہے۔ سوم وہ جو بدی ہی کو حق و صواب سمجھے۔ غزالی کی رائے ہے کہ ایسے انسان کی اصلاح شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی جہالت اور گمراہی کی جڑیں دل کی زمین میں بہت گہری اور پختہ ہیں۔ چہارم وہ جس نے بداعتقادی اور بدعملی کے ماحول میں جنم لینے کے بعد ظلم و فساد ہی میں اپنی سلامتی اور عافیت سمجھی اور دوسروں کے قتل و غارت ہی کو مایۂ فخر و امتیاز اور موجب ازدیاد مرتبت سمجھا، غزالی کہتے ہیں یہ شخص نہایت کٹھن مرحلے سے دوچار ہے اور ایسوں ہی کے متعلق کہا گیا ہے۔

> بھیڑیئے کو مؤدب بنانے کی خاطر تربیت کرنا اور حبشی کو سفید بنانے کی خاطر نہلانا حقیقت میں اپنے آپ کو بہت بڑے عذاب میں ڈالنا ہے۔

آخر میں کہتے ہیں پہلا شخص جاہل، دوسرا جاہل اور گمراہ، تیسرا جاہل، گمراہ اور فاسق، چوتھا جاہل گمراہ فاسق اور شریر ہے۔

یہ بتا دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی خلق کی تبدیلی سے غزالی کی مراد اس کی اصلاح اور اعتدال ہے۔ایک مقام میں کہتے ہیں:۔

"بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ریاضت اور مجاہدے سے مقصود ان اخلاق وصفات کا استیصال اور بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ حاشا ایسا نہیں کیونکہ کوئی بھی خواہش ہو اس کا وجود فطرتاً نہایت ضروری اور کسی حال میں بھی نفع وفائدہ سے خالی نہیں۔ فرض کیجئے اگر کھانے کی خواہش یکسر موقوف ہو جائے تو انسان مر جائے، اگر صحبت وجماع کی خواہش ختم ہو جائے تو نسل انسانی منقطع ہو جائے، اگر غضب کی قوت بالکل مفقود ہو جائے تو انسان اپنے آپ کو دوسروں کے حملہ سے نہ بچا سکے اور ہلاک ہو جائے جب تک شہوت وخواہش باقی رہے گی مال ودولت کی محبت بھی باقی رہے گی جو انسان کو اپنے مقاصد تک پہنچاتی ہے اور اس سے انسان میں مال ودولت کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کا جذبہ لامحالہ سر اٹھائے گا۔ یاد رکھئے ان قویٰ کا بالکلیہ استیصال ہرگز مقصود نہیں بلکہ مقصود فقط یہ ہے کہ افراط اور تفریط کو دور کر کے ان قویٰ کو راہ اعتدال پر لایا جائے کہ یہی درمیانی راہ ہے۔"

اپنے عیوب ونقائص کیسے معلوم کئے جا سکتے ہیں؟

غزالی کہتے ہیں جس شخص کی بصیرت قوی وغالب ہو اس پر اپنے عیوب مخفی نہیں رہ سکتے جب عیوب معین ومشخص ہو گئے تو پھر ان کا علاج چنداں دشوار نہیں۔

چونکہ بعض لوگ اپنے عیوب کے باب میں ایسے غافل اور بے خبر ہوتے ہیں کہ انھیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آ جاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا اس لئے غزالی نے اپنے عیوب معلوم کرنے کے چار طرق بیان کئے ہیں۔

(اول) کسی ایسے شیخ طریقت کی صحبت وہم نشینی اختیار کرے جو نفس کے عیوب ونقائص سے پوری طرح باخبر اور نفس کی مخفی سے مخفی آفتوں سے پوری طرح آگاہ ہو، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے اور ریاضت ومجاہدہ میں اسی کے صلاح ومشورہ پر عمل کرے۔

(دوم) کوئی صادق و مخلص اور دیندار و صالح دوست تلاش کر کے اسے اپنا نگران مقرر کرے تا کہ وہ اس کے تمام احوال و افعال کا جائزہ لیتا رہے اور جس ظاہری یا باطنی نقص و عیب پر مطلع ہو اس سے اسے باخبر کر دے۔

(سوم) دشمنوں کی زبانی اپنے عیوب معلوم کرے کیونکہ دشمنی اور خفگی کی آنکھ عیوب کو خوب جانچتی ہے میں سمجھتا ہوں ایک سہل انگار اور چشم پوش دوست کی نسبت ایک برے درجہ کا دشمن، انسان اس کو اپنے عیوب کی سراغ رسانی میں زیادہ امداد دے سکتا ہے۔

(چہارم) دوسروں سے میل جول رکھے اور جو قابل مذمت بات اُن میں نظر آئے سمجھے کہ یہ بات مجھ میں بھی ضرور ہوگی کیونکہ تمام طبائع خواہشات کی پیروی میں تقریباً یکساں ہیں جو بات ایک شخص میں ہوگی کم و بیش دوسرے میں بھی ضرور ہوگی۔ اپنے نفس کا جائزہ اور امتحان لیتا رہے اور ہر مذموم خلق سے اُسے آہستہ آہستہ پاک کرتا رہے۔

حُسنِ خُلق کی علامات

اس باب میں غزالی قرآن حکیم کو حکم اور فیصل قرار دیتے ہیں کیونکہ حُسنِ خلق اور سوءِ خلق سے چلنے اخلاق و صفات پیدا ہو سکتے ہیں اُن سب کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مومنین اور منافقین کے صفات و اخلاق میں بیان فرما دیا ہے۔ قرآن کریم کی آیات کا ایک مجموعہ نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

> جس شخص کے لئے فیصلہ کرنا دشوار ہو جائے اُسے اپنے آپ کو ان آیات کے سامنے پیش کرنا چاہیئے جن خوبیوں کو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے اُن سب کا کسی شخص میں پایا جانا حسن خلق اور سب کا فقدان سوءِ خُلق کی علامت ہے۔ بعض کا پایا جانا اور بعض کا نہ پایا جانا کچھ حسن خلق اور کچھ سوءِ خلق کا غماز ہے۔ ایسے شخص کا فرض ہے کہ جو خوبیاں اُس میں موجود ہیں اُن کی حفاظت کرے، اور جو موجود نہیں ہیں اُن کے حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو۔[1]

ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کی طرف رجوع ہمیشہ کافی نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو صرف ایک ہی

---

[1] احیاء، ج ۳ ص ۴۷

ذاتی عادت وخصلت میں شبہ ہو جائے کہ آیا یہ اس میں خوبی کی بات ہے یا عیب اور نقص کی، غزالی اس خدشے سے بخوبی باخبر تھے۔ چنانچہ ایک دوسرے باب میں بخل کے علاج میں لکھتے ہیں:-

"مطلوب فضول خرچی اور کنجوسی کے مابین اعتدال ہے تاکہ وسط متعین ہو جائے اور افراط و تفریط دونوں کا فاصلہ یہاں سے برابر اور مساوی رہے۔"

آگے چل کر کہتے ہیں:-

"اگر تم کسی خلق کا وسط اور اعتدال متعین کرنا چاہو تو اس کی سہل صورت یہ ہے کہ اس عمل پر نگاہ کرو جو اس ممنوع خلق سے پیدا ہوا ہے۔ اگر یہ عمل اپنی ضد کی نسبت تمہیں زیادہ عزیز اور تمہارے لئے زیادہ سہل ہو تو سمجھو کہ جس خلق کی وجہ سے یہ فعل ظہور میں آیا ہے اس کا تم پر غلبہ ہے۔ مثلاً دولت کا روکنا اور جمع کرنا کسی مستحق پر صرف کرنے کی نسبت تمہیں زیادہ عزیز اور تمہارے لئے زیادہ سہل ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم پر بخل کا خلق غالب ہے۔ تمہیں چاہیے کہ دولت کے صرف کرنے کی طرف متوجہ ہو۔ اگر کسی غیر مستحق پر روپے کا صرف کرنا تمہیں اچھا معلوم ہوتا ہو اور اس سے تمہاری طبیعت پر کوئی بار نہ گذرتا ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ تم پر فضول خرچی کی عادت کا استیلاء اور غلبہ ہے تمہارا فرض ہے کہ دولت کے روکنے اور جمع رکھنے پر مداومت کرو بس اسی طرح اعمال و افعال کی سہولت و اشکال سے اعتدال اور وسط کو متعین کرتے رہو تا آنکہ مال و دولت کی طرف التفات کا تعلق تمہارے قلب سے منقطع ہو جائے اور تم میں دولت کے صرف کرنے یا نہ کرنے کا میلان ہی سرے سے باقی نہ رہے اور اس کی حیثیت تمہاری نگاہ میں پانی کی طرح ہو جائے اور تم اس کو صرف دوسروں کی حاجت وضرورت میں صرف کرو یا انہی کی حاجت وضرورت کے لئے جمع رکھو، تا آنکہ دولت کا صرف کرنا یا نہ کرنا تمہاری کسی خاص توجہ وعنایت کا محتاج ہی نہ رہے۔"[۵]

غزالی کا بیان کردہ علاج حقیقت میں انسانی طبیعت وفطرت سے جنگ کے مترادف ہے

---

۵ ص ۳۶۷

کیونکہ فیاضی اور کرم میں نہیں سمجھتا کہ بذل اور امساک (صرف کرنا اور صرف کرنے سے باز رہنا) دونوں کی برابری اور تساوی کا طالب ہے۔ اصل میں غزالی کی خواہش یہ ہے کہ تمام فضائل نفس کی فطری اور جبلی حرکتوں میں تبدیل ہوجائیں حالانکہ یہ بڑی بعید اور دور از کار بات ہے۔

تیسری فصل

تہذیبِ اخلاق کا طریق

غزالی نفس کو بدن کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جس طرح بدن اگر صحیح اور تندرست ہے تو طبیب کا فرض ہے کہ اس کی صحت کی حفاظت و بقا کی تدبیر کرے اور اگر مریض اور بیمار ہے تو طبیب کو چاہیئے کہ اس کی صحت یابی اور علاج کی طرف متوجہ ہو اسی طرح اگر نفس مہذب اور پاک ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس کی پاکیزگی اور تہذیب کی حفاظت میں کوشاں رہیں اگر نفس اس دولت سے محروم ہے تو اس کی صحت اور علاج کی طرف توجہ کریں جس طرح بدن کے کسی مرض کے سبب کا علاج اس کی ضد سے کیا جاتا ہے مثلاً اگر مرض کا سبب برودت (سردی ٹھنڈک) ہے تو علاج حرارت (گرمی) سے اور سبب حرارت ہے تو علاج برودت سے کیا جاتا ہے اسی طرح قلب کے امراض کا علاج بھی ضد سے ہونا چاہیئے مثلاً جہالت کا علاج تعلیم سے بخل کا علاج سخاوت سے تکبر کا علاج تواضع سے، حرص و آز کا علاج قناعت و صبر سے کرنا چاہیئے جس طرح بدن کے کسی مرض کے علاج کے لئے کڑوی کسیلی دوائیں اور مرغوب کھانوں سے پرہیز کی مصیبت برداشت کرنی پڑتی ہے اسی طرح بیمار قلب کے علاج کے لئے بھی ریاضت و مجاہدہ اور صبر و استقلال کے کڑوے گھونٹوں سے کام و دہن کو بطریق اولیٰ آشنا کرنا چاہیئے کیونکہ بدن کے کسی مرض سے تو انسان مرکر نجات حاصل کرسکتا ہے لیکن قلب کا مرض موت کے بعد بھی ابداً آباد تک باقی رہتا ہے۔ جس طرح ہر ٹھنڈی چیز ہر اس مرض کے علاج میں مفید نہیں ہوسکتی جس کا موجب و سبب حرارت

ہو بلکہ اس میں ایک خاص حد، شدت وضعف، دوام وعدم دوام، قلت وکثرت کے فرق واختلاف اور ایک مفید ونافع معیار کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اگر اس معیار کا لحاظ نہ کیا جائے تو مرض بجائے دور ہونے کے اور زیادہ قوی ہوگا۔ اسی طرح اخلاق کی اصلاح ودرستی میں بھی ان کی نقائص کا ایک خاص معیار ہے جس طرح دوا کا معیار بیماری کے معیار سے ماخوذ ہے اور طبیب اُس وقت علاج میں ہاتھ نہیں ڈالتا جب تک یہ معلوم نہ کرلے کہ اس مرض وناخوشی کا سبب گرمی ہے یا سردی اگر گرمی ہے تو کس درجے کی ہے زیادہ ہے یا کم، جب اس کا فیصلہ کرلیتا ہے تو پھر دیکھتا ہے کہ مریض کے بدن کی حالت وکیفیت کیا ہے موسم کیسا ہے مریض کا پیشہ اور عمر کیا ہے، جب یہ سب باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرلیتا ہے تو پھر ان کے مطابق علاج ومعالجہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ بعینہ اِس طرح کی باتوں سے اُس مرشد ورہنما کو واقف ہونا لازمی ہے۔ جو مریدین کے نفوس کا علاج اور اصلاح کرتا ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ جب تک ان کے اخلاق وامراض کا بغور مطالعہ اور معائنہ نہ کرلے کسی مخصوص طریق وفن میں اُن پر ریاضت اور مجاہدہ کی کلفتوں کی یکبارگی بھرمار نہ کردے جس طرح ایک طبیب اگر تمام مریضوں کے باب میں ایک ہی طریقِ علاج برتے تو معلوم نہیں کتنوں کو مار ڈالے اسی طرح اگر ایک مرشد تمام مریدوں کو ایک ہی طرح کی ریاضت اور مجاہدہ بتائے تو معلوم نہیں کتنوں کو فنا کردے اور کتنوں کے دلوں کے چراغ بجھا ڈالے، مرشد کا فرض ہے کہ پہلے مرید کی حالت، مرض، عمر، مزاج اور اُس ریاضت پر غور کرے جس کے بار کا مرید نے متحمل ہوتا ہے اور اس کے بعد کسی ریاضت ومجاہدہ کی اُسے تلقین کرے۔

اس طریقِ علاج سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کو اخلاق کے علاج میں کس قدر بصیرت اور مہارت حاصل تھی دوسرا یہ کہ اس زمانے میں بھی طب کا فن کتنا وسیع اور ترقی یافتہ تھا[1]۔

غزالی نے طبائع کے اختلاف کے پیشِ نظر تہذیب وتربیت کے طُرق بھی مختلف لکھے ہیں اور قلب کے ہر مرض کے مقابلے میں اُس کا مخصوص علاج بھی درج کردیا ہے۔ اس باب سے ایک جگہ

---

[1] احیاء، ج ۳ ص ۶۴، ۶۵۔ میزان ص ۷۶، ۷۸، ۷۹

سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں لوگ تکبر کا علاج دریوزہ گری سے کیا کرتے تھے میری رائے میں یہ کسی مرض کا علاج نہیں بلکہ ایک مرض کے ساتھ کئی دوسرے امراض میں اپنے آپ کو مبتلا کر لینے کے مرادف ہے کیونکہ بعض اوقات سوال اور بھیک کی وجہ سے انسان ایسی بری علتوں کا شکار ہو جاتا ہے کہ جن کو دور کرنے کے لئے بڑی ہی جد و جہد اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن کیا کیا جائے صوفیہ ایسے لوگ ہیں جن کے ہاں کئی ناز یبا اور ناشائستہ حرکتیں زیبا اور شائستہ قرار پاتی ہیں۔

چوتھی فصل

اخلاق کی غرض و غایت

خیر وہ ہے جس کے متعلق آپ اعتقاد رکھتے ہوں کہ یہ خیر ہے۔ شر وہ ہے جس کے متعلق آپ اعتقاد رکھتے ہوں کہ یہ شر ہے اور اس اعتقاد تک پہنچنے کی تدبیر یہ ہے کہ عمل کو شرع اور عقل دونوں کے ترازوؤں میں اچھی طرح تول لیا جائے، اب دیکھنا یہ ہے کہ خیر کے کرنے اور شر سے مجتنب رہنے سے غرض اور غایت کیا ہے؟

غزالی کی رائے میں اخلاق سے غرض و غایت اُخروی زندگی کی سعادت ہے، چنانچہ اس مسئلہ کو انھوں نے میزان کی پہلی فصل میں نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:-

> حقیقی اور اصلی سعادت، اُخروی سعادت ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز پر سعادت کا اطلاق یا مجازاً ہے یا خطأ (مثلاً دنیا کی وہ سعادت جو آخرت کے باب میں مفید نہیں ہے) یا دنیا کی کسی چیز پر سعادت کا اطلاق صحیح بھی ہے تو بھی اُخروی زندگی پر اس کا اطلاق اصح اور انسب ہے۔ کیونکہ ہم اس دنیا میں اگر کسی چیز کو سعادت کا نام دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ یہ اُخروی زندگی کی سعادت کے لئے

زینہ ہے اور جو چیز خیر و سعادت تک پہنچنے کا زینہ اور واسطہ ہو اُسے بھی ہم ایک معنی میں خیر اور سعادت کے نام سے پکار سکتے ہیں۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کی رائے میں اخلاق کی مجلسی یا اجتماعی غرض و غایت کچھ نہیں جو شخص کسی مریض کی عیادت اور خبر گیری کرتا ہے یا کسی مقہور اور مظلوم کی اعانت و امداد کرتا ہے یا کسی زخمی کا علاج معالجہ اور مرہم پٹی کرتا ہے یا کسی صاحبِ حاجت و ضرورت کی کاربراری کرتا ہے تو اُس کی یہ ساری محنت و خدمت اُس وقت تک اُس کے لئے مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس کی نیت اس عمل میں خالص اور پاک نہ ہو اور وہ اس بات پر کامل وثوق اور اعتماد نہ رکھتا ہو کہ آخرت میں اُسے اس عمل کا صلہ اور جزا ملے گی۔ اس دنیا میں کسی اچھے عمل سے جو بھی سعادت حاصل ہو گی حقیقت میں وہ مجازی ہی ہو گی اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کو مجازی قرار دے یا اضافی اور نسبی، بایں معنی کہ جو چیز اُخروی سعادت تک پہنچاتی ہے اُسے بھی ایک معنی میں خیر اور سعادت کا نام دیا جا سکتا ہے میزان[2] میں غزالی نے تصریح کی ہے کہ جو شخص زنا سے محض اس لئے بچے کہ کہیں اُس کے وقار اور عزت کے دامن پر دھبہ نہ آئے تو اُسے عفیف اور پاک دامن نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ اس عفت اور پاکدامنی سے اُس کا مقصود اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی حاصل کرنا نہ تھا بلکہ محض ایک تجارت اور سوداگری تھی کیونکہ اُس نے ایک لذت کو دوسری لذت کی خاطر ترک کیا۔

ایک مختصر مناقشہ

ہم غزالی سے صرف دو باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

(اول) جب تم نے کسی مریض کی خدمت کی اور تمہارے لئے اُس کی یہ خدمت اس لئے مفید نہیں ہے کہ تمہاری سعادت اس دنیا کی جد و جہد کا نتیجہ نہیں ہے اور اس باب میں مفید صرف یہ ہے کہ تمہاری نیت درست ہو تاکہ آخرت میں تمہیں اُس کا صلہ و جزا ملے تو بتائیے اخلاقی نقطۂ نگاہ

---

[1] میزان ص ۱۱۷

[2] میزان ص ۱۳۶

اور اخلاقی غرض و غایت کے اعتبار سے تمہارا یہ عمل تجارت ہے یا نہیں ؟

(دوم) اگر عزت اور وقار کے دامن کو بچانے یا صحت کی حفاظت اور باقی رکھنے کی خاطر زنا سے بچنا عفت نہیں کہلا سکتا تو پھر اخلاق و شرع نے عفت و طہارتِ اخلاق کا درس اس کے علاوہ اور کن امور کے لئے دیا ہے؟ کیا یہ ساری تلقین صرف اس لئے نہیں کہ انسان کی صحت محفوظ رہے اور اس کے دامنِ عزت و وقار پر کوئی بدنما داغ نہ آنے پائے ؟

جب آپ خیر و شر کا معیار عقل کو قرار دیں تو پھر فرمایئے کہ کیا عقل کے پاس بھی زنا کی مضرت اور نقصان کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور دلیل ہے ؟ کہ اس سے انسان کی صحت تباہ ہوتی اور اس کی عزت و شرافت پر حرف آتا ہے ؟

ہمارے ذہن و حافظہ میں یہ بات ابھی تازہ ہے کہ غزالی نے ان لوگوں کا مذاق اور تمسخر اڑایا ہے جو اخروی سعادت کو حور و غلماں اور دوسرے لذائذ میں محصور سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سب باتیں قرآن حکیم میں مذکور رہیں۔ آخر میں غزالی نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اخروی سعادت ان چیزوں میں نہیں بلکہ اللہ کی رضا اور خوشنودی میں ہے اس پر قیاس کرتے ہوئے کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ کسی مظلوم کی فریادرسی یا کسی زخمی کی مرہم پٹی کرتے وقت دل میں یہ طمع اور لالچ رکھنا کہ آخرت میں ہمیں اس کا معاوضہ دا جر ملے گا اخلاق کے ارفع اور بلند مقاصد کے سراسر منافی ہے اور ایک صالح اور نیکو کار شخص کا فرض یہ ہے کہ وہ صرف مظلوم اور مریض کی سعادت ہی میں اپنی سعادت شمار کرے اور عاقبت کے اجر و جزا یا اس مادی دنیا کے صلہ اور معاوضہ دونوں سے یکسر قطع نظر کرے۔

یہ بتا دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کا یہ مفہوم قرار دینے کی وجہ سے غزالی کو اور بہت سے اسرارِ شریعت کے سمجھنے میں غلطی اور ٹھوکر لگی ہے مثلاً فریضۂ حج کو غزالی ایک قسم کی روحانی ریاضت سمجھتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ احیاء العلوم کے باب الحج میں انھوں نے ادعیہ اور اوراد کا ایک بے پناہ انبار لگا دیا ہے حتیٰ کہ گویا حاجی کے ہر ہر قدم

کے لئے انھوں نے ایک مستقل اور مخصوص دعا نقل کر دی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کی آیت لِیَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ سے بے خبر رہے ہیں کیونکہ وہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی شخص تجارتی فائدے کے لئے حج کا سفر اختیار کرے۔

اگر اس مسئلہ پر ہلکی سی بھی نگاہ ڈالی جائے کہ شریعت نے مسلمانوں کی وحدت و اتحاد پر کس قدر زور دیا ہے تو ہر مستطیع پر حج کی فرضیت کا راز بآسانی منکشف ہو جاتا ہے۔ تجارت کے وہ فوائد جن کے باب میں غزالی نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے اُن بے شمار فوائد کے مقابلہ میں ہیچ ہیں جو مختلف ممالک کے حجاج کے باہم ملنے اور ایک دوسرے کے سامنے اپنی اپنی ملکی اور سیاسی مشکلات آگے رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں تاکہ وہ ان مشکلات کا کوئی صحیح حل سوچ سکیں اور اگر کہیں کسی سرحد پر کوئی خطرہ لاحق ہے تو اُس کے دفاع کے لئے اپنے آپ کو مستعد بنا سکیں لیکن کیا کیا جائے غزالی عمل اور جزا دونوں کو نری عبادت میں محصور سمجھتے ہیں کیونکہ کئی جگہ صوفیہ نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ جنت کے لذائذ مادی نہیں بلکہ یہ بھی تسبیح، تقدیس اور تہلیل کی مختلف تعبیریں ہیں۔

پانچویں فصل

کیا اخلاق میں بھی وراثت کارفرما ہے؟

تربیت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے غزالی کہتے ہیں:۔

بچے کا دل ایسا عمدہ اور نفیس جوہر ہے جو ہر قسم کے نقش و میلان سے بالکل سادہ اور خالی ہوتا ہے لیکن ہر نقش و صورت کو بآسانی قبول کر سکتا ہے۔ اگر ابتدا ہی سے اُس کو آہستہ آہستہ نیکی اور خیر کا عادی بنایا جائے تو یہ چیز اُس کے خمیر میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب رہتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر اس کو

جانوروں کی طرح آوارہ و آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کی ساری صلاحیتیں ضائع اور بیکار چلی جاتی ہیں اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں ناکام و نامراد رہتا ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کی رائے میں تربیت سے قبل انسانی فطرت بالکل سادہ اور بے رنگ ہوتی اور ہر بات کے اخذ و قبول کے لئے پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ تو گویا خیر اور شر دونوں میں بڑا ہاتھ تربیت کا ہے۔ فطری طور پر خیر یا شر کی طرف انسان کا کوئی میلان نہیں ہوتا، والدین اور اساتذہ جس قسم اور جس طرح کی تربیت کریں گے بچے کی کامیابی یا ناکامی کا سارا مدار اسی پر ہوگا۔

تہذیب اخلاق میں بھی غزالی کا قول اسی رائے کی تائید کرتا ہے کہتے ہیں:۔

"جس طرح اصل مزاج پر اعتدال غالب ہے اور اگر کبھی معدے کو کوئی ضرر یا مرض لاحق ہوتا ہے تو اس کی بڑی وجہ خرابی غذا یا خرابی ہوا یا کچھ دوسرے عوارض و احوال ہیں اسی طرح ہر بچہ پیدائش کے وقت نہایت معتدل المزاج اور صحیح الفطرت ہوتا ہے لیکن آگے چل کر اس کے والدین اسے بگاڑ دیتے ہیں (یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں) یعنی ساری بے ہودگیاں، عادت و مشق اور تعلیم و تربیت کی راہ سے آتی ہیں جس طرح بدن پیدائش کے وقت ہی سے مکمل نہیں ہوتا بلکہ نشو و نما، تربیت اور غذا کی وجہ سے رفتہ رفتہ قوت و کمال حاصل کرتا ہے اسی طرح نفس بھی ابتدا میں نہایت نامکمل و ناقص ہوتا ہے لیکن ہر کمال و خوبی کو اپنانے کے لئے پوری صلاحیت و استعداد رکھتا ہے اور اسے کمال و عروج تک پہنچانے کی فقط یہی ایک صورت ہے کہ اس کی تربیت و تہذیبِ اخلاق کی طرف کماحقہ اور خاطر خواہ توجہ دی جائے اور اسے زیورِ علم سے آراستہ و مزین کیا جائے۔"[۵۱]

لیکن میزان[۵۲] میں کہتے ہیں:۔

"دینی نسب حسنِ خلق اور دیانت کی علامت ہے کیونکہ خاندانی رگ بڑا اثر رکھتی ہے۔"

---

۵۱ ج ۳ ص ۴۹

۵۲ ص ۱۲۷

بچوں کی تعلیم و تربیت کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"دایہ نہایت دیندار، صالح اور اکلِ حلال کی عادی و خوگر ہونی چاہئیے کیونکہ جو دودھ حرام سے بنے گا اُس میں کوئی خیر و برکت نہ ہوگی۔ جب ابتدا ہی سے بچے کی تربیت میں حرام شریک ہوگیا تو آہستہ آہستہ اُس کے رگ و ریشے میں سرایت کر جائے گا۔ اور آگے چل کر وہ بالطبع حرام اور ناپاک امور کی طرف مائل و راغب ہوگا"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزالی اخلاق میں نقل و وراثت کے قائل ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ رضاعت کو علم یا مشق اور ریاضت قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ بھی مسلم ہے کہ رضاعت کے ایام میں بچہ عقل اور شعور سے بالکل عاری ہوتا ہے۔ اس پر غزالی کا یہ قول اور اضافہ کیجیے

"بعض اوقات بچے میں حیا کی طرف میلان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اس وقت مربی کا فرض ہے کہ اُس میلان سے پورا پورا فائدہ اُٹھائے"

ظاہر ہے کہ انسانی فطرت اگر تمام رجحانات و میلانات سے یکسر عاری ہوتی تو تربیت اور ریاضت کے ساتھ اُس میں حیا کی تخم ریزی تو کی جا سکتی تھی لیکن نشو و نما ہرگز نہیں کیونکہ کسی چیز کو نشو و نما دینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے سے موجود ہو۔

گذشتہ بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وراثتِ اخلاق میں غزالی کی دو مختلف رائیں ہیں جہاں وہ کہتے ہیں کہ بچے کا دل ایک عمدہ و نفیس جوہر اور ہر قسم کے نقش و ارتسام سے خالی و سادہ ہوتا اور ہر صورت و شکل کو بآسانی قبول کر سکتا ہے وہاں اخلاق میں وراثت کی کارفرمائی کو تسلیم نہیں کرتے، جہاں وہ تلقین کرتے ہیں کہ بچے کی دایہ متدین، صالح اور پاکباز ہونی چاہیے وہاں اخلاق میں بھی بڑا ہاتھ وراثت کا قرار دیتے ہیں۔ ان دونوں فیصلوں میں بظاہر جو اختلاف ہے کیا اُس کو بھی رفع کرنے کی کوئی صورت و تدبیر ممکن ہے؟

گذشتہ بحث کی تنقیح

واقعہ یہ ہے کہ غزالی نے اس بحث میں کماحقہ دلچسپی نہیں لی یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے میں

---

[1] ج ۳ ص ۷۷۔

ان کے اقوال و آراء حتمی اور قطعی نہیں ہیں۔ اگر وہ اس مسئلے پر پوری توجہ دیتے تو ہمیں بتاتے کہ اخلاق میں بھی وراثت کا ہاتھ کارفرما ہوتا ہے لیکن یہ اس امر سے مانع ہرگز نہیں کہ بچے کا دل اور دماغ ہر صورت و شکل کو بآسانی قبول کر سکتا ہے اور انسانی فطرت کی زمین ہر تخم کے لئے سازگار ہے کیونکہ جو اخلاق، بچہ پیدائش کے وقت اپنے والدین سے لیتا ہے وہ نہایت کمزور ہوتے ہیں اور بہت سہولت کے ساتھ انھیں دور کیا جا سکتا ہے بلکہ بچہ تو کیا بعض ادھیڑ عمر کے لوگ بھی ریاضت و کوشش سے اپنے رذائل کا استیصال کر سکتے ہیں۔ موروثی اخلاق تنہا اس وقت اپنا کام کر سکتے ہیں جب انسان اُن تمام خوبیوں کو ضائع کر دے جو اُس نے ناصح اساتذہ سے حاصل کی تھیں یا اتفاق سے کسی نیک اور صالح ماحول کی بدولت اس میں پیدا ہو گئی تھیں۔

تو گویا غزالی کے کلام میں بظاہر جو تناقض معلوم ہوتا ہے وہ واقع میں نہیں ہے مختلف مقامات میں جو اُن کے اقوال و آراء پھیلے ہوئے ہیں اُن سب کو اگر یکجا کیا جائے تو بآسانی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اخلاق میں نقل و وراثت کے قائل ہیں لیکن اس پر بھی انسانی نفوس کی تعمیر میں بڑا اور کارگر مؤثر تعلیم و تربیت ہی کو مانتے ہیں۔

ساتواں باب

فضائل

اس باب میں پہلے ہم فضیلۃ کی تعریف اور فضائل کے اصول و فروع کو بیان کریں گے اور اس کے بعد فضائل کے اس مجموعے کو بیان کریں گے جن کے ذکر میں غزالی نے بڑے اہتمام اور بڑی بسط و تفصیل سے کام لیا ہے۔ مثلاً سچائی، صبر، توکل اور گمنامی وغیرہ دوسرے وہ اخلاق و اوصاف جن پر فرد کی زندگی کا دار و مدار اور اجتماعی زندگی کی دیوار استوار ہے" تاکہ اس سے آپ اندازہ کرسکیں کہ غزالی کے ہاں ایک ارفع و اعلیٰ اور مثالی زندگی کا تصور کیا ہے؟

فضیلت کی تعریف

غزالی کلمہ فضیلت اور کلمہ خلق دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے یہ دونوں لفظ اُن کے ہاں نفس ہی کی ہیئت و صورتِ باطنی سے عبارت ہیں۔

غزالی کے ہاں فضیلت کا تصور کچھ ارسطو اور کچھ افلاطون سے ماخوذ ہے۔ نظریۂ توسط جسے وہ اعتدال سے تعبیر کرتے ہیں ارسطو سے لیا گیا ہے۔ مثلاً قوت غضب اگر نقطۂ اعتدال

سے بجانب افراط مائل ہو تو اُسے تہوّر، اور اگر بجانب تفریط مائل ہو تو جُبن، اور اگر دونوں کے وسط میں ہو تو اُسے شجاعت کہتے ہیں۔ افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں لہٰذا صرف وسط و اعتدال ہی پسندیدہ و قابل تعریف ہے

غزالی کا یہ نظریہ انتہائی واضح ہے اُن پر یہ اعتراض کسی صورت وارد نہیں ہو سکتا کہ بعض فضائل ایسے ہیں جن میں افراط و تفریط سرے سے متصور ہی نہیں کیونکہ انھوں نے خود بیان کر دیا ہے کہ عدل کی دو طرفیں (یعنی افراط و تفریط) نہیں نکل سکتیں بلکہ عدل کی ضد و مقابل صرف ایک ہی چیز ہے یعنی ظلم و جور۔

نظریہ مماثلت (مشابہتہ اللہ) غزالی نے افلاطون سے لیا ہے۔ کیونکہ افلاطون کی رائے میں خدا اُس ایک وحدت اور اکائی سے عبارت ہے جس میں مخلوقات کے جمیع کمالات مجتمع ہیں۔ صاحب فضیلت انسان وہ ہے جس کی نگاہ اللہ پر ہمیشہ ایسی جمی رہے جیسے ایک آرٹسٹ کی نگاہ نمونہ و مثال (PATTERN) پر، غزالی کہتے ہیں کہ کسی شخص کو جتنا قرب و تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگا، اتنا ہی قرب و تعلق اُس کو اللہ سے میسر آئے گا اس کا معنی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تمام فضائل اخلاق کا نمونہ و مجموعہ تھی اور آپ نے ماسوا تکبر کے دوسرے تمام اخلاق اللہ کے ساتھ مزین و آراستہ ہونے کی تلقین فرمائی ہے تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت اور آپ کے نقش قدم کی پیروی و اتباع کا معنی غزالی کے ہاں ہو بہو اور بعینہٖ وہی ہے جو افلاطون کے ہاں مشابہتہ اللہ کا۔

غزالی جسے عدل کہتے ہیں وہ بھی افلاطون کے نظریۂ توافق سے ماخوذ ہے۔ توافق افلاطون کے ہاں اُس ہم آہنگی و تناسب ملکات و قویٰ کا نام ہے جس کی بدولت انسان کے اخلاقی پہلو آراستہ و مکمل ہوتے ہیں چنانچہ غزالی کہتے ہیں:۔

"جیسے خوبصورتی صرف آنکھوں ہی کے خوبصورت ہونے کا نام نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ آنکھیں، ناک، منہ اور رخسار سب خوبصورت اور جاذب نظر ہوں

اسی طرح حسن خلق یا حسن باطنی کے بھی چار ارکان ہیں، جب یہ چاروں مکمل ہوں گے تو حسن خلق کی دولت نصیب ہوگی اور وہ چار ارکان یہ ہیں۔ قوت علم، قوت غضب، قوتِ شہوت اور قوتِ[1] عدل۔ قوتِ علم کی خوبی اور حسن یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اقوال میں صدق اور کذب، اعتقادات میں حق اور باطل، افعال میں نیک اور بد کے مابین تمیز اور فرق کرنے میں آسانی اور سہولت ہو۔ جب قوتِ علم صحیح اور درست ہوگی تو اس سے انسان میں حکمت کا ملکہ پیدا ہوگا اور حکمت ہی تمام عمدہ اخلاق کا منبع و سرچشمہ ہے، قوت غضب کی حسن و خوبی یہ ہے کہ اس کا گھٹنا اور بڑھنا حکمت کے مقتضی کے مطابق ہو، قوتِ شہوت کی خوبی و کمال یہ ہے کہ وہ حکمت (یعنی عقل اور شرع) کے اشارے پر چلے"

یہ آخری جملہ (یعنی اشارۂ عقل و شرع) خاص طور پر قابلِ غور و فکر ہے۔ اس میں غزالی نے توافق اور مماثلت دونوں کو ایک جا سمو دیا ہے۔ لفظ شرع سے ان کی مراد مماثلت ہے اور اس کے لئے معیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اخلاق حسنہ ہیں جن کو قرآن حکیم میں بیان کیا گیا ہے۔ عقل سے غزالی کی مراد توافق ہے کیونکہ تمام قُویٰ اور ملکات کا مرجع عقل ہی ہے، غور کیجیے کہتے ہیں:۔

"عقل کی مثال ایک بہی خواہ اور ناصح مشیر کی ہے اور قوتِ عدل عبارت ہے قدرت سے اور اس کی مثال ایک مُنفِذ و متصرف کی ہے اور یہ نفاذ و تصرف قوتِ غضب ہی میں ہوتا ہے اور اُس کی مثال اُس شکاری کتے کی ہے جس کو شکار میں چھوڑنے اور روکنے کے لئے پہلے سدھانے اور سکھانے کی ضرورت ہوتی ہے"

قوتِ علم اور قوتِ شہوت کا بھی یہی حال ہے چنانچہ میزان میں ایک مقام پر کہتے ہیں:۔

"اُن قویٰ کا ایک خاص اور مناسب ترتیب کے ساتھ وقوع میں آنا عدل کہلاتا ہے"

اور پھر اس دعویٰ کی دلیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث لاتے ہیں،

---

[1] قوت عدل کوئی الگ اور مستقل قوت نہیں بلکہ گذشتہ تینوں قویٰ کے وسط و اعتدال سے عبارت ہے۔

بالعدل قامت السموات والارض[1] یہ خاص معین اور مناسب ترتیب جس کا غزالی نے ذکر کیا ہے یقیناً عقل ہی کے تابع ہوگی اور افلاطون کے نظریہ توافق سے بھی مراد بعینہٖ یہی ہے۔

اصولِ فضائل

غزالی کی رائے میں اصولِ فضائل چار ہیں حکمت، شجاعت، عفت اور عدل حکمت سے مراد نفس کی وہ خاص حالت ہے جس کی وجہ سے انسان تمام اختیاری احوال میں صحیح کو غلط سے پرکھ سکے، عدل سے مراد نفس کی وہ حالت و قوت ہے جس کی وجہ سے نفس، غضب اور شہوت کو اپنے قابو اور تصرف میں رکھ کر انھیں حکمت کے تقاضا و مصلحت کے مطابق استعمال میں لائے شجاعت سے مراد یہ ہے کہ قوتِ غضب اپنے جمیع اعمال و حرکات میں عقل کے تابع فرمان ہو، عفت سے مراد یہ ہے کہ قوتِ شہوت عقل اور شرع کے آداب سے مزین اور آراستہ ہو۔

غزالی کی رائے میں گذشتہ اصول فضائل کی کئی فروع ہیں مثلاً قوتِ عقل کے اعتدال سے مندرجہ ذیل امور وجود میں آئیں گے۔

حسن تدبیر، جودتِ ذہن۔ اصابت رائے وظن۔ دقیق ترین اعمال اور نفس کی مخفی سے مخفی آفات پر آگاہی و اطلاع۔

شجاعت سے کرم، ہمت، جرأت، کسرنفسی، تحمل، بردباری، پامردی، اخوت اور ضبطِ خشم کے جذبات پیدا ہوں گے۔

عفت سے سخاوت، حیا، صبر، عفو و درگذر، قناعت، تقوی و ورع، خوش خلقی، حسنِ سلوک خردمندی اور قلتِ طمع وغیرہ صادر ہوں گے۔

میزانُ العمل میں غزالی نے بیان کیا ہے کہ حکمت، قوتِ عقلیہ کی فضیلت، شجاعت قوتِ غضبیہ کی فضیلت اور عفت قوت شہوانیہ کی فضیلت ہے اور عدل عبارت ہے ان قویٰ کی خاص اور مناسب ترتیب سے تو گویا عدل خود کوئی الگ اور مستقل فضیلت نہیں بلکہ مجموعہ

---

[1] عدل ہی کی بدولت زمین آسمان قائم ہیں۔ [2] ص ۹۰

ہے جملہ فضائل کا۔

غزالی نے خود محسوس کیا کہ ان زوج کے سمجھنے میں ایک گونہ دقت اور غموض ہے اسی لئے ان کی شرح وتفصیل میں انھوں نے میزان میں تین طویل اور مفصل ابواب سپرد قلم کئے ہیں اور بتایا ہے کہ افراط وتفریط سے کیا کیا انواعِ رذائل پیدا ہوتے ہیں ہم کسی دوسرے باب میں ان شاء اللہ العزیز ان امور کو پھر دوبارہ مزید بسط وتفصیل سے بیان کریں گے۔

فضائلِ سلبیہ

اگر ہم چاہیں تو فضائل کی دو قسمیں کر سکتے ہیں ایجابی اور سلبی مثلاً امید ایک ایجابی فضیلت ہے کیونکہ یہ صاحب امید کو جادۂ زندگی پر تیز گام بنانے میں امداد دیتی ہے لیکن اس کے برعکس زہد ایک سلبی اور منفی فضیلت ہے کیونکہ یہ زاہد کو ہر طرح کی بدحالی اور پریشانی پر صابر و قانع رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ فضائل کی یہ تقسیم ذہن نشیں کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غزالی نے اکثر زورِ بیان سلبی فضائل پر صرف کیا ہے مثلاً فقر، زہد، توکل، خوف گمنامی، تواضع اور بھوک وغیرہ

شجاعت، اقدام، اور حرص وغیرہ دوسرے وہ ایجابی فضائل جو انسان کو مملوکہ اشیائ کی حفاظت وصیانت اور غیر حاصل امور کی سعی وتحصیل پر آمادہ و مستعد کرتے ہیں، ان کے بیان سے غزالی نے کوئی خاص تعرض واعتنار نہیں کیا۔ حالانکہ تنہا یہی کافی نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو نفسی آفات سے محفوظ و مامون بنالے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زندگی کی جمیع حوائج وضروریات کو اپنے گرد جمع کرنے کے لئے سعی وعمل اور جد وجہد سے کام لے کیونکہ ضعف دپے ہمتی کی فضیلت وخوبی سے آراستہ ہونے کی نسبت انسان کے لئے کہیں بہتر ہے کہ وہ قوت وہمت کے رذائل وعیوب سے عیبناک اور داغدار ہو کیونکہ ضعف و دوں ہمتی بہمہ وجوہ شر ہے۔ اس میں خیر کا کوئی پہلو نہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اکثر لوگ ان دقیق امور کو سمجھنے کی اہلیت وصلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

فضائلِ فردیہ

اگر ہم چاہیں تو فضائل کی ایک دوسری تقسیم بھی کر سکتے ہیں فردی اور اجتماعی مثلاً قناعت ایک فردی فضیلت ہے کیونکہ اس کا تعلق صرف ایک مخصوص اور مشخص ذات سے ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس امانت ایک اجتماعی فضیلت ہے کیونکہ اس کی ضرورت اُس وقت پڑتی ہے جب انسان دوسروں سے کوئی معاملہ یا رابطہ پیدا کرتا ہے۔

غزالی نے اپنی بیشتر محنت فردی فضائل ہی کے بیان پر صرف کی ہے حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تالیفات اُن لوگوں کے لئے مرتب و مدون کی ہیں جو عزلت و خلوت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر آپ اس جدوجہد اور کشمکش کی زندگی سے کنارہ کش ہو کر خلوت و سکون کے گوشے کی راہ لینا چاہیں تو اس کے لئے آپ کو غزالی کے ہاں عجب عجب آداب و تعلیمات ملیں گی جو آپ کو مجبور کر دیں گی کہ آپ اسی وحدت و سکون کی زندگی پر قناعت کریں لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص سیاست و حرکت کے پرخروش عالم میں قدم رکھنا چاہیے تو اس کے لئے غزالی کے ہاتھ میں کوئی ایسا چراغ نہیں جس کی روشنی میں وزارت و سفارت وغیرہ کے مشکل و لاینحل عقدے حل کئے جا سکیں۔

اخلاق کے مختلف درجے

فضائل کے اصول و فروع جاننے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم آیا کسی انسان کے لئے اخلاق کے اعلیٰ درجوں تک رسائی ممکن بھی ہے یا نہیں؟

ہماری طرف سے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ غزالی کی رائے میں یہ رسائی ممکن ہے غور کیجیے کہتے ہیں:۔

"جس شخص میں یہ فضائل اخلاق جمع ہو جائیں اُسے حق پہنچتا ہے کہ لوگوں کی امامت و قیادت کرے اور لوگ اپنے تمام امور و افعال میں اسی کی تقلید و پیروی کریں لیکن جو شخص ان فضائل سے عاری و محروم ہے اُسے مناسب ہے کہ انسانوں کی آبادیوں

سے دور کسی ویرانے میں نکل جائے تاکہ لوگ اس کے فتنہ و شر سے محفوظ رہیں۔"

اعلیٰ ترین درجہ غزالی کے ہاں درجۂ نبوت ہے اور ان کی رائے میں صوفیہ سب سے زیادہ اس درجے کے قریب ہیں چنانچہ ان کے متعلق "المنقذ من الضلال" میں کہتے ہیں:۔

"اگر تمام دانشمندوں کی دانشمندی، تمام حکماء کی حکمت، اور تمام علما کے علم و تبحر کو اس لئے یکجا کر دیا جائے کہ اس سے صوفیہ کی سیرت و اخلاق میں ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر اور تبدیلی کی جا سکے تو یقین رکھئے کہ یہ ناممکن بلکہ محال ہے کیونکہ ظاہر و باطن میں ان کی تمام حرکات و سکنات براہ راست چراغِ نبوت سے مستنیر و بہرہ مند ہیں اور ظاہر ہے کہ نورِ نبوت سے بڑھ کر کوئی ایسا نور نہیں جس سے روشنی اور ہدایت کی طلب کی جا سکے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ صوفیہ کے احوال و مقامات پر جو تنقید ہم کر چکے ہیں اس سے غزالی کی اس رائے کی دیوار بنیاد ہی سے گر جاتی ہے کیونکہ غزالی صوفیہ کے جن احوال و واردات پر سر دھنتے ہیں حقیقت میں انھیں نورِ نبوت سے دور کا بھی کوئی تعلق اور واسطہ نہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدا نخواستہ نبوت اوہام و خرافات کا مجموعہ ہوتی ہے؟ تعالت النبوۃ عما تصفون۔ وہ آپ کا عقل و شرع کا پیمانہ کیا ہوا لائیے لائیے تنہا وہی اس باب میں حکم اور ثالث ہو سکتا ہے۔

پہلی فصل

فضیلتِ صدق

فضیلتِ صدق کا آغاز غزالی نے قرآن حکیم کی اس آیت سے کیا ہے (رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ[1]) اس کے بعد نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے

---

[1] کچھ لوگوں نے وہ عہد جو اللہ کے ساتھ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا

ان الصدق یھدی الی البر والبر یھدی الی الجنۃ وان الرجل یصدق حتی یکتب عند اللہ صدیقاً وان الکذب یھدی الی الفجور والفجور یھدی الی النار وان الرجل یکذب حتی یکتب عند اللہ کذاباً[1]

اس کے بعد کہتے ہیں کہ صدق کی خوبی وعمدگی کی یہی بڑی دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انبیاء کی مدح وتوصیف کے مواقع میں ان کی بڑی خوبی یہی بیان کی ہے مثلاً کہا واذکر فی الکتاب ابراھیم انہ کان صدیقاً نبیاً ہ واذکر فی الکتاب اسمٰعیل انہ کان صادق الوعد وکان رسولاً نبیاً ہ واذکر فی الکتاب ادریس انہ کان صدیقاً نبیاً

صدق کے مختلف مراتب

غزالی نے صدق کے چھ مختلف مراتب بیان کیے ہیں۔ صدقِ قول، صدقِ نیت وارادہ صدق عزم، صدقِ وفا، صدقِ عمل، صدقِ دین۔ جو شخص صدق کے ان تمام مراتب کے ساتھ موصوف ومتصف ہو اُسے صِدّیق کہتے ہیں اور جو ان میں سے صرف بعض کے ساتھ موصوف ہو اُسے صادق کہتے ہیں۔

(اول) صدق کی مشہور ترین قسم، صدقِ قول ہے چنانچہ جب تک کوئی اہم اور اشد شدید مصلحت دامن گیر نہ ہو جھوٹ بولنا ممنوع اور حرام ہے۔ بچوں اور عورتوں کی تادیب وتربیت کیلئے مصلحتاً جھوٹ بولنا یا کفار کے ساتھ جنگ کے موقع پر اس لئے جھوٹ سے کام لینا کہ وہ مسلمانوں کے خفیہ معاملات پر مطلع اور آگاہ نہ ہو سکیں روا اور جائز ہے۔ غزالی کہتے ہیں:۔

"جب کسی شخص کو ان مصالح میں سے کوئی مصلحت پیش آئے تو اس کو چاہیئے کہ دینی تقاضا و مصلحت کو سامنے رکھ کر کلام کرے، ایسے مواقع پر اگر سچ کے ساتھ کچھ جھوٹ کا شائبہ و آمیزش بھی شریک ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ صدق اس لئے مقصود ومطلوب نہیں

---

[1] سچائی نیکی تک پہنچاتی ہے اور نیکی جنت تک۔ ایک شخص برابر صداقت سے کام لیتا رہتا ہے تا آنکہ اللہ کے ہاں اسے صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ برائی تک پہنچاتا ہے اور برائی جہنم تک، ایک شخص برابر جھوٹ سے کام لیتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اسے جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

کہ خود اُس کی ذات و جوہر میں کوئی خوبی و عمدگی ہے بلکہ صرف اس لئے مقصود ہے کہ وہ حق اور دعوت الی الحق کا قوی ذریعہ اور وسیلہ ہے اس لئے مصلحت کے موقع پر صدق کی صورت سے زیادہ نگاہ اُس کے معنی اور مفہوم پر رہے گی ہاں مناسب اور بہتر یہی ہے کہ ایسے مواقع میں بھی جہاں تک ممکن ہو تو تعریض سے کام لیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مقام کے سفر کا ارادہ فرماتے تو اس کے نام میں توریہ کرتے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کفار کو آپ کی جہت سفر کا صحیح علم ہو جائے اور وہ آپ کا تعاقب کرنے لگیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جس شخص نے کچھ جھوٹ سے کام لے کر دو آدمیوں میں صلح کرا دی وہ جھوٹا شمار نہیں ہوگا اس طرح آپ نے مندرجہ ذیل تین مقامات میں مصلحت کے مطابق گفتگو کرنے کی رخصت اور اجازت دی ہے۔ دو شخصوں میں صلح و صفائی کرانے کے لئے۔ دو بیویوں میں صلح و آشتی باقی رکھنے کے لئے جنگی مصالح کے پیش نظر اخفائے راز سے کام لینے کے لئے۔ ان تمام امور میں صدقِ نیت اور ارادۂ خیر ہی کو ظاہر کلام پر فوقیت اور ترجیح دی جائے گی"

(دوم) صدقِ نیت و ارادہ۔ اس کا سارا دار و مدار اخلاص پر ہے بایں معنی کہ انسان کے تمام اعمال و افعال اور جمیع حرکات و سکنات کا باعث و سبب اللہ اور صرف اللہ ہی کی ذات ہو۔

(سوم) صدقِ عزم بعض اوقات انسان کسی عمل سے پہلے اس عمل کا عزم کر لیتا ہے مثلاً کہتا ہے "اگر اللہ نے مجھے مال و دولت دی تو سب کی سب یا اُس کا اتنا معین حصہ صدقہ کر دوں گا" بعض حالتوں میں تو اس عزم میں نہایت پختگی اور استواری ہوتی ہے لیکن بعض حالتوں میں اس میں ایک گونہ ضعف اور تردد موجود ہوتا ہے جو صدق عزم کے سراسر متضاد اور منافی ہے لہذا صدق عزم سے مراد یہ ہے کہ اس عزم میں پوری پختگی، استواری اور قوت موجود ہو۔

(چہارم) صدقِ وفا بالعزم۔ کبھی کبھار نفس ایک بات کا فوراً عزم کر لیتا ہے کیونکہ وعدہ اور عزم کر لینے میں کچھ دقت اور اشکال تو ہے نہیں لیکن وہی وعدہ و عزم جب ایک

حقیقت ہو کر سامنے آتا ہے اور انسان کو ایفا پر قدرت و تمکن حاصل ہو جاتا ہے لیکن نفسانی خواہشات رہ رہ کر مانع و عنان گیر ہوتی ہیں تو انسان کے وعدہ و عزم کا سارا تار و پود یکسر بکھر جاتا ہے اور وہ ایفا میں متامل و متردد ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ یہ باتیں صدق وفا کی سراسر منافی ہیں۔

(پنجم) صدق عمل۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام ظاہری اعمال و افعال اس کی حالت و کیفیتِ باطنی کا آئینہ و نمونہ ہوں اور وہ ریا و نمائش کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہو۔

(ششم) صدق دین۔ خوف، امید، زہد، توکل اور محبت میں ثابت قدمی سے کام لینا صدق دین کہلاتا ہے کیونکہ جہاں یہ امور ظواہر و صور رکھتے ہیں وہاں ان ہی امور کے کچھ حقائق و بواطن بھی ہیں جو نہایت گہرے اور عمیق ہیں۔ صادق وہ ہے جس کی رسائی ان گہرے اور عمیق حقائق تک ہو جائے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ صدق کا یہ معنی و مفہوم نہایت دقیق اور بہت پیچیدہ و مشکل ہے۔

دوسری فصل

فضیلتِ صبر

سقراط کی رائے میں فضیلت و خوبی کی بنیاد و اساس علم ہے جب انسان کو خیر کا علم ہو جائے گا تو وہ یقیناً اسے کر گزرے گا۔ اور جب شر کو جان جائے گا تو اس سے یقیناً باز رہے گا صبر کے بارے میں غزالی کی رائے بھی یہی ہے کہ اس کی بنیاد علم و معرفت پر ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ علم و معرفت یقین اور اذعان کی حد تک پہنچ چکا ہو تاکہ اس سے صبر وجود میں آسکے چنانچہ فرماتے ہیں

"مرغوبِ طبع اعمال سے انسان صرف صبر کی بدولت باز رہ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر کی وجہ سے دینی سبب و باعث، شہوت و خواہش پر غالب آجاتا ہے اور انسان کو یقین

ملہ ۷۶/ج ۴

آجاتا ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کی تعمیل دنیا و آخرت دونوں کی سعادت سے محروم رکھتی ہے

اور جب یہ یقین و اذعان ایمان کی حد تک مضبوط اور پختہ ہو جاتا ہے تو دینی اسباب و محرکات

نہایت قوی ہو جاتے ہیں اور انسان محسوس کرنے لگتا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہوات و خواہشات

ایک رہزن کا حکم رکھتی ہیں، چنانچہ وہ ان تمام کانٹوں سے دامن بچا کر دین ہی کی راہ پر گامزن

ہو جاتا ہے اور اپنے عمل کے لئے صرف دینی اعمال و افعال ہی کو چن لیتا ہے۔"

دوسرے مقام میں کہتے ہیں:۔

"صبر[1] سے مراد یہ ہے کہ یقین کے تقاضے کے مطابق کوئی عمل انجام پائے۔ کیونکہ تنہا یقین ہی یہ بتاتا

ہے کہ معصیت و نافرمانی حضرت رسالت اور طاعت و نیکی مفید و نفع بخش ہے۔ معصیت کا ترک

اور طاعت و نیکی پر مداومت، بغیر صبر کے ہرگز ممکن نہیں اور اس باب میں صبر سے مراد یہ ہے کہ

انسان دینی اسباب کو نفسانی اسباب پر قوی اور غالب بنالے

امیل پوارک کہتا ہے:۔

"فضیلت[2] کے لئے تنہا علم کو بنیاد قرار دینا کافی نہیں ہے کیونکہ کسی ضروری کام کا صرف علم و

تصور ہی اس کام کو وجود میں لانے کے لئے کفایت نہیں کرتا بلکہ اس علم کے ساتھ یہ بھی ضروری

ہے کہ وہ کام محبوب و مرغوب فیہ بھی ہو اور پھر انسان اس کام کے انجام دینے میں پوری طرح

آزاد و مختار بھی ہو۔"

امیل پوارک نے محبوبیت و حریتِ ارادہ کی جو قید لگائی ہے یہ بعینہٖ ویسی ہے جیسے غزالی

نے علم کو یقین و اذعان کے ساتھ مقید کیا ہے۔ کیونکہ انسان کو جب کسی چیز کی نفع مندی کا پورا

پورا یقین آجائے گا تو وہ لامحالہ اسے عزیز و محبوب بھی رکھے گا۔ ڈاکٹر منصور فہمی اور استاذ عبدہ

خیر الدین کی رائے ہے کہ سقراط نے جس علم و معرفت کو فضیلت کی بنیاد قرار دیا ہے اُن سے

مراد علم کی وہ پختگی ہے جس سے ارادہ اور پھر ارادے سے نفاذ و عمل وجود میں آسکے لہذا معلوم

ا۔ ۲ج۔ ۷۰ ص۔ ۲ COURS ELEMENTAIRES DE PHILOSOHIE P. 343

ہوا کہ سقراط کی رائے بالکل صحیح و درست اور ہر طرح جامع و مانع ہے۔

صبر کے مختلف اسماء

غزالی کہتے ہیں کہ انسان جس معاملے میں صبر سے کام لے گا اُس کے اعتبار و نسبت سے صبر کے نام بھی تبدیل ہوتے جائیں گے۔ تو گویا صبر بے شمار فضائل کا مجموعہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ صبر نصف ایمان ہے۔ اگر شکم اور شرمگاہ کے تقاضوں کی خلاف ورزی کی جائے تو اس صبر کو عفّت کہتے ہیں۔ اگر کسی مکروہ و ناپسندیدہ امر کی برداشت کے سلسلے میں ہو تو اسے صبر کہتے اور اس کی ضد جزع کہلاتی ہے۔ اگر تونگری و دولت مندی کے بارے میں ہو تو یہ ضبطِ نفس اور اس کی ضد بطر (اترانا)، اگر جنگ میں ہو تو یہ شجاعت اور اس کی ضد جبن (بزدلی) اگر ضبطِ غضب میں ہو تو یہ حلم (بردباری) اور اس کی ضد تذمر (تنگ ظرفی) اگر کسی پریشان کن حادثے میں ہو تو یہ وسعتِ صدر اور اس کی ضد ضجر (تنگ حوصلگی) اگر کسی راز کے اخفاء میں ہو تو اسے کتمانِ سر کہتے ہیں۔ اگر عیاشی میں ہو تو اسے زہد اور اس کی ضد حرص کہلاتی ہے۔ اگر متاعِ دنیوی میں سے صرف قلیل پر صبر کیا جائے تو اسے قناعت اور اس کی ضد کو شرہ (شدتِ طمع) کہتے ہیں۔

صابرین کے اقسام و درجات

صبر کے اعتبار سے انسان کی تین مندرجہ ذیل حالتیں ہو سکتی ہیں۔

(پہلی حالت) انسان ہوائے نفسانی کے دواعی و اسباب پر اس طرح غالب آجائے کہ کوئی خواہش سر اٹھانے کی جرأت ہی نہ کر سکے یہ حالت و کیفیت صرف دوامِ صبر ہی کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے۔

(دوسری حالت) ہوائے نفسانی کے دواعی و اسباب انسان پر غالب آجائیں بحدیکہ دینی سبب و باعث بالکل ماند اور کمزور پڑ جائے۔ تینوں حالتوں میں یہ حالت سب سے زیادہ خطرناک اور مذموم ہے۔

(تیسری حالت) ہدایت و ضلالت کے مابین کش مکش اور نزاع برابر جاری رہے۔

صبر کا حکم

حکم کے اعتبار سے صبر کی چار قسمیں کی جا سکتی ہیں، فرض، نفل، مکروہ اور حرام، شرعی محظورات یعنی محرمات سے صبر، فرض اور شرعی مکروہات سے صبر نفل ہے۔ جو اذیت شرعاً ممنوع ہے اُس کے باب میں صبر بھی ممنوع و حرام ہے۔ مثلاً کسی شخص کا اپنا یا اس کے کسی بیٹے کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہو اور وہ صبر سے کام لے کر خاموش رہے۔ یا مثلاً کسی کی بیوی کے ساتھ کوئی شخص حرام کا قصد کرے اور وہ شخص غیرت مند ہونے کے باوجود اس موقع پر اظہارِ غیرت سے باز رہے اور جو کچھ اس کی بیوی کے ساتھ کیا جا رہا ہے اُس پر برابر خاموش رہے ایسی حالتوں میں صبر قطعاً حرام اور ممنوع ہے۔ صبر مکروہ سے مراد اُس ایذا پر صبر ہے، جو انسان کو مکروہ راہ سے پہنچے، مثلاً کسی کی بیوی کی طرف غیر شخص کی نگاہ ہے۔

صبر کی ضرورت

غزالی کی رائے میں صبر کی ضرورت ہر حال میں ہے جس طرح کسی انسان کو مصیبت و تکلیف میں صبر کی ضرورت و حاجت ہے۔ اسی طرح وہ راحت و مسرت میں بھی صبر کا محتاج ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ راحت و مسرت میں صبر کی ضرورت اور شدید ہے حقیقت میں صالح و نیک آدمی وہی ہے جو عافیت و آرام میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے۔ راحت اور سکھ میں صبر سے مراد یہ ہے کہ وہ انفاقِ مال سے اللہ کے حقوق کی رعایت و حفاظت کرے خلقِ خدا کی اعانت و امداد میں کوئی قصر اٹھا نہ رکھے اور زبان کو صدق اور سچائی کے لئے پوری طرح وقف کر دے۔

طاعت و عبادت بھی صبر کی محتاج ہے کیونکہ نفس بالطبع عبادت سے گریز کرتا ہے۔ طاعت پر صبر و استقامت کی تین حالتیں ہیں۔ پہلی حالت یہ کہ طاعت سے قبل نیت صحیح، خالص اور نمائش و ریا کے شائبہ و آمیزش سے بالکل پاک ہو، دوسری یہ کہ عبادت کی اثنا میں اُسے کسی قسم کی سستی اور کسل لاحق نہ ہو، تیسری یہ کہ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد نہ تو اُس کا چرچا

کرتا پھرے اور نہ ہی خود پسندی اور خود نگری کے جذبات کو اپنے اندر اُبھرنے اور پنپنے کا موقع دے۔

معاصی کے باب میں بھی انسان کو صبر کی ضرورت ہے بالخصوص اُن معاصی میں جن کے ساتھ انسان عادتاً ملوث ہے۔ کیونکہ یہاں دوگونہ مصیبت ہے یعنی عادت و شہوت دونوں کا اجتماع۔ پھر انسان کی طبیعت و فطرت بھی عجیب و غریب واقع ہوئی ہے۔ معصیت جس قدر سہل ہوگی انسان کا صبر اُس کے بارے میں اُتنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً زبان کی معصیتیں، غیبت جھوٹ، کٹ حجتی، خودستائی اور مذاق وغیرہ سے باز رہنا اُسی قدر کٹھن اور دشوار ہے جس قدر اُن کے ساتھ زبان کو آلودہ کرنا سہل اور آسان ہے۔ انسان لاکھ احتیاط کرے لیکن صراحتاً یا تعریضاً ان معاصی میں سے کسی نہ کسی معصیت کے ساتھ اُس کا دامن کہیں نہ کہیں سے ضرور آلودہ و ملوث ہو ہی جائے گا۔

دوسروں کا دکھ اور ایذا سہنا بھی فضیلت و عمدگی کی دلیل ہے لیکن سب سے بڑھ کر فضیلت یہ ہے کہ انسان مصائب و نوائب میں صبر و شکیب سے کام لے اور جزع و فزع کو قلب و دماغ کی طرف راہ نہ پانے دے مثلاً اُس کے اعزہ و اقارب میں سے کوئی مر جائے یا اُس کا مال و دولت تباہ ہو جائے یا اُس کی صحت و تندرستی جواب دے دے تو ایسے حالات میں اُسے صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہنا چاہیے۔ غزالی کی رائے میں مصیبت کے وقت انسان کے قلب کی اندوہناکی اور آنکھوں کی اشک ریزی صبر و شکیب کے منافی نہیں ہے کیونکہ بتقاضائے بشریت ایسا ہونا ناگزیر ہے اور جب تک انسان اس دنیا میں زندہ ہے درد و کرب اور گریہ و بکا کے پنجے سے چشم و دل کو کسی صورت بچا نہیں سکتا۔

جو شخص نفسانی خواہشات سے دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہو اور آبادی کو چھوڑ کر کہیں دور ویرانے میں جا خلوت گزیں ہو وہ بھی صبر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اُسے بھی اپنی اس خلوت و عزلت پر باقی و دائم رہنے کے لئے صبر کی ضرورت ہے ان امور سے غزالی ثابت یہ کرنا

چاہتے ہیں کہ انسان کی کوئی سی حالت و کیفیت بھی کیوں نہ ہو وہ اپنے جمیع احوال و اعمال میں صبر کا شدید محتاج ہے۔

اپنے اندر صبر کا ملکہ پیدا کرنے کا طریق

شہوت و خواہش کے باعث و سبب کو ضعیف و کمزور کرنے اور دین کے سبب و باعث کو قوی کرنے سے صبر کا ملکہ وجود میں آتا ہے۔ شہوت کے اسباب کو کمزور کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان اسباب کا جو مادہ واصل ہے اس میں نوع و کثرت کے اعتبار سے کمی کر دی جائے یا خواہش کے جملہ اسباب ہی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے یا جس قسم کی خواہش میں کوئی مبتلا و گرفتار ہے اس کی مجانس مباح چیزوں ہی صرف قناعت و اکتفا کرے۔ دین کے اسباب کو قوی کرنے کے دو طریق ہیں اول یہ کہ ریاضت و مجاہدہ کے فوائد پر نگاہ رکھی جائے اور ان احادیث و آثار میں غور و فکر کیا جائے جو صبر اور اس کے نتائج کی تعریف میں وارد ہوئی ہیں۔ دوم یہ کہ دینی محرک کو نفسانی خواہش کے محرک کی کش مکش کا عادی و خوگر بنایا جائے تاکہ انسان کو نفسانی خواہشات کے مقابلے کی عادت اور مشق ہو۔

تیسری فصل

گمنامی کی فضیلت

غزالی گمنامی کو بھی فضیلت کی بات سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں کیا فضیلت ہو سکتی ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ غزالی کا یہ نقطۂ نگاہ ایک ایسی خاص بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو اخلاق کے باب میں ان کی رائے کے سمجھنے میں بہت مدد اور معاون ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جب غزالی گمنامی اور خمول کی طرف دعوت دیتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہرگز

نہیں ہوتا کہ انسان ان تمام ذاتی خصائص و امتیازات کو یکسر خیرباد کہدے جو شہرت اور ناموری کا موجب بنتے ہیں بلکہ غزالی صرف اُس شہرت کے دشمن اور مخالف ہیں جو تکلف اور تصنع کی راہ سے حاصل کی جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص ریا و نمائش کے بغیر صرف اپنی خوبیٔ اعمال و افعال کی بدولت شہرت و ناموری حاصل کر لیتا ہے تو اس میں کوئی عیب اور کوئی قباحت نہیں۔

غزالی نے ایک نہایت لطیف اور عمدہ پیرایہ میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ بعض اوقات اساتذہ و معلمین کی نیک نامی انھیں بُری طرح بگاڑ دیتی ہے۔ مثلاً وہ اس خواہش کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اُن کے درس میں طلبہ کا ایک جم غفیر شریک ہو۔ فرض کیجئے اگر اُن کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تو پڑھانے میں اُن کا جی نہیں لگتا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے ابوالعالیہ کا یہ واقعہ خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ جب اُن کے گرد تین سے زائد طلبہ جمع ہوتے تو وہ اُٹھ کر چلے جاتے غزالی اس بات سے بھی غافل نہیں کہ امراء کے گرد جمع ہونا اُن کے لئے باعث فتنہ اور جمع ہونے والوں کے لئے باعثِ ذلت و رسوائی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس باب میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک نہایت جامع اور گراں قیمت قول نقل کیا ہے۔

غزالی کہتے ہیں :-

"اگر تم کہو کہ انبیاء، خلفاء اور ائمۂ علماء کو دنیا میں جو شہرت و ناموری حاصل ہوئی اس سے بڑھ کر کیا شہرت و ناموری ہو سکتی ہے تو کیا ان کو گمنامی و خمول کی فضیلت و خوبی کبھی نہ سوجھی اس کا جواب یہ ہے کہ ناپسندیدہ و مذموم شہرت نہیں بلکہ طلب شہرت ہے۔ اگر تکلف و تصنع کی دکان آراستہ کئے بغیر اللہ کی جانب سے کسی کو شہرت کی دولت میسر آجائے تو اس میں کوئی بے ہودگی اور کوئی قباحت نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جہاں یہ شہرت اقویاء کے لئے سراپا رحمت و نعمت ہے وہاں ضعفاء کے لئے ایک گونہ فتنہ و آزمائش کا حکم رکھتی ہے۔ اِن کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کمزور اور ناتواں شخص دریا کی موجوں میں تھپیڑے کھا رہا ہو۔ اس حالت میں بہتر یہی ہے کہ دوسرے ڈوبنے والوں کو اس کے وجود کا علم نہ ہو ورنہ سب اس کا

سہارا لینے کی کوشش کریں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نہ خود بچ سکے گا اور نہ دوسروں کو بچا سکے گا۔ لیکن ایک قوی تنومند اور پیراک کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کے متعلق بہتر یہی ہے کہ ڈوبنے والوں کو اس کا علم ہو جائے تاکہ وہ اس کا سہارا لے کر نجات پائیں اور اسے اس کا اجر و ثواب ملے۔"

تو گویا غزالی کی رائے میں نیک و صالح داعی ہے۔ جو ہر لحہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوشاں رہے۔ اسے اس بات کی مطلقاً پروا نہ ہو کہ لوگوں کی بھیڑ اس کے گرد جمع ہو رہی ہے یا ناراض اور بددل ہو کر اس کے پاس سے چھٹ رہی ہے۔

چوتھی فصل

توکّل

غزالی نے توکل کے بارے میں احیاء العلوم میں بچونن صفحات، اربعین میں تیرہ صفحات اور منہاج العابدین میں ستائیس صفحات سپرد قلم کئے ہیں۔ احیاء اور اربعین کی نسبت منہاج میں وہ زیادہ ژرف نگاہی اور تہہ رسی سے کام لیتے ہیں اس لئے کہ احیاء اور اربعین میں بجز طوالت اور اختصار کے اور کوئی فرق نہیں۔ بلکہ اکثر اوقات تو اربعین میں احیاء کا حوالہ دے کر بعض مسائل کو تشنہ و نامکمل چھوڑ دیتے ہیں۔

منہاج جیسی مختصر سی کتاب میں غزالی نے توکل کے بیان میں اس قدر اہتمام اور بسط و تفصیل سے کام لیا کہ آخر انہیں اس طوالت و اطناب کے لئے معذرت خواہ بھی ہونا پڑا۔ اس اہتمام شان سے اور کچھ فائدہ ہو نہ ہو اتنا ضرور ہے کہ اس سے ہمیں زندگی کے اہم اور مختلف پہلوؤں میں غزالی کے نقطہ نگاہ کے سمجھنے میں بڑی امداد ملتی ہے۔

ہم یہیں یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ غزالی جس توکل کی طرف دعوت دیتے ہیں

وہ حقیقت میں سرتاپا رہبانیت اور قطع علائق کی دعوت ہے۔ انسان کو اپنے تئیں رفتہ رفتہ بھوک اور پیاس کا خوگر بنانے اور منجملہ نعمتوں کے موت کو بھی ایک نعمت شمار کرنے کی نصیحت و تلقین ہے۔

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ علماء کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح لوگوں کیلئے ایک نمونہ و مثال ہونا چاہیئے جو مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد بھی خرید و فروخت کے لئے بازار تشریف لے جایا کرتے تھے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ غزالی کا نظریہ اس کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں۔

"جب رزق کے لئے تگ و دو اور محنت عام اہل دین کو زیب نہیں دیتی تو علماء کے شایان شان کیسے ہوسکتی ہے؟ کیونکہ ان کے لئے تو شرط اول یہ ہے کہ قناعت سے کام لیں۔ قناعت پیشہ عالم اور اس کے رفقاء کا رزق خود بخود اُن تک پہنچتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ظاہر پرست عالم جو باطن کی دولت سے محروم و ناآشنا ہے۔ دوسروں کے ہاتھ سے کچھ قبول کرنا پسند نہ کرے اور رزق کے لئے خود کسب و محنت سے کام لے تو اس کے لئے یہ جائز ہے لیکن اہل باطن کو اس تگ و دو سے مجتنب رہنا چاہیئے اور جو کچھ دوسرے اُن کے ہاتھ پر رکھیں اُسے قبول کرلینا چاہیئے کیونکہ اس سے دو فائدے ہوں گے ایک تو یہ کہ معطی کو اجر و ثواب ملے گا دوم یہ کہ عالم پوری یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ عبادت الٰہی میں مشغول رہ سکے گا۔ اور بصورت دیگر وہ پراگندہ دل اور پریشان خاطر رہے گا۔"[1]

اگر غزالی حکومتوں کو اس بات کا مشورہ دیتے کہ وہ علماء کی اعانت و دست گیری کریں تاکہ وہ رزق کے لئے طلب و سعی کی بجائے اپنی تمام محنتیں اور کوششیں علم و دانش کی نشر و اشاعت اور اس کی خدمت و چاکری کے لئے وقف کردیں تو یہ زیادہ قرین صواب ہوتا۔ لیکن یہ کہنا کہ کسب و محنت عبادت میں حارج ہے اور علماء کے مناسب یہی ہے کہ وہ لوگوں کے عطیے قبول کرکے انھیں اجر و ثواب حاصل کرنے کا موقع دیں۔ ایک ایسا نظریہ ہے جو ترقی

---

[1] ج ۳ ص ۲۸۶

کی بجائے انحطاط کا درس دیتا ہے۔ اور علما کے قدر و مرتبہ اور عزت و وقار کے سراسر منافی ہے۔

دست سوال دراز کرنے کی کراہت و ممنوعیت

باوجودیکہ غزالی عالم کے لئے اس مصلحت سے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی اجازت دیتے ہیں "تاکہ اس سے معطی کو اجر و ثواب ملے" تاہم دوسری جگہ کہتے ہیں بغیر کسی شدید حاجت و ضرورت کے کسی سے کچھ مانگنا حرام اور ممنوع ہے کیونکہ اس میں کئی قباحتیں ہیں اول یہ کہ کسی کے سامنے فقر و احتیاج کا اظہار اللہ کی شکایت کے مرادف ہے۔ دوم اس میں سائل کی ذلت و رسوائی ہے حالانکہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے ذلت و عاجزی نہ کرے، سوم کسی سے سوال کرنا حقیقت میں اسے دکھ میں ڈالنا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کچھ دینے کو اس کا جی نہ مانے تو اس حال میں اگر وہ کچھ دے گا بھی تو یا تو شرم و حیا کی وجہ سے اور یا نمائش و ریا کی وجہ سے اور ان دونوں حالتوں میں اس سے کچھ لینا یا قبول کرنا قطعاً حرام اور ممنوع ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزالی نے سوال کی اجازت و اباحت میں کمالِ احتیاط سے کام لیا ہے لیکن اس کے باوجود دل میں اتنی خلش ضرور باقی رہتی ہے کہ علم اور دین کی اس سے بڑھ کر کیا ذلت و اہانت ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص محض دوسروں پر تکیہ اور اعتماد کر کے خود عبادت و ریاضت میں مصروف و مستغرق رہے۔ کیا کوئی ہوشمند آدمی ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو باور کرسکتا ہے کہ طلب معاش کے لئے کوئی شخص نوافل تک کو ترک کرنا گوارا نہ کرے لیکن بھیک مانگنا گوارا کرلے۔

محنت و مزدوری کا حکم

توکل کی شدت تلقین کے باوجود غزالی محنت و مزدوری اور رزق کی طلب و جستجو کو ہر حال میں توکل کے منافی نہیں سمجھتے۔ اُن کی رائے میں یہ درست نہیں ہے کہ کوئی شخص توکل کے معنی یہ نہ سمجھے کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جایا جائے اور کل حلال کی بالکل کوئی

تدبیر ہی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ توکل کا جاہلانہ تصور ہے اور شرعاً ممنوع و حرام ہے۔ شرع نے جا بجا متوکلین کی تعریف و توصیف کی ہے ظاہر ہے کہ محرمات دین کے ارتکاب کے ساتھ کوئی شخص مدح و ثنا کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے؟"

غزالی نے بوضاحت بیان کر دیا ہے کہ حصول مقاصد کے لئے سعی و طلب میں انسان کی کئی حالتیں ہو سکتی ہیں یا تو وہ کسی ایسے فائدہ و منفعت کے حصول کی کوشش کرے گا جو محنت و عمل سے قبل اُس کے پاس موجود نہیں ہے یا جو نافع و مفید چیز اُسے حاصل ہے اُس کی حفاظت و صیانت کے لئے جد و جہد کرے گا یا کسی ایسی مضرت و مصیبت کے رفع کرنے کے لئے ساعی ہو گا جس کا وہ متوقع ہے مثلاً چوروں اور ڈاکوؤں کے دفاع کی تدبیر یا کسی ایسی مصیبت کو زائل کرنے کی فکر کرے گا جس کا وہ شکار ہو چکا ہے مثلاً کسی شدید مرض کا علاج و معالجہ۔

اسباب مفیدہ کے اعتبار سے نافع چیز کے تین درجے ہیں یقینی ظنی اور وہمی، اول الذکر کے علاوہ دوسری دونوں حالتوں پر نفس کو اطمینان اور اعتماد بہت کم ہوتا ہے۔

یقینی سے مراد اسباب و مسببات کا وہ مربوط اور غیر مبدل سلسلہ ہے جو آفرینش عالم ہی سے اللہ نے اس دنیا میں قائم کیا ہے۔ مثلاً کوئی بھوکا شخص اپنے سامنے دسترخوان پر کھانا رکھے ہوئے دیکھے لیکن صرف اس خیال سے اُس کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے یا نہ کھائے کہ یہ توکل کے خلاف ہوگا۔ غزالی کی رائے میں یہ توکل نہیں جنون ہے کہتے ہیں :-

"اگر تم یہ سمجھو کہ بغیر کھانے کے اللہ تمہیں شکم سیر کر دیں گے یا روٹی میں حرکت پیدا کر دیں گے اور وہ خود بخود تمہارے منہ میں پہنچ جائے گی یا کسی فرشتے کو مقرر کر دیں گے جو کھانا چبا کر تمہارے حلق سے معدے میں اتار دے گا تو یاد رکھو کہ تم سنت الٰہی سے بالکل جاہل اور بے خبر ہو۔ یا اسی طرح اگر کوئی سمجھے کہ بغیر بیج بونے کے فصل اُگ آئے گی یا مباشرت کے بغیر ہی کسی عورت کے ہاں بچہ ہو جائے گا۔ تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا شخص متوکل نہیں مجنون ہے۔"

غزالی کی رائے ہے کہ اس مقام میں توکل کا تعلق عمل کی بجائے علم سے ہے یعنی اس علم کے ساتھ آپ مفیدِ مطلب اسباب کو اختیار کریں کہ ان اسباب کی مسبب صرف اللہ کی ذات ہے ظنی سے مراد وہ اسباب ہیں جن کا مفیدِ مطلب ہونا یقینی اور حتمی تو نہیں لیکن ان اسباب کے بغیر مسببات کا وجود و وقوع میں آنا قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص آبادیوں اور قافلوں کو چھوڑ کر تنہا متوکلاً علی اللہ بغیر کسی زادِ راہ کے ویران جنگلوں اور صحراؤں کا سفر اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرطِ توکل نہیں بلکہ اس کے برعکس متقدمین کی سنت و شرطِ توکل یہ ہے کہ زادِ سفر کا معقول انتظام کر کے سفر کے لئے نکلنا چاہیئے۔

اسی موقف و مقام کی نزاکت و سنجیدگی سے بحث کرتے ہوئے غزالی نے منہاج میں بڑی زبانی اور اسراف سے کام لیا ہے فرماتے ہیں:-

"اگر تم سوال کرو کہ زادِ سفر کے بغیر جنگل کا سفر جائز ہے یا نہیں تو میں کہوں گا کہ اگر تمہارا دل قوی، اور اللہ کے وعدے پر تمہارا ایمان مضبوط اور پختہ ہے تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں اور اگر ایسا نہیں تو تمہیں بھی عام لوگوں کی طرح سفر کا توشہ و زاد ساتھ لے کر چلنا چاہیئے"[1]

آدابِ مسافر کے متعلق غزالی نے جو کچھ لکھا ہے اگر ہم اس کا بغور مطالعہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھوں نے یہاں کمال احتیاط سے کام لیتے ہوئے مسافر کو کھانا ساتھ لے کر چلنے کی وصیت و تلقین کی ہے اور پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ اگر ممکن ہو اپنی ضرورت سے زائد و فاضل لے کر چلنا چاہیے تا کہ اس سے دوسرے رفقاءِ سفر کی تواضع کی جا سکے۔ میں حیران ہوں کہ غزالی نے اس سے پہلے یہ کیا کہا کہ توشہ و زاد ساتھ لے کر چلنا عوام کا شیوہ و شعار ہے۔ چلیئے یہ عوام ہی کا شیوہ و شعار سہی لیکن الحمد للہ تدبیر و احتیاط سے خالی ہرگز نہیں۔

غزالی نے یہاں محسوس کیا کہ کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ زادِ سفر کی تیاری اگر

---

[1] ص ۸۲

توکل وللہیت کے منافی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں کیا چنانچہ خود ہی اس کا جواب بھی مرحمت فرما دیا کہ میں کب کہتا ہوں کہ یہ فعل حرام ہے۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ جس شخص کی قوتِ ایمانی مضبوط ہے اُس کے مناسب یہی ہے کہ وہ زاد راہ کی پروا نہ کرے۔ میں سمجھتا ہوں اس قسم کی توکل کی اساس وبنیاد اُس زہد فروشی اور حیلہ پروری کے بغیر اور کیا ہو سکتی ہے جس کے جواز وصحت سے عقل وشرع دونوں ابا، اور انکار کرتی ہیں۔

غزالی نے یہاں پھر یہ محسوس کیا کہ ممکن ہے مسافر کی زادِ راہ سے بے نیازی اور بے التفاتی اس کی موت وہلاکت کا موجب ہو جائے سو اُس کے جواب میں کہتے ہیں اس مقام کے لئے شرطِ اول یہ ہے کہ ایسا شخص پہلے اپنے نفس کو پوری طرح سدھالے اور چھ سات روز تک بھوک کی شدت برداشت کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلے نیز اس بات کی بھی مشق کرلے کہ اگر کھانا میسر نہ آئے تو گھانس پھونس اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر بسر اوقات کرسکے۔ کیونکہ چھ سات روز کے متواتر سفر کے بعد ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی آبادی میں پہنچ جائے گا اور اگر ایسا بھی نہ ہو سکا تو کم از کم ایسے مقام میں تو ضرور پہنچ جائے گا جہاں اس کو کچھ سبزہ اور گھاس میسر آجائے اور وہ اس سے اپنی آتش شکم کو بجھا سکے۔

چونکہ توکل کی اس عجیب وغریب صورت کی طرف غزالی جمہور مسلمین کو دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ بجنسہ اُن کے الفاظ آپ کے سامنے پیش کردوں کہتے ہیں:۔

"اگر تم اس شخص کے متعلق میری رائے دریافت کرو جو شہروں اور آبادیوں میں رہ کر بھی اپنی روزی کمانے کے لئے ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا کہ آیا اُس کا یہ فعل حرام ہے یا مباح ہے یا مستحب تو یاد رکھو اُس کا یہ فعل حرام کسی صورت نہیں ہو سکتا، کیونکہ زادِ راہ کے بغیر دشوار گذار جنگلوں اور صحراؤں کا سفر اگر موت وہلاکت کی طرف قدم بڑھانے کے مرادف نہیں ہو سکتا تو ایسے شخص کا رزق کمانے سے کنارہ کشی کرنا جو انسانوں کی

آبادیوں میں موجود ہے موت و ہلاکت کے مرادف یا بالفاظ دیگر ممنوع و حرام کیسے ہو سکتا ہے بلکہ بعید نہیں کہ سعی و طلب کے بغیر ہی رزق اُس تک برابر پہنچتا رہے، اور فرض کیجئے کہ رزق کے آنے میں کبھی کچھ دیر یا تاخیر بھی ہو جائے تو وہ اس اثنار میں صبر بھی کر سکتا ہے ہاں اگر کوئی شخص گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے کہ اُس تک کسی کے پہنچنے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے تو یقیناً یہ حرام ہے۔ اگر کوئی شخص گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر بیکار بیٹھا رہے اور عبادت و ریاضت سے کوئی تعرض نہ کرے تو اُس کے لئے مناسب اور بہتر یہی ہے کہ روزی کی تلاش و جستجو میں گھر سے باہر نکلے لیکن فرض کیجئے کہ بے کار رہنے کے باوجود باہر نہیں نکلتا تو بھی اُس کا یہ فعل اُس وقت تک حرام نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بھوک سے نڈھال اور جاں بلب نہ ہو جائے کیونکہ اس حالت میں گھر سے نکلنا، محنت و مزدوری کرنا یا کسی سے کچھ سوال کرنا اُس پر فرض اور ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ہر وقت عبادت و زہد میں مستغرق رہے اور اللہ کی ذات اور اُس کے فضل و احسان پر نگاہ جما کر جمیع ما سوی اللہ سے یکسر انقطاع اور یکسوئی اختیار کر لے تو وہ اس پر لائق زجر و ملامت نہیں بلکہ مستحق مدح و توصیف ہے۔"

حیرت ہے کہ غزالی کے مذکورہ بالا قول و اقتباس، اور اسی صفحہ پر دوسرے قول و رائے میں تطبیق کیسے دی جا سکتی ہے جہاں کہتے ہیں:۔

"اسباب رزق سے دوری اور بُعد اختیار کرنا دانشمندی کے خلاف اور اللہ کی سنت جاریہ سے غفلت و جہالت اور بے خبری کا نتیجہ ہے۔"

الا یہ کہ بھیک مانگنے کو بھی منجملہ اسباب رزق کے ایک سبب قرار دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ یہ سبب انتہائی حقیر اور مذموم ہے۔

میں یہاں اس امر پر بھی مطلع کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ سوال اور توکل کے مابین ایک گونہ تضاد و تنافی موجود ہے اور جس قوم کی تربیت ایسے حقیر اور مبتذل اخلاق سے کی جائے گی

وہ عروج و ترقی کے مدارج عالیہ تک کیسے رسائی حاصل کر سکتی ہے؟

نیز جو شخص کھانا موجود ہونے کے باوجود نہیں کھاتا اور دوسرا جو بغیر زاد راہ کے جنگلوں اور صحراؤں کا سفر اختیار کرتا ہے ان دونوں میں بجز اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ ثانی الذکر کو اتفاق سے کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے جو اس کے ہاتھ پر کچھ صدقہ رکھ دے یا یہ ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں گھانس پھونس سے اپنا پیٹ بھر لے۔ اگر غزالی کو اس امر کا احساس ہوتا کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہر کیف بہتر ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بنی نوع انسان کے سر پر فضیلت و برتری کا تاج رکھ کر اسے سمندروں اور صحراؤں کے سفر کی طاقت و ہمت دی اور عمدہ و حلال رزق سے اسے نوازا تو ایسے گھٹیا اور ہلکے رزق کو انسان کے لئے کبھی پسند اور گوارا نہ کرتے۔ اور ایسے حواس باختہ اور خام عقل لوگوں کو متوکلین کے زمرہ و گروہ میں کبھی شامل نہ کرتے۔

تیسرا درجہ و مقام یہ ہے کہ انسان رزق کے لئے اُن اسباب و وسائل کو اختیار کرے جن کا مسببات تک پہنچانا یقینی اور قطعی نہیں ہے۔ مثلاً اکتساب رزق کے لیے دقیق سے دقیق تر اور باریک سے باریک تر تدابیر و طرق اختیار کرنا۔ غزالی کہتے ہیں:-

"عام لوگوں کا شیوہ و شعار یہی ہے کہ وہ کسب رزق و معیشت کے لئے دقیق ترین راہیں اختیار کرتے ہیں لیکن یہ سراسر توکل کے منافی ہے۔"[۵]

جب کسب حلال کے لئے حیلہ و تدبیر کرنا توکل کے منافی ہے تو ظاہر ہے کہ ممالک و اقوام کی جد و جہد اور سعی و کوشش کا ایک اہم ترین پہلو ساقط و منہدم اور بے کار ہو گیا غزالی نے ایک سے زائد مقامات میں انسان کو روزی کے لئے سعی و طلب سے متنفر اور برگشتہ خاطر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جہاں انھوں نے تاجر کے مناسبات کا ذکر کرتے ہوئے اسے نصیحت کی ہے کہ اس کے مناسب یہ ہے کہ وہ تو سب سے پہلے بازار

---

[۵] ج ۴ ص ۲۸۸

میں قدم رکھے اور نہ ہی سب سے آخر میں بازار سے نکلے وہاں ہم نے غزالی کی اس رائے پر سیر حاصل جرح و تنقید کی ہے۔

ہم یہاں اس امر پر بھی مطلع و آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ توکل کا یہ مفہوم سراسر لغو اور غلط ہے اور غزالی کوئی معصوم نہیں ہیں کہ ان سے خطاء یا غلطی ہو ہی نہ سکے۔

متوکلین کے مدارج و مقامات

متوکل کے مندرجہ ذیل تین مقامات ہیں۔

اول یہ کہ کوئی شخص راضی برضا ہو کر بغیر کسی زادِ سفر کے جنگلوں اور صحراؤں کا سفر اختیار کرے، غزالی کی رائے میں یہ مقام افضل اور برتر اس لئے ہے کہ اس سے رضاء الٰہی پر کامل بھروسے اور اعتماد کا ثبوت ملتا ہے۔

دوم کوئی شخص شہروں اور آبادیوں میں اپنے گھر یا مسجد کے لئے وقف ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام پہلے مقام سے کمتر ہے۔

سوم مقام وہ ہے جو غزالی نے آداب کسب میں بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ کاسب کا مقصد مال و دولت کی کثرت و فزونی نہ ہو اور نہ ہی وہ اپنے سامان رزق پر اعتماد اور بھروسہ کرے سبحان اللہ گویا رزق کے لئے جدوجہد کرنا بھی توکل کا ادنیٰ اور کمترین درجہ ٹھہرا؟

عیال دار کی توکّل

توکل کے مذکورہ بالا شدید اور اہم درجے کو غزالی مجرّد و منفرد اور کنوارے کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں اور یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ غزالی کی رائے میں متوکل کا انتہائی درجہ و مقام یہ ہے کہ منجملہ ارزاق کے موت کو بھی ایک رزق و غنیمت سمجھے۔

رہا ایک شادی شدہ اور عیالدار شخص، سو اس کے متعلق اُن کی رائے ہے کہ اسے اپنے اہل و عیال کے لئے کسب محنت سے کام لینا چاہیئے جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

بنفس نفیس محنت و مزدوری سے کام لیا کرتے تھے:۔

"اللہ کی توکل اور بھروسے پر بیوی بچوں کو گھر میں چھوڑ کر خود جنگلوں میں نکل جانا یا آبادیوں میں رہ کر ان کی قوت لایموت سے بے نیازی برتنا شرعاً حرام ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسی ناجائز حرکتیں اُن کی موت اور تباہی کا سبب بنتی ہیں اور صاحب عیال اس کے لئے اللہ کے ہاں مسئول و ماخوذ ہوگا۔ حق اور درست صورت یہ ہے کہ اگر بیوی اور بچے اپنی خوشی اور رضا سے بھوک کے شدائد پر صبر کریں اور سمجھیں کہ بھوکا مرنے کی وجہ سے انھیں اللہ کے ہاں اجر و ثواب ملے گا تو ایسی حالت میں صاحب عیال کے لئے جائز ہے کہ اپنی طرح اُن کے بارے میں بھی توکل سے کام لے۔"

یہ غزالی کی محض سینہ زوری اور سخن پروری ہے کہ وہ ایک باال وعیال کو بھی اس امر کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنے بچوں کو بھی بھوک کا عادی بنائے۔ اور انھیں اس زعم باطل میں گرفتار کرے کہ آخرت کی راہ میں بھوکا مرجانا خوبی اور عمدگی کی بات ہے حالانکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک باال وعیال کے اس وعظ و تلقین کے وقت اُس کی اولاد سن رشد و بلوغ کو بھی نہ پہنچی ہو اور شرعی احکام و تکالیف کی ابھی تک سرے سے مکلف ہی نہ ہوئی ہو۔

غزالی کہتے ہیں:۔

"تم پر یہ امر بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا توکل نہیں کہلاتا بلکہ توکل اس کا نام ہے کہ انسان بھوک کی حالت میں صبر کرسکے اور اگر کبھی اُس تک رزق کے پہنچنے میں دیر اور تاخیر ہو جائے تو راضی برضا موت کے لئے آمادہ ہو جائے اور آبادیوں یا ایسے جنگلوں میں رہے جہاں گھاس پھونس کے میسر آجانے کا قوی امکان و احتمال ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام امور منجملہ اسباب زندگی ہیں گو اس میں شبہ نہیں کہ ان میں ایک گونہ تکلیف اور صعوبت ضرور رہے۔"

ہم اس امر کا اعادہ یہاں پھر ضروری خیال کرتے ہیں کہ توکل کا یہ معنی و مفہوم سراسر لغو، بے ہودہ اور باطل ہے۔ کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جو شخص صحیح و تندرست ہے اور قوت لایموت کے کمانے پر پوری طرح قادر ہے، وہ بھی بھیک مانگ لینے پر قناعت کرے اور ہر گھڑی اتفاقات کا بے تابی سے انتظار کیا کرے۔ یا نہایت بے چینی سے موت کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہر وقت آمادہ و تیار رہے۔

ذخیرہ اندوزی

ذخیرہ و پس انداز کرنے میں غزالی کی رائے نہایت عجیب و غریب ہے، اُن کی رائے میں جس شخص کو محنت و عمل یا وراثت یا کسی اور سبب سے کچھ دولت مل جائے اُس کا فرض ہے کہ اگر بھوکا ہو تو اُس سے اتنا لے لے جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکے۔ اگر ننگا ہو تو اس قدر لے لے جس سے وہ اپنا لباس تیار کر سکے۔ اگر بے گھر ہے تو اُس سے اپنے لئے ایک مختصر سا مسکن تعمیر کرے مگر باقی دولت فوراً غرباء اور محتاجوں میں تقسیم کر دے۔ اور اگر اس سے زائد کچھ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تو صرف شدید اور مختصر ضرورتوں کے لئے رکھے اور اس میں بھی اُس کی نیت بخیر ہو۔ جو شخص کامل ایک برس کے لئے اپنے پاس کچھ جمع رکھے اُس میں توکل کی بو بھی نہیں۔ جو شخص چالیس روز یا اُس سے کم و بیش کے لئے ذخیرہ کرے وہ اُس مقام محمود سے محروم رہے گا جو قیامت و آخرت میں متوکلین کو ملے گا۔

ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ اس مسئلے پر خالص اقتصادی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالیں۔ کیونکہ مؤرخین نے اقتصادیات سے جہالت و غفلت کی وجہ سے ہمیشہ اہل عرب کی مذمت کی ہے اور اُن کی رائے ہے کہ مملکت عربیہ کے سقوط و شکست کا راز اسی علم سے بے خبری و ناآشنائی میں مخفی و مضمر ہے۔ جس قوم کو مصر اور عراق جیسے سرسبز و شاداب ممالک میسر ہوں اُس کی ذلت و غربت حیرت انگیز و تعجب خیز نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن آہ، وہ قوم علم الاقتصاد کو وقعت و احترام کی نگاہ سے کیسے دیکھ سکتی ہے جس کے امام الائمہ کا

ارشاد ہو کہ چالیس روز تک کے لئے اپنے پاس کچھ جمع کر لینا مقام محمود تک رسائی سے محروم کر دیتا ہے۔

غزالی کا یہ لطف و کرم سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے عیالدار کو ایک برس کا غلہ ذخیرہ کرنے کی اجازت مرحمت فرما دی ہے۔ ساتھ ہی ایک عام شخص کو بھی اس امر کی اجازت دی ہے کہ وہ کوزہ اور گھر کا مختصر سا اثاثہ محفوظ رکھ سکتا ہے۔

کوزے اور دوسری اشیا میں غزالی کے ہاں فرق یہ ہے کہ باوجودیکہ انسان کو زندگی میں برتنوں کی ضرورت بہت پڑتی ہے لیکن اللہ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ وہ ہر برس میں غلے کی فصل اُگانے کا اعادہ و تکرار کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ کسی کو برتن بھی ہر برس دیں۔ غزالی کو یہ جاننا چاہئے تھا کہ غلہ بھی ہر برس اُس شخص کو ملتا ہے جس کی کوئی زمین اور جائداد ہو جس کی ملکیت میں زمین کا کوئی ٹکڑا نہیں اُس پر غلہ کہاں سے برسے گا۔ یا للعجب کوئی شخص صرف توکل کی بنا پر اپنے تمام راس المال کو کیسے تباہ و تاراج کر سکتا ہے۔

متوکلین کے آداب

متوکل جب گھر سے باہر جائے تو غزالی نے اس کے لئے مندرجہ ذیل آداب مقرر کئے ہیں۔

(۱) گھر کو صرف ایک تالا لگانے پر اکتفا کرے اور پڑوسیوں سے ہرگز یہ درخواست نہ کرے کہ اُس کی غیبت میں اُس کے گھر کا خیال رکھیں۔

(۲) گھر میں کوئی ایسا سامان نہ چھوڑے جس کے چرانے کی طرف کوئی مائل و راغب ہو۔

(۳) گھر میں جو کچھ چھوڑ کر نکلے اُس کے بارے میں راضی بقضا ہو کر نکلے کہ اُس کے مال پر اگر کوئی آفت یا حادثہ آجائے تو اُس کے لئے دلگیر نہ ہوگا۔

(۴) واپسی پر اگر دیکھے کہ سب کچھ چرا لیا گیا ہے تو بجائے مغموم ہونے کے اگر ممکن ہو تو

مسرور اور خوش ہو۔

(۵) چور کو بددعا کبھی نہ دے کیونکہ یہ توکل کے منافی ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اُسے مال مسروقہ پر تاسف اور افسوس ہوا ہے۔

(۶) چوری کی معصیت کی وجہ سے جس عذاب الٰہی کا چور مستوجب ہوا ہے اُس کے لئے اُسے غمگین ہونا چاہیئے اور اس امر پر شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اللہ نے اُسے مظلوم بنایا ظالم نہ بنایا۔

معلوم نہیں غزالی متوکل کو اس امر کی تلقین کرنا کیوں بھول گئے ہیں کہ اُسے گھر سے نکلتے وقت سب دروازے کھلے چھوڑ کر ایک تختی لٹکا جانا چاہیئے جس پر لکھا ہو، جو شخص اس گھر سے کچھ چرا لے وہ مجرم نہیں بلکہ اُلٹا مستحق اجر و ثواب ہے کیونکہ اُس نے صبر و تحمل جیسے حسن خلق پر صاحب خانہ کو عمل کرنے میں امداد دی ہے۔

غزالی کے ہاں یہ ہرگز توکل نہیں کہ کوئی شخص چور کا تعاقب کرے اور اُسے پکڑ کر حکام کے حوالہ کردے جو اُسے اس جرم کی سزا دیں بلکہ توکل کا مطلب یہ ہے کہ مال و دولت کی حفاظت کا سامان سرے سے کیا ہی نہ جائے اور چوری ہو جانے کے بعد اپنے باب میں اس لئے خوش اور چور کے باب میں اس لئے غمگین ہونا چاہیئے کہ اللہ نے اسے مظلوم اور چور کو ظالم بنایا ہے جس کی وجہ سے وہ عذاب الٰہی کا مستوجب ہوا۔

اس باب میں سب سے عمدہ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ غزالی نے اس امر کی دعوت دی ہے کہ جس شخص کی چوری ہو جائے اُسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ سب کچھ اُسے آخرت میں مل جائیگا لہذا یہ مال اگر کسی صورت واپس بھی ملے تو اسے ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیئے۔

خائف کی توکل

غزالی کہتے ہیں بعض اوقات ایک ضرر و تکلیف، جان یا مال کے تلف کرنے کا موجب بنتی ہے مثلاً ایسے جنگل میں سونا جہاں درندے زیادہ ہوں یا ایسے ندی نالے میں سونا جس میں سیلاب آجانے کا کھٹکا ہو یا کسی ایسی دیوار کے سایہ میں آرام کرنا جس کے گرنے کا خوف ہو

یا کسی ٹوٹی پھوٹی چھت کے نیچے لیٹ رہنا یہ سب امور شرعاً منع ہیں کیونکہ ان میں بلا فائدہ و بلا سبب اپنے آپ کو موت و ہلاکت کے لیے پیش کرنا ہے

حاصل کلام یہ ہے کہ اسباب خوف کی تین قسمیں ہیں یقینی ظنی اور وہمی۔ شرط توکل یہ ہے کہ آخر الذکر سے اجتناب و احتراز کیا جائے کیونکہ حفاظت و احتیاط میں مبالغہ و غلو سے کام لینا مقام توکل سے بُعد و دُوری کا موجب ہے؟

یہاں ہم ایک ایسے مسئلہ پر مطلع و آگاہ کرتے ہیں کوئی باک محسوس نہیں کرتے جس کے سمجھنے میں غزالی سے خطا اور لغزش ہوئی ہے اور وہ یہ کہ لوہے کے گرم ٹکڑے کے ساتھ مریض کو داغ دینے کو بھی غزالی نے منجملہ اسباب موہومہ قرار دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کی صفت و کیفیت یہی بیان کی ہے کہ وہ گرم لوہے سے داغ دینا، جھاڑ پھونک کرنا، کسی بات سے بدشگونی لینا وغیرہ دوسرے ایسے امور پر ایمان و اعتماد نہیں رکھتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول و ارشاد جسے غزالی بطور سند و دلیل لائے ہیں۔ اگر اس میں اُن کی رائے درست اور صحیح تسلیم کی جائے تو اس کا معنی یہ ہے کہ جھاڑ پھونک اور بدشگونی وغیرہ بھی اسباب موہومہ میں سے ہیں حالانکہ ناممکن اور محال قطعی ہے کہ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی نگاہ میں ان اسباب و وسائل کی ہرگاہ بھی وقعت و حقیقت ہو بلکہ اس کے برعکس آپ کے ارشاد کا تنہا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان خرافات پر ایمان و اعتماد رکھتے ہیں وہ وہم و تخمین اور شک و وسوسہ کا شکار رہیں۔

صحت و تندرستی کے اعادہ و بحالی میں اگر گرم لوہے سے داغ دینے کو کچھ بھی دخل ہوتا تو آپ اسے توکل کے منافی کبھی قرار نہ دیتے۔ آپ نے اس سے منع صرف اس لئے کیا ہے کہ اس کا ضرر اور نقصان جہاں قطعی اور یقینی ہے وہاں اس کا فائدہ بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مزید براں ہمیں اس پر خاص غور کرنا چاہیئے کہ اسباب موہومہ سے احتراز کی تلقین محض اس لئے کی گئی ہے کہ ان کے ترک کرنے سے انسان خطرہ و مصیبت کا مقابلہ

کرنے کا عادی و خوگر ہوتا ہے جو زندوں کا شیوہ و شعار ہے۔ لیکن جب احوال و ظروف ہی تبدیل ہو جائیں اور اسباب موہومہ کی رعایت و حفاظت بھی ایک گونہ تدبیر و احتیاط کی صورت اختیار کر لے تو میں نہیں سمجھتا کہ ان پر عمل پیرائیگی سے کوئی شخص مقام محمود تک رسائی سے محروم کیسے رہ سکتا ہے؟

جب انسان کو اپنی دولت کے چرائے جانے یا اونٹ کے اُٹھ کر کہیں چلے جانے کا اندیشہ اور کھٹکا ہو تو اُس کا فرض ہے کہ مکان کو تالا لگائے اور اونٹ کے پاؤں باندھ دے کیونکہ اس عالم میں اللہ کی جو سنّت و ناموس ہے اُس کے مطابق یہ امور حفاظت و صیانت کا سبب ہیں۔ جس طرح سانپوں، بچھوؤں اور درندوں کو نہ مارنا توکل نہیں بلکہ ایک گونہ خبط اور جنون ہے۔ اسی طرح مکان کو تالا لگانا اور اونٹ کے پاؤں باندھ دینا توکل کے منافی نہیں بلکہ عین توکل ہے۔

مریض کی توکل

کسی مرض کو زائل و دور کرنے والے اسباب کی غزالی نے تین قسمیں بیان کی ہیں یقینی ظنی اور وہمی، اول الذکر اسباب کا ترک توکل نہیں ہے بلکہ خوف ہلاکت کے وقت ان اسباب کا ترک و پرہیز حرام ہے۔ غزالی کو اس دقیق امر پر مطلع ہونا چاہیے تھا کہ مرض چاہے کتنا ہی حقیر اور ہلکا کیوں نہ ہو کسی حال میں خوف و خطرہ سے خالی نہیں، کیونکہ مرض میں بھی آغاز بلوغ اور شباب سب کچھ ہوتا ہے اگر معمولی سے معمولی بیماری کا علاج نہ کیا جائے اور اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ کسی وقت بھی مہلک اور خطرناک مرض کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ ابتدا ہی میں مرض کے جراثیم کا مقابلہ کر کے ان کا سدباب اور قلع قمع کر دے ورنہ اس کی جڑیں اگر بدن میں مضبوط ہو گئیں تو کوئی علاج بھی مفید نہ ہوگا

٭ موہوم اسباب میں شرط توکل یہ ہے کہ اُن سے اجتناب و احتراز کیا جائے۔ اس باب میں احوال و ظروف کی تبدیلی و اختلاف کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، رہے ظنی اسباب مثلاً

فصد کھلوانا پچھنے لگوانا، کوئی مسہل دوا پینا یا ایسے ہی دوسرے اسباب جنھیں اطبا کسی مرض کے ازالہ کے لئے مفید و نافع سمجھتے ہیں۔ سو جس طرح یقینی اسباب کی طرح ان کا ترک کرنا ممنوع نہیں ہے اسی طرح ان کا ترک کرنا توکل بھی نہیں ہے۔ ہاں بعض احوال و اشخاص کی نسبت و اعتبار سے ان اسباب کا ترک بہتر و افضل ضرور ہے۔"

ہم اس رائے میں غزالی سے ہرگز متفق نہیں کیونکہ ہماری سمجھ میں یہ بات کسی صورت نہیں آتی کہ بعض اوقات بیماری کے علاج سے غفلت و سستی مستحسن و قابل تعریف کیسے ہو سکتی ہے؟

مندرجہ ذیل حالتوں میں غزالی کے ہاں مرض کا علاج نہ کرنا لائق تعریف و ستائش ہے

(۱) مریض صاحب کشف ہو اور اس کشف و مکاشفہ سے اُسے معلوم ہو گیا ہو کہ اب موت قریب ہے اور علاج کسی معنی میں سود مند نہیں۔

(۲) مریض احوال آخرت کے خوف اور اپنے آپ میں گم ہو۔

(۳) مرض مزمن اور پرانا ہو اور مرض کی شدت اور خطرناکی کے مقابلے میں دوا رکی سود مندی و چارہ گری نہایت موہوم و غیر یقینی ہو۔

(۴) ترکِ علاج سے اُس کا مقصد یہ ہو کہ مرض باقی رہے تاکہ اُسے اس صبر کا اجر و ثواب ملے یا کم سے کم نفس، صبر جمیل کا عادی و خوگر ہی ہو جائے۔

(۵) مرض کے پنجے میں گرفتار ہونے سے قبل اُس نے بہت گناہ کئے ہوں اور ان کا کفارہ ادا نہ کر سکا ہو اور اب یہ سمجھتا ہو کہ مرض کے طول و امتداد سے ان کا کفارہ ہو جائے گا۔

(۶) طویل عرصے کی صحت مندی اور تندرستی کی وجہ سے اُس میں غرور و پندار کے جذبات سر اٹھانے لگے ہوں اور وہ اس مرض سے ان جذبات کو کچلنا چاہتا ہو۔

جہاں ہم اس امر پر مطلع کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں کہ ترک علاج کے گذشتہ اسباب نہایت بودے اور کمزور ہیں اور ان کے اعتماد پر علاج سے غفلت برتنا کسی صورت درست اور روا نہیں وہاں ہم اس بات پر آگاہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں غزالی

کی تصوف پسندی ہی کا حاصل و نتیجہ ہے ورنہ صحت کی بے راہ رویوں اور بے اعتدالیوں سے ڈر کر مرض کے دامن میں پناہ لینا کہاں کا مفید اور ایجابی عمل ہے۔ کیا اس سے یہ کہیں بہتر نہیں ہے کہ ہم ڈٹ کر مرض کا مقابلہ کریں اور تندرست ہو جانے کے بعد ان تمام بے ہودگیوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائیں جن کا موجب و باعث صحت ہوتی ہے تاکہ ہم بے کار و شل ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ جئیں تو زندہ و تندرست اعضاء و جوارح کے ساتھ جئیں

مذکورہ بالا امور پر مستزاد یہ کہ غزالی مرض کے چھپانے کو ترجیح دیتے ہیں اور بجز مندرجہ ذیل حالتوں کے کسی حالت میں اظہار مرض کی اجازت نہیں دیتے۔

(۱) مرض کے اظہار سے مقصود اس کا علاج ہو اور طبیب کے سامنے شکایتاً نہیں بلکہ حکایتاً اس کا ذکر کرے۔

(۲) کسی ایسے شخص سے بیماری کا حال کہے جس کے متعلق اسے امید ہو کہ وہ اُسے صبر کی تلقین کرے گا۔

(۳) مرض کے اظہار سے مقصود اللہ کی جانب حاجت مندی کا اظہار اور اپنے باب میں عجز و قصور اور نیازمندی کا اعتراف ہو۔

غزالی کہتے ہیں :-

"صرف گذشتہ بالا نیتوں اور ارادوں سے اظہار مرض کی اجازت و رخصت دی گئی ہے اور یہ شرائط ذیات اس لئے ہیں کہ بیماری کا ذکر ایک گونہ شکوہ و شکایت اور اللہ کے فعل پر ناخوشی و کراہت کا مظہر ہے۔ جو شرعاً حرام اور ممنوع ہے۔ اگر بیماری کا ذکر و اظہار فرض کیجئے غیظ و غضب کے علامات اور گذشتہ نیتوں سے عاری و خالی ہے تو اُس اظہار کو ہم حرام تو نہیں کہہ سکتے لیکن اولیٰ اور بہتر پھر بھی یہی ہے کہ اخفاء مرض سے کام لیا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ ان تمام امور کے باوجود اظہارِ مرض میں اللہ کی شکایت کی بو پائی جائے یا جس مرض کا شکار ہے اُس کے ذکر و بیان میں مبالغہ و غلو کا ارتکاب کرے۔

جس شخص نے توکل کی بنا پر علاج معالجہ ترک کیا ہے اُسے تو اظہار کا حق اس لئے بھی نہیں پہنچتا کہ علاجِ مرض میں اتنی قباحت نہیں جتنی کہ اظہارِ مرض میں ہے۔"
سبحان اللہ یہ آخری فقرہ کیا ہے حکمت و دانش کا ایک بے پایاں سمندر ہے۔

تنبیہاتِ ثلاثہ

احیاء میں غزالی کہتے ہیں:۔
"اگر تم[1] دریافت کرو کہ متوکل کے پاس اتنا مال کہاں سے جمع ہوگا کہ اُسے لیا یا چرایا جا سکے سو اس کا جواب یہ ہے کہ متوکل چاہے کتنا ہی تارک الدنیا کیوں نہ ہو پھر بھی اس کے گھر میں ایک آدھ پیالہ کھانا کھانے کے لئے، ایک آدھ کوزہ یا کوئی دوسرا برتن پانی پینے اور وضو کرنے کے لئے۔ ایک آدھ تھیلا اپنا ضروری توشہ و سامان ڈالنے کے لئے اور کوئی لکڑی یا ڈنڈا دشمن کے مقابلے کے لئے یا اسی نوع کی دوسری ضروری چیزیں یقیناً موجود ہوں گی۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ اسے کہیں سے کچھ مال اتفاقاً میسر آگیا ہو اور اُسے تلاش کے باوجود ابھی تک کوئی ایسا مستحق نہ ملا ہو جس کے حوالے کر دے۔ سو یاد رکھئے ایسی نیت سے اپنے پاس کچھ جمع رکھنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ کوزے اور تھیلے وغیرہ کو بھی گھر سے باہر پھینک دینا شرطِ توکل ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس شرطِ توکل یہ ہے کہ حاجت و ضرورت سے زائد اشیاء کو اپنے سے الگ اور دور کر دیا جائے کیونکہ یہ اللہ کی سنتِ جاریہ ضرور ہے کہ مساجد کے گوشوں میں ہی فقراء و متوکلین تک ان کا رزق پہنچا دے لیکن یہ سنتِ جاریہ ہرگز نہیں ہے کہ ہر روز یا ہر ہفتے میں کوزے اور دوسری ایسی چیزیں بھی ان میں تقسیم کرے۔"

اس اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توکل کا یہ تصور خالصتاً صوفیانہ ہے جس کو حقیقت واقعہ سے دور کا بھی تعلق و ربط نہیں۔ بتائیے جب غزالی نے خود اعمال کے کھوٹے اور کھرے کے

---

[1] ج ۴ ص ۲۹۲

پرکھنے کے لئے عقل اور شرع دونوں کو پیمانہ و مقیاس قرار دیا ہے تو کیا وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وعلی اللّٰہ فتوکلوا ان کنتم مومنین کی آیت صرف اسی گروہِ متوکلین کے ساتھ مخصوص ہے۔ یاد رکھئے وہ توکل جس کی طرف قرآن حکیم نے دعوت دی ہے وہ یہ ہے کہ وسائل و اسباب کو اختیار کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اللہ پر کامل درجے کا بھروسا اور اعتماد کیا جائے اور اس امر پر یقین رکھا جائے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سعی و عمل سے کام لینے والوں کے اجر و ثواب کو کبھی ضائع اور رائیگاں نہیں فرماتے۔

دوسری

منہاج ص ۸۰ میں غزالی کہتے ہیں :-

"اگر پوچھا جائے کہ کسی حال میں انسان کے لئے رزق کا طلب کرنا ضروری بھی ہے ؟ تو یاد رکھو توت لایموت جس کا اللہ نے ذمہ لیا ہے وہ بھی زندگی اور موت کی طرح ایک خداوندی امر ہے جس کا حاصل کرنا یا دور کرنا انسان کی قدرت و بساط سے ماورا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ جس رزق کا اللہ نے ذمہ لیا ہے آخر اس کے لئے کچھ اسباب بھی تو ہوں گے تو کیا ان اسباب کا تلاش کرنا ضروری ہے یا نہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ تلاشِ اسباب ہرگز ضروری نہیں کیونکہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ بواسطہ اسباب، وغیر اسباب ہر طرح رزق پہنچانے پر قادر ہیں اور وما من دابۃ فی الارض الا علی اللّٰہ رزقھا کہہ کر انھوں نے رزق کو مطلقاً اپنے ذمے لے لیا ہے اور اس میں اسباب اور غیر اسباب کی کہیں قید نہیں لگائی تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ اسباب و ذرائع کی تلاش و جستجو میں اپنے آپ کو تھکاتے پھریں۔ مزید براں جب انسان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس کا رزق کہاں ہے اور اس کے لئے کون سا واسطہ و سبب مفید و کارگر ہے تو پھر خواہ مخواہ اسے رزق کی تلاش و جستجو کا مکلف کیوں قرار دیا جائے۔"

ہم کمال غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ غزالی کی محض خیال آفرینی ہی خیال آفرینی ہے حقیقت و واقعہ سے اسے دور کا بھی تعلق اور لگاؤ نہیں۔

تیسری

توکل کی تلقین کرتے ہوئے غزالی کہتے ہیں کہ بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں رہتا ہے چونکہ اپنی غذا خود حاصل کرنے سے قاصر ہوتا ہے بنا بریں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اُس کی ناف کو ماں کی ناف کے ساتھ ملا دیا ہے تاکہ اُس تک غذا برابر پہنچتی رہے۔ جب پیٹ سے باہر آجاتا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ماں کے سینے میں شفقت ومحبت کے جذبات موجزن بنا دیتے ہیں تاکہ بچے کو اس سینے سے دودھ میسر آسکے پھر چونکہ ابتدا میں بچے کا معدہ ومزاج ثقیل غذا کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے ماں کا دودھ نہایت لطیف اور پتلا رکھا گیا۔ اس کے بعد غزالی کہتے ہیں جب بچہ کچھ بڑا ہو جاتا ہے تو اُس کی راحت وآرام کے اسباب بھی بڑھا دیئے جاتے ہیں اور محبت وشفقت کا وہ تنگ دائرہ جو صرف ماں اور باپ تک محدود تھا اُسے پھیلا کر پورے اہل شہر تک وسیع کر دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ صرف اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا تھا تو اب پورے شہر والوں کی محبت وشفقت کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس کے بعد غزالی بتاتے ہیں کہ دیکھئے ایک یتیم اور بے کس بچہ کس طرح پورے مسلمانوں کی محبت کو اپنے لئے خرید لیتا ہے۔

غزالی کی گذشتہ بالا دلیل اُن کے حق میں نہیں بلکہ اُن کے خلاف جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اگر بچے کی ناف کو ماں کی ناف سے اس لئے ملا دیا کہ وہ خود غذا حاصل کرنے سے قاصر وعاجز ہے اگر ماں کے سینے میں دودھ اس لئے اتارا کہ بچہ ثقیل غذا کے چبانے اور ہضم کرنے پر قادر نہیں ہے اگر ماں کے دل میں ممتا کے جذبات اس لئے بیدار کیے کہ بچہ بنفسہٖ سعی ومحنت پر قادر نہیں ہے اور اس طرح اس کے رزق حفاظت اور نگہداشت کا سامان ہوتا رہے گا تو بتایئے اس سے مقصود اگر اُس کو ہمیشہ دوسروں کا محتاج اور دست نگر رکھنا تھا تو پھر اسے قوت وتوانائی کیوں دی؟ کیا صرف اس لئے نہیں کہ کچھ محدود ومتعین عرصے کے بعد وہ اپنے قدموں پر خود کھڑا ہو سکے اور اپنی راحت وآرام کے سامان کی تلاش وسراغ میں جدوجہد اور محنت وکاوش کی پرخروش زندگی میں قدم رکھنے کی جرأت وہمت

اپنے اندر پیدا کر سکے)

غزالی کا یہ کہنا کہ:

"جب بستی والوں کو کسی فقیر اور محتاج کا علم ہوگا تو اُن کا دل اُس پر پسیجنے لگے گا اور اس کی امداد و اعانت کے لئے وہ اپنے اندر ایک گونہ بے کلی اور بے چینی پائیں گے۔"

یقیناً سراسر شاعرانہ تخیل پروازی ہے۔ کاش یہ بات غزالی کے پیش نظر ہوتی کہ ایک زمانے میں اہل عرب نے صرف زکاۃ سے بچنے کے لئے دین و ملت ہی کو خیر باد کہنے کی ٹھان لی تھی۔

پانچویں فصل

فضیلتِ اخلاص

فضیلتِ اخلاص پر بحث کا آغاز غزالی نے قرآن حکیم کی اس آیت سے کیا ہے وما اُمروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین اس کے بعد کچھ احادیث و اخبار نقل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دنیوی فائدوں اور منفعتوں میں سے کوئی چھوٹا یا بڑا فائدہ یا منفعت جس کے حصول سے نفس انسانی کو مسرت و راحت ہوتی ہے جب وجود و عمل میں آئے تو لامحالہ اُس میں کوئی نہ کوئی کدورت اور میل کی آلودگی شریک ہو جاتی ہے اور کامل درجہ کا اخلاص زائل و مفقود ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پورے بسط و تفصیل سے بتایا ہے کہ انسانی افعال و عبادات میں سے کسی فعل و عبادت کو لیجئے اُس کے پیچھے کسی نہ کسی دنیوی غرض و فائدہ کا ہاتھ کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئے گا لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ عملِ خالص تنہا وہی عمل کہلائے گا جس کا باعث و محرک بجز قرب و محبت الٰہی کے اور کچھ نہ ہو۔

غزالی کی نگاہ میں اخلاص کا معیار یہ ہے کہ جس عمل خیر کو کوئی شخص انجام دینا چاہتا تھا جب دیکھے کہ کوئی دوسرا شخص بھی اسی کو انجام دے رہا ہے تو اُسے خوشی اور مسرت ہو چنانچہ

فرماتے ہیں :-

اس فتنہ و مصیبت کا سب سے زیادہ شکار علماء کا گروہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نشر و اشاعت علم سے مقصود اکثر علماء کے ہاں علم و دانش کی خدمت و چاکری اور قرب الٰہی کا حصول نہیں بلکہ عوام میں مقبولیت حاصل کرنا اور اپنے گرد ارادت مندوں اور عقیدت کیشوں کا ایک ہجوم اور انبوہ عظیم جمع کرنا ہوتا ہے اور رہ رہ کر شیطان ان کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا ہے کہ تمہارا مقصود اللہ کے دین کا پھیلانا اور شریعت محمدی سے دفاع کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک واعظ عوام و سلاطین کے وعظ و نصیحت کو اللہ پر احسان کے مرادف سمجھتا ہے اور جب کوئی اس کے وعظ سے متاثر ہو تو بہت اتراتا اور خوش ہوتا ہے اور اس کی تاویل و توجیہ یہ کرتا ہے کہ مجھے یہ مسرت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے دین کی نصرت و اعانت کی توفیق بخشی ہے۔ اگر اس کے معاصرین میں اس سے کوئی اور اچھا واعظ پیدا ہو جائے تو اسے ناگوار اور شاق گذرتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اگر اس کے وعظ و ارشاد کا موجب و محرک دین کا پھیلانا ہوتا تو اسے اس امر سے خوش ہونا چاہئے تھا اور شکر ادا کرنا چاہئے تھا کہ اللہ نے اس اہم کام کو انجام دینے کے لئے ایک دوسرے شخص کو اس کا معین و مددگار بنا دیا لیکن عجیب بات ہے کہ اس پر بھی شیطان اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور کہتا ہے تمہاری دل بستگی اور کبیدگی اس لئے نہیں کہ لوگوں کی توجہ و رجحان تمہاری طرف نہیں رہا بلکہ اس کے برعکس تم مغموم اس لئے ہو کہ وعظ کی وجہ سے جو اجر و ثواب تمہیں ملتا تھا اب تم اس سے محروم ہو گئے اور ظاہر ہے کہ اجر سے محرومی ایک مومن کے لئے غم کا باعث ہونی ہی چاہیئے۔ آہ یہ بیچارہ نہیں جانتا کہ اللہ کے سامنے سر جھکا دینا اور تمام امور کو اس کی طرف سونپ دینا زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہے"

چونکہ غزالی پر نیکی اور صلاح کے جذبات غالب تھے اس لئے انھوں نے صرف اسی اخلاص کا ذکر کیا جو عبادات میں درکار تھا۔ اگرچہ انہیں کبھی زندگی میں اجتماعی اور مجلسی امور سے بھی سابقہ

پڑتا تو یقیناً اُس اخلاص کا بھی ذکر کرتے جس کی بدولت افراد اپنی قوموں کو بام عروج اور ترقی کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیتے ہیں اور ہمیں بتاتے کہ اجتماعی امور میں خودغرضی اور نفس پرستی کس پراسرار طریق سے راہ پاتی ہے اور قوموں کی قوموں کو کس طرح بے رحمی اور بے دردی سے تباہ و تاراج کر دیتی ہے۔ اخلاص صرف نماز، روزہ، حج اور زکاۃ پر ہی موقوف اور منحصر نہیں بلکہ ایک فرد اور اجتماع کے مابین اس کی ضرورت اور زیادہ اشد ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص عبادات میں اخلاص نہیں برتتا تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا کیونکہ وہ تو عالم و اہل عالم سب سے بے نیاز ہے لیکن اگر کوئی شخص اجتماعی اور قومی امور و اعمال میں خیانت کرتا ہے تو اس سے تنہا اُس کو نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں نفوس و افراد کو موت و ہلاکت کے منہ میں جانا پڑتا ہے لیکن آہ، اس کا کیا کیا جائے کہ ایسے نکتوں کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔
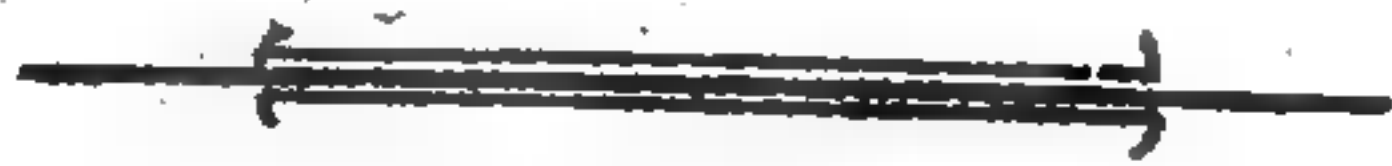
آٹھواں باب

رذائل سے اجتناب

غزالی نے رذیلت کی بالذات کوئی تعریف نہیں کی۔ انھوں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ کسی فضیلت کے افراط یا تفریط سے رذیلت وجود میں آتی ہے۔ مثلاً قوت علم کے افراط سے مکر، کینہ، دھوکا اور فریب، تفریط سے سادہ پن، خام عقلی، حماقت اور جنون پیدا ہوتے ہیں شجاعت کے افراط سے تہور، جسارت، لاف و گزاف، زود رنجی، تکبر، خود پسندی، خود سری، تفریط سے بزدلی، اضطراب، حقارت، ذلت اور دون ہمتی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ عفت میں افراط یا تفریط سے شدتِ طمع، کم شہوتی، بے حیائی، نامردی، اسراف، بخل، ریاکاری، بے زمامی بے قیدی، بے ہودہ کاری، بدخلقی، خوشامد، حسد اور شماتت وغیرہ وجود میں آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں غزالی کا کلام نہایت پیچیدہ اور گنجلک ہے چنانچہ انھوں نے خود بھی اس بات کو محسوس کیا اور مندرجہ ذیل رذائل کو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

زود رنجی، تبختر، خست پسندی، کم حیائی، بدخلقی، انقباض، لغو پسندی، دون ہمتی اور

ناشناسی وغیرہ۔

فضائل کی وہ شاخیں جو اصول اخلاق سے نکلتی ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔

ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ غزالی ہمیشہ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ مذموم اخلاق کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے اور اُن کی جگہ عمدہ اور قابل تعریف اخلاق کا بیج بونا چاہیے وہ اس دوگونہ عمل کو اپنی اصطلاح میں تخلیہ اور تحلیہ سے تعبیر کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے قلب کو تمام بُری خواہشوں سے پاک اور صاف کیا جائے اور پھر زیور اخلاق سے اُسے آراستہ و پیراستہ بنایا جائے۔

افراد و اشخاص کے لئے جن فضائل اخلاق کی ضرورت ہے چونکہ انھیں ہم بیان کر چکے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں رذائل اخلاق کا ایک مجموعہ بھی بیان کر دیا جائے تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ غزالی کے ہاں ایک اعلیٰ و ارفع اور مثالی زندگی کا تصور کیا ہے؟

پہلی فصل

غصہ

نقصان دہ اور اذیت رساں امور کے وقوع میں آنے سے قبل اُن کے دفاع یا کسی رنج اور تکلیف کے پہنچنے کے بعد بدلہ و انتقام کے لئے جو قوت جوش اور اشتعال میں آتی ہے اسے غضب یا غصہ کہتے ہیں۔ غزالی کی رائے میں اس کے تین درجے ہیں، تفریط، افراط اور اعتدال۔

تفریط نام ہے اس قوت کی کمی یا بالکل فقدان کا اور یہ کسی حالت میں بھی قابل تعریف نہیں کیونکہ اس کا حاصل و نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ بے حمیتی، بے غیرتی، ذلت اور

سفلگی کے جذبات پرورش پائیں اور انسان کو ایسے مواقع میں بھی غیرت و غصہ نہ آئے جہاں اُس کی عزت و آبرو خطرہ میں ہو مثلاً جب اُس کی بیوی یا باندی وغیرہ سے مذاق کیا جائے:

افراط سے مراد یہ ہے کہ قوت عقل اور دین کے حدود سے متجاوز ہو جائے اور انسان سے بصیرت، نظر و فکر غور و تدبّر اور مرضی و اختیار بکلی سلب ہو جائے۔

وسط و اعتدال ہر حال میں قابل مدح و تعریف ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ غصّہ عقل اور دین کے حکم و اشارہ کے قبضہ و تصرف میں رہے جہاں حمیت و غیرت کی آزمائش ہو وہاں غصے سے کام لیا جائے اور جہاں تحمل و برداشت کی ضرورت ہو وہاں غصے کو ضبط اور قابو میں رکھا جا سکے۔

غزالی کہتے ہیں:۔

"جس شخص میں غیرت و غصے کی کمی ہو اور وہ محسوس کرے کہ وہ بے وجہ اور بلا فائدہ ظلم و ستم اور ذلت و رسوائی کے سہنے کا عادی و خوگر ہو گیا ہے اسے اس کے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تا کہ غصے کی قوت اُس میں کچھ بڑھ جائے لیکن جس شخص کو غصہ و خشم کا افراط تہوّر اور فواحش تک پہنچا دے اُس کا فرض ہے کہ اسے قابو میں لا کر افراط اور تفریط کے وسط میں لا کھڑا کرے"

غصے کے اسباب

غزالی کی رائے میں غصے کے اسباب تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔

(اول) ایسے امور کے سلب ہو جانے پر غصہ کا آنا جو ہر انسان کے لئے انتہائی ضروری اور لابدی ہیں۔ مثلاً خوراک، پوشاک، مسکن اور صحت کے زوال و فقدان پر ظاہر ہے کہ جو شخص ان امور کو ہم سے دور کرے گا اُس پر لامحالہ غصہ آئے گا ہی۔

(دوم) ایسے امور پر غصہ کا آنا جو کسی شخص کے لئے بھی لابدی اور ضروری نہیں، مثلاً جاہ و منصب، مال و دولت اور حشم و خدم وغیرہ کی کثرت و فراوانی کا لالچ، یہ چیزیں

فی الواقع کسی کے لئے بھی ضروری نہیں ہیں۔ ہم نے صرف عادت اور مقاصدِ امور سے جہل و اعراض کی وجہ سے ان کو اپنے لئے ضروری قرار دے لیا ہے۔

(سوم) ایسے امور جو بعض لوگوں کی نسبت و اعتبار سے ضروری اور بعض کے لحاظ و اعتبار سے غیر ضروری ہیں۔ ان کا تعین اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ اشخاص و رجال کے تغیر و اختلاف سے یہ بھی متغیر و مختلف ہوتے رہتے ہیں۔

غصے کا علاج

غزالی نے جس طرح غصے کو ضبط کرنے کی تدبیریں بتائی ہیں اسی طرح اس کے استیصال کے طرق کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

غصے کے استیصال کا پہلا طریق یہ ہے کہ اس کے اسباب ہی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ مثلاً اس کا باعث اگر کبر و خود پسندی، مذاق، ٹھٹھا مخول، دوسرے کو غیرت و عار دلانا، تکرار کرنا، دشمنی، فریب، مال و دولت کی حرص و طمع، یا جاہ و منصب کی خواہش و آرزو وغیرہ ہو تو غصے سے پاک ہونے کی صورت یہ ہے کہ ان اسباب ہی کو سرے سے ختم اور فنا کر دیا جائے۔ یقیناً ان قباحتوں کا ازالہ بجائے خود بہت بڑی ریاضت و مجاہدے کا محتاج ہے اور بڑی تدبیر ان کو زائل و دور کرنے کی یہ ہے کہ انسان ان کی بدانجامیوں میں غور کرتا رہے اور ان کے اضداد پر طویل عرصے تک برابر عمل پیرا رہے تاکہ نفس ان سے متنفر ہو کر اچھے اخلاق کا عادی و خوگر ہو جائے اور جو چیز کل تک تکلف اور تصنع سے وجود میں آتی تھی آج خود بخود بلا تکلف اور بلا اختیار عمل میں آنے لگے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ جہاں نفس ناپاکیوں اور پلیدیوں سے پاک اور صاف ہو جائے گا وہاں غیظ و غضب کا سرچشمہ بھی ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔

غصے کی آگ بھڑک اٹھنے کے بعد اس کا علاج دو طرح ممکن ہے۔ ایک بطریق علم اور دوسرا بطریق عمل۔ علم کی چھ صورتیں ہیں۔

(اول) انسان اُن احادیث واخبار میں غور وفکر کرے جو غصہ وخشم کے ضبط و تحمل اور برداشت کی خوبی و مدح میں وارد ہوئی ہیں۔

(دوم) اپنے نفس کو اللہ کے عذاب وعقاب سے ڈرائے اور سوچے کہ جس شخص پر وہ اپنا غصہ نکالنا چاہتا ہے اُس پر اُسے اتنی قدرت حاصل نہیں جتنی کہ اللہ کو خود اس پر حاصل ہے۔

(سوم) عداوت وانتقام کے نتائج بد سے اپنے آپ کو آگاہ کرے اور سوچے کہ کل اگر دشمن نے بھی مقابلے کی ٹھان لی اور اس کے قصرِ عزت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کی مصیبت والم پر خوشی اور مسرت کے شادیانے بجائے تو پھر خود اس کا کیا حال ہوگا؟

(چہارم) اس بات پر غور کرے کہ غصے میں اس کی صورت کتنی قبیح کتنی مسخ اور پاگل کتے سے کتنی مشابہ ہوجاتی ہے۔ اور اس کے برعکس ایک متحمل اور بردبار کی صورت وشکل انبیاء و رسل سے کیسی ملتی جلتی ہوتی ہے۔

(پنجم) اُن اسباب میں غور کرے جو اُسے انتقام کے لئے آمادہ کرتے اور غصے کو ضبط کرنے سے باز رکھتے ہیں۔

(ششم) اُسے جاننا چاہئے کہ اُس کے غصے کا تنہا سبب یہ ہے کہ تمام امور اللہ کی مرضی اور مشیت کے تحت انجام کیوں پاتے ہیں، میری مرضی اور خواہش کے مطابق انجام کیوں نہیں پاتے۔

عملی صورت یہ ہے کہ استعاذہ پڑھو اگر یہ بھی مفید نہ ہو تو پھر اگر غصے کی حالت میں کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ اور زمین کے اُن ناچیز وحقیر ذرات سے قریب تر ہوجاؤ جن سے تم پیدا کیے گئے ہو تاکہ تمہیں اپنی ذلت وحقارت کا علم ہوجائے۔ اگر یہ صورت بھی کارگر نہ ہو تو وضو کرو یا ٹھنڈے پانی سے غسل کرو۔

بُرائی کے مقابلے میں برائی

غیظ وغضب کے علاج، تحمل وبرداشت کی فضیلت، غصے کو ضبط کرنے کی خوبی وعمدگی

دغیرہ کو بیان کرنے کے بعد غزالی نے بات چیت اور گفتگو کے ذریعہ کسی سے بدلہ و انتقام لینے کی اس حد و مقدار کو بیان کیا ہے جو شرعاً جائز اور روا ہے۔ گو وہ غیبت کے مقابلے میں غیبت، تجسس کے مقابلے میں تجسس، اور دشنام طرازی کے مقابلے میں دشنام طرازی کی اجازت نہیں دیتے لیکن اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے کہ گذشتہ امور کے علاوہ ہلکی ہلکی باتوں میں کوئی شخص اپنے مقابل کو کچھ بُرا بھلا کہہ کر اپنا جی ہلکا کرلے لیکن مناسب اور بہتر اس حالت میں بھی یہی ہے کہ ایسا نہ کرے کیونکہ بدلہ و انتقام میں انسان عموماً جائز حدود کا خیال نہیں رکھ سکتا اور ظاہر ہے کہ جواب میں کچھ کہنے کی نسبت خاموشی اختیار کرنا زیادہ سہل اور زیادہ قرینِ احتیاط ہے۔

اس کے بعد غزالی نے غصے کے اعتبار سے انسانوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ (اول) جسے غصہ جلدی آئے اور جلدی فرو ہو جائے (دوم) جسے غصہ دیر میں آئے اور دیر میں فرو ہو (سوم) جسے غصہ جلدی آئے اور دیر میں فرو ہو۔ یہ سب قسموں میں بدترین قسم ہے۔ (چہارم) جسے غصہ دیر میں آئے اور جلدی فرو ہو جائے۔ غزالی کی رائے میں چاروں قسموں میں یہ قسم انتہائی پسندیدہ ہے بشرطیکہ ایسے مواقع میں نہ ہو جہاں انسان کی حمیت و غیرت پر داغ یا حرف آئے۔

حکام پر غزالی نے لازم اور واجب گردانا ہے کہ وہ غصے کی حالت میں کبھی کسی کو سزا نہ دیں۔ کیونکہ اس حالت میں جہاں جائز حدود سے بڑھ جانے کا قوی امکان ہے اور احتمال موجود ہے وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ مجرم پر یہ حاکم پہلے سے ناراض ہو اور غصے کی حالت میں نہ صرف جرم کی سزا بلکہ اپنی ناراضگی اور خفگی کی سزا بھی اُسے دے ڈالے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس صورت میں خود مجرم اور گنہگار ہوگا کیونکہ اُس کا فرض یہ تھا کہ اللہ کے دین کی نصرت و اعانت اور تقویت و استحکام کے لئے سزا دیتا نہ یہ کہ اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا۔

آخر میں یہ بات ہمیں ہرگز نہیں بھولنی چاہیئے کہ جو لوگ غصے کی اطاعت کرکے دوسروں پر ظلم و ستم ڈھاتے اور اس پر اتراتے، فخر کرتے بلکہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے اور

اسے بہادری و شجاعت کا نام دیتے ہیں۔ غزالی نے ایسے لوگوں سے بچنے اور مجتنب رہنے کی بڑی نصیحت و تلقین کی ہے۔ کیونکہ بہرکیف یہ بات مسلّم ہے کہ

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

دُوسری فصل

کینہ

کینہ غزالی کی رائے میں غصے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص انتقام لینے پر قادر نہیں ہوتا اور غصے کو ضبط کرتا رہتا ہے تو یہ آہستہ آہستہ قلب و باطن کی طرف راہ پاتا رہتا ہے تا آنکہ باطن میں اس کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور یہ کینے کی صورت اختیار کر لیتا ہے ان کے قول کے مطابق کینہ کا معنی یہ ہے کہ انسان دشمن کو ہمیشہ بُرائی، نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھے۔ کینے کے نتائج مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) حسد۔ اور وہ یہ کہ انسان اس بات کی خواہش کرے کہ اُس کا دشمن کبھی پھلے پھولے اور ترقی نہ کرے۔ جب دشمن کو کوئی تکلیف یا مصیبت پہنچے تو اُس سے خوش ہو اگر اُسے کوئی خوشی یا مسرت ہو تو اُس پر مغموم اور دلگیر ہو۔

(۲) کسی سے باطنی حسد پر اس امر کا اور اضافہ کرے کہ جب دشمن پر کوئی مصیبت آئے تو خوش ہو کر دوسروں سے اس کا ذکر کرتا پھرے۔

(۳) چاہے دشمن اس کی صلح و دوستی کی طرف کتنا ہی مائل و راغب کیوں نہ ہو یہ اُس سے قطع تعلق اور مکمل کنارہ کشی برتے۔

(۴) حقارت اور نفرت کی وجہ سے ہمیشہ اُس سے اعراض اور روگردانی کرے۔

(۵) اُس کے باب میں اُن امور و اعمال کا ارتکاب کرے جو شرعاً حرام اور ممنوع ہیں مثلاً

غیبت، جھوٹ، افشاءِ راز، بے عزتی اور پردہ دری وغیرہ

(۶) بطور تمسخر و استہزا ہمیشہ اس کی نقالی کیا کرے۔

(۷) زد و کوب یا دوسرے ایسے ہی طریقوں سے اسے ایذا پہنچائے جن سے اُس کے بدن کو تکلیف ہو۔

(۸) اُس کے حقوقِ واجبہ ادا نہ کرے مثلاً ادائے قرض، صلہ رحمی یا حق دہی وغیرہ

غزالی کہتے ہیں :۔

"یہ سب حرام اور ممنوع ہے۔ کینہ کا اقل درجہ یہ ہے کہ انسان مذکورہ بالا آٹھ امور سے اجتناب اور احتراز کرے اور کینے کی وجہ سے اُن امور کے ارتکاب سے باز رہے جو اللہ کی نافرمانی اور معصیت کا سبب ہوتے ہیں کسی سے راضی اور خوش ہونے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان اُس سے نرمی، بشاشت اور شفقت و عنایت سے پیش آئے، اُس کی حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا کرے اور جہاں اُس کے حق میں دعائے خیر کیا کرے وہاں لوگوں میں اُس کی مدح و توصیف سے کام لے کر انہیں اُس کی ہمدردی اور غمخواری کی نصیحت و تلقین کیا کرے۔ ان حقیر امور کی وجہ سے کوئی شخص گو دین میں ایسا بڑا مقام حاصل نہیں کر سکتا لیکن اللہ کے عذاب و عقاب سے اپنے آپ کو بچا لے سکتا ہے۔"

بدلہ و انتقام پر قدرت و طاقت رکھتے وقت کینوں کی تین حالتیں ہیں پہلی یہ کہ بغیر کسی زیادت اور نقصان کے دوسرے سے اپنا حق وصول کرے، یہ عدل ہے، دوسری یہ کہ عفو اور درگزر سے کام لے حقیقت میں خوبی اور فضیلت کی بات یہی ہے تیسری یہ کہ اُس پر ظلم اور زیادتی کرے، یہ شرعاً حرام اور ممنوع ہے۔

تیسری فصل

حسد

حسد کینے سے پیدا ہوتا ہے، غزالی کی رائے میں اس کے چار مراتب ہیں

(۱) انسان دوسرے سے نعمت و دولت کے زوال کا طلبگار رہو، چاہے اس سے اسے خود کوئی فائدہ حاصل نہ ہو، یہ انتہائی درجہ کی خباثت اور رذالت ہے۔

(۲) انسان چاہے کہ دوسرے کی نعمت میری طرف منتقل ہو جائے، کیونکہ یہ نعمت فی نفسہ اسے عزیز اور محبوب ہے۔ مثلاً کسی کی خوبصورت بیوی دیکھ کر یہ خواہش اور آرزو کرے کہ یہ میری بیوی ہو جائے۔ اس حالت میں اس کا مطلوب تنہا اس نعمت کی ذات اور وجود ہے۔ دوسرے سے زوال مطلوب نہیں اور اسے ناگوار صرف یہ ہے کہ یہ بیوی میری کیوں نہیں؟ ناگوار یہ ہرگز نہیں کہ یہ دوسرے کی کیوں ہے؟

(۳) اپنے لئے کسی معین اور مشخص نعمت کا طلبگار نہ ہو بلکہ کسی معین نعمت کی نظیر اور مثال کا طالب ہو، اور اگر یہ نظیر و مثال حاصل نہیں ہوتی تو پھر یہ چاہے کہ دوسرے کے پاس بھی یہ نعمت نہ رہے تاکہ اس کے اور دوسرے کے مابین جو فرق و تفاوت ہے وہ زائل و رفع ہو جائے۔

(۴) اپنے لئے دوسرے کی نعمت کی نظیر و مثال کا طالب ہو، فرض کیجئے وہ میسر نہیں آتی تو دوسرے سے اس کے زوال کی خواہش نہ کرے۔ اگر دنیا کی کسی نعمت کے سلسلے میں ایسا ہو تو کوئی حرج اور مضائقہ نہیں اور اگر دین کے معاملے میں ہو تو مستحسن بلکہ مستحب ہے۔

پہلا مرتبہ قبیح اور مذموم ہے۔ دوسرے مرتبے کو مجازاً حسد کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں دوسرے کی مملوک چیز کی تمنا ہے اور یہ بات بھی یقیناً مذموم ہونی چاہئے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ارشاد ہے ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعض تیسرا مرتبہ پہلے مرتبہ کی نسبت کچھ ہلکا اور خفیف ہے۔

حسد کے اسباب اور اس کا علاج

غزالی کی رائے میں عداوت، تکبر، خودنگری، خودپسندی، عزیز و محبوب مقاصد میں ناکامی، حبِ جاہ و منصب اور خباثت نفس وغیرہ امور حسد کا سبب بنتے ہیں، ہم عمر، ہم عصر اور ہم مرتبہ دوستوں، حقیقی یا چچازاد بھائیوں، قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں میں حسد عموماً زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جہاں مراسم و تعلقات قوی اور گہرے ہوں گے، حسد، بغض، عداوت اور دشمنی کے اسباب بھی وہاں اتنے ہی قوی اور پختہ ہوں گے۔

غزالی کی رائے میں حسد کا علاج یہ ہے کہ نفس کو اس قباحت و رذالت کے مصائب و خطرات پر کماحقہ مطلع و آگاہ کیا جائے۔ کیونکہ حاسد دوسرے کی اس نعمت پر پیچ و تاب کھاتا ہے، جو اللہ نے اُسے مرحمت کی ہے۔ حالانکہ ایک دانش مند کا شیوہ و شعار یہ ہونا چاہیئے کہ وہ دوسروں سے تعرض کرنے کی بجائے اپنے نفس کی اصلاح میں گم رہے اور لایعنی، بے ہودہ، غیر مفید اور دور از کار باتوں میں اپنا وقت ضائع نہ کرے اور آپ ہی بتائیے کہ اس سے بڑھ کر تضیعِ اوقات اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان دوسرے کی اس نعمت کے بغض و دشمنی میں اپنا وقت کھوئے جس کو دوسرے سے زائل و دور کرنے پر کسی صورت بھی قادر نہیں ہے۔

آخر میں غزالی نے ثابت کیا ہے کہ حسد تقریباً انسان کی گھٹی اور خمیر میں موجود ہے اس لیئے اس سے بالکلیہ پاک اور بری ہونا ناممکن اور محال ہے۔

چوتھی فصل

خودپسندی

علم یا عمل یا مال و دولت میں برتری اور فوقیت کی وجہ سے عالم کی تین حالتیں ہیں۔

(اول) یہ کہ عالم کو ان امور کے زائل ہونے کا خوف یا ان کے مکدر اور بے رونق ہونے کا

کھٹکا یا سرے سے سلب ہی ہو جانے کا ڈر ہو ایسے شخص کو خود پسند نہیں کہتے۔

(دوم) ان امور کے زائل ہو جانے کا خوف نہ ہو بلکہ اس کے برعکس وہ اس پر خوش ہو کہ یہ اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے اس میں میری ذاتی جد و جہد کو کچھ دخل نہیں۔ ایسے شخص کو بھی خود پسند نہیں کہتے۔

(سوم) ان امور کے زوال سے خائف نہ ہو بلکہ اس وجہ سے خوش ہو کہ یہ امور رفعت جاہ اور بلندی و منصب کا ذریعہ ہیں اور اُسے اس امر کا تصوّر ہی نہ ہو کہ یہ کوئی اللہ کی بخشی ہوئی دولت و نعمت ہے۔ خود پسندی یا عُجب اسی کو کہتے ہیں تو گویا عجب کی تعریف یہ ہوئی کہ انسان دولت و نعمت کے نشے میں سرشار و مست ہو کر منعم حقیقی کو بھول ہی جائے۔ غزالی کہتے ہیں :-

"اگر اس پر اس امر کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ کوئی شخص یہ سمجھے کہ اللہ پر میرا کوئی حق واجب، اور اُس کے ہاں میرا کوئی بڑا مرتبہ و مقام ہے۔ یہاں تک کہ اپنے حسن عمل کے صلے میں ضروری سمجھے کہ اُسے دنیا میں لامحالہ کوئی بڑا جاہ و منصب ملنا چاہیے۔ اور فساق و فجار کے ساتھ صبح و شام جو برا سلوک کیا جاتا ہے اُسے اپنے باب میں ناممکن و محال سمجھے تو اسے افتخار کہتے ہیں اور یہ عُجب سے بھی کچھ پرے درجے کی چیز ہے۔ کیونکہ ہر مفتخر خود پسند ہوتا ہے لیکن ہر خود پسند کا مفتخر ہونا ضروری نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بغیر کسی صلہ و جزاء کی امید کے اپنے آپ کو برتر سمجھنا اور اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کو بھول جانا عُجب و خود پسندی کہلاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف افتخار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں حسن صلہ اور حسن جزا کی توقع و امید بھی موجود ہو۔ خود پسندی اور افتخار دونوں منجملہ مقدمات و اسباب غرور و تکبر[1] ہیں "

خود پسندی کے اسباب اور اس کا علاج

خود پسندی کے اسباب کے ساتھ اُس کا علاج بھی ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] ج ۳ ص ۲۷۷

(اول) انسان کو اپنے بدن کی صحت و تندرستی، ہیئت و شکل، خوبصورتی و جمال، تناسب اعضا، اور خوش الحانی وغیرہ بھلی معلوم ہو۔
علاج اس کا یہ ہے کہ انسان اس امر پر غور کرے کہ مرنے کے بعد حسین چہروں اور نرم و نازک جسموں پر کیا گذرتی ہے اور مٹی کے ذروں میں مل کر ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔
(دوم) کسی کو قوت و اقتدار کا گھمنڈ ہو سو علاج اس کا یہ ہے کہ وہ سوچے کہ قومِ عاد جیسی جابر و قاہر قوم کیسے سخت عذاب کا شکار ہوئی۔
(سوم) کسی کو دینی اور دنیوی امور و مصالح میں تہ رسی، دقیقہ شناسی، نکتہ سنجی اور اپنی عقلی فراست اور تدبر و کیاست پر ناز ہو۔ اس کا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان خود سرا اور مغرور ہو کر دوسروں سے کسی باب میں مشورہ لینا ہی پسند نہیں کرتا۔
علاج اس کا یہ ہے کہ یہ حضرت سوچیں کہ کل اگر ان کی عقل یا ان کے دماغ میں کوئی نقص و فتور آ جائے تو یہ ساری باتیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔
(چہارم) خاندانی نجابت و شرافت پر اترانا۔ علاج اس کا یہ ہے کہ اسے غور کرنا چاہیے کہ اگر اس کے اعمال و اخلاق اچھے اور پسندیدہ نہیں ہیں تو اس کا یہ خیال کرنا کہ بدعملی اور بدکرداری کے باوجود وہ قیامت کے روز اپنے آبا و اجداد کے پہلو میں جگہ پائے گا سراسر حماقت، جہالت اور فریب ہے۔
(پنجم) علمی اور دینی شرافت کو چھوڑ کر کوئی شخص ظالم بادشاہوں یا اُن کے اعوان و انصار کی طرف منسوب ہونے پر فخر کرے۔ علاج اس کا یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں میں بھی ان کی ذلتوں اور رسوائیوں پر غور کرے اور اس امر کا اندازہ کرے کہ یوم الحساب میں ان پر کیا گذرے گی۔
(ششم) اولاد و حشم و خدم، اعزہ و اقارب، اعوان و انصار اور اپنے متبعین و مریدین کی کثرت پر فخر کرے۔ علاج اس کا یہ ہے کہ وہ سوچے کہ یہ سب کے سب کیا ہیں؟ ناتوان اور

کمزور انسانوں کا ایک مجموعہ ہیں جو اپنی اپنی ذات کے نفع و مضرت اور سود و زیاں میں سے بھی کسی بات پر کوئی قدرت اور طاقت نہیں رکھتے۔

(ہفتم) مال و دولت کی کثرت و فراوانی پر اترانا۔ علاج اس کا یہ ہے کہ دولت کی تباہ کاریوں پر غور کرے اور سوچے کہ تنہا اس کی وجہ سے معلوم نہیں کتنے لوگوں کے حقوق اس کے ذمے واجب ہوگئے ہیں اور وہ ان کی ادائگی سے کبھی عہدہ برآ ہو بھی سکے گا یا نہیں؟

(ہشتم) غلط رائے پر فخر کرنا جیساکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا غزالی کہتے ہیں:۔

"فخر و عُجب کے دوسرے اقسام کی نسبت اس قسم کا علاج زیادہ مشکل اور دشوار ہے کیونکہ یہ مرض بہت مخفی ہے اور غلط نگر کو اس امر کا علم و احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کی رائے غلط اور نادرست ہے۔ جب اصل مرض ہی کا علم و اعتراف نہیں تو اس کے علاج کی جانب وہ متوجہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چونکہ جہالت و کوری بھی ایسا ہی مخفی مرض ہے اس لئے اس کا علاج بھی نہایت مشکل ہے اس کے علاج کے لئے زیادہ سے زیادہ تدبیر یہ کی جاسکتی ہے کہ ایسا شخص اپنی رائے کا اس وقت تک اعتبار نہ کرے جب تک کہ اس کی اصابت و صحت کے لئے کتاب و سنت سے کوئی قطعی دلیل یا عقلی شواہد میں سے کوئی محکم شاہد اس کے پاس موجود نہ ہو[1]"

گذشتہ بالا امور کے علاوہ غزالی نے اس امر کو بھی بہ صراحت بیان کیا ہے کہ تعلق باللہ پر فخر و عجب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان گناہوں کو بالکل بھول جاتا اور ان سے یکسر قطع نظر کر لیتا ہے تعلق باللہ کی پختگی اور استواری کے گھمنڈ میں وہ اس امر کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کر سکتا کہ کبھی اپنے گناہوں اور لغزشوں کا جائزہ بھی لے اور جو کبھی چھوٹے موٹے گناہوں کا جائزہ لیتا بھی ہے تو انھیں نہایت حقیر و بے وقعت سمجھنے کی وجہ سے ان کے تدارک اور تلافی

---

[1] ج ۳ ص ۳۸۴

کی طرف توجہ نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس اس خام خیالی کا شکار ہو جاتا ہے کہ ان گناہوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ یقیناً انہیں معاف و درگزر فرما دیں گے واقعی یہ مقام بڑا نازک اور خطرناک ہے جب کوئی شخص اپنے حسنِ اعمال کے غرور و پندار میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کی آنکھ پر غفلت کی پٹی بندھ جاتی ہے اور اس کی ساری سعی و محنت ضائع اور اکارت چلی جاتی ہے کیونکہ ظاہری اعمال و افعال جب تک ہر طرح کی آلودگیوں اور آلائشوں سے بکلی پاک اور صاف نہ ہوں ان کے نفع و افادیت میں نہایت قوی شک اور شبہ باقی رہتا ہے۔ اپنے اعمال و افعال کا جائزہ تنہا وہی شخص لے سکتا ہے جس پر اللہ کا خوف اور خشیت غالب ہو، وہ بدبخت خود پسند جو اپنی رائے کے اٹل اور پختہ ہونے کا یقین رکھتا ہے اور غفلت و سرشاری سے اُسے مہلت ہی نہیں ملتی وہ اپنے اعمال کا جائزہ لے گا تو کیوں کرے گا، وہ بے چارہ تو ہر وقت یہی سہانے خواب دیکھا کرے گا کہ چونکہ میں نے وصول باللہ کا مقام و مرتبہ حاصل کر لیا ہے اس لئے اللہ کے عذاب کا ہاتھ میرے بارے میں کبھی حرکت و جنبش میں نہیں آ سکتا، غزالی کہتے ہیں موت و ہلاکت اگر دنیا میں کوئی چیز ہے تو یقیناً یہی ہے۔

پانچویں فصل

کبر و تکبر

غزالی نے کبر کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ باطنی اور ظاہری۔ باطنی کا تعلق نفس سے اور ظاہری کا تعلق اُن اعمال و افعال سے ہے جو اعضاء و جوارح سے صادر ہوتے ہیں۔ باطنی حصے کو کبر اور ظاہری حصے کو تکبر کہتے ہیں۔ غزالی کی رائے میں کبر عجب و خود پسندی ہی کا نتیجہ ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ عجب و خود پسندی کا تعلق تنہا اپنی ذات سے ہوتا ہے لیکن اس کے

برعکس کبر امورِ اضافیہ میں سے ہے اور اس کے لیے کوئی ایسی دوسری ذات بھی درکار ہے جس کے بارے میں تکبر سے کام لیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر خود پسند متکبر بھی ہو، کیونکہ بسا اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی ذات، اپنے مال یا اپنے حسنِ عمل کی وجہ سے خود پسند ہو۔ چاہے اُسے کسی دوسرے شخص کے وجود کا علم اور احساس ہی نہ ہو۔

متکبّر علیہ[۱] کے اعتبار سے تکبر کی تین قسمیں ہیں۔

(اول) فرعون کی طرح اللہ کے بارے میں تکبر سے کام لینا، ظاہر ہے کہ یہ بدترین قسم ہے

(دوم) بنی اسرائیل اور قریش کی طرح انبیاء و رسل کے بارے میں تکبر کرنا۔

(سوم) اپنے کو بلند و ارفع اور دوسرے انسانوں کو حقیر و ہیچ سمجھنا۔

تکبّر کے اسباب

تکبر کے سات اسباب ہو سکتے ہیں۔

(اول) علم۔ سبحان اللہ! علماء اس کا کتنا بڑا شکار ہیں۔

(دوم) عمل اور عبادت۔ تکبر کے اعتبار سے علماء اور عباد کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ تکبر اور غرور کی جڑیں تو قلب کی زمین میں مضبوط اور گہری ہوں لیکن انسان محنت و کوشش اور تکلف و تصنع کے ساتھ اپنے آپ کو متواضع اور منکسر اور دوسروں سے حقیر اور کمتر ظاہر کرے۔ ایسے شخص کے دل میں گو تکبر کا پودا پوری طرح نشو و نما پا چکا ہوتا ہے لیکن اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس نے اس پودے کی شاخیں کاٹ دی ہوں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اس جذبۂ تکبّر کو چھپا نہ سکے اور مجالس و محافل میں دوسروں سے اپنے آپ کو بلند و برتر ظاہر کرے اپنے ہم عصروں اور ہم جلیسوں کو خاطر میں نہ لائے جو اس کے کسی حق کی ادائگی اور بجا آوری میں کچھ تقصیر یا کوتاہی کرے۔ اُس سے بے رخی اور بے التفاتی برتے۔ غزالی کہتے ہیں:۔

"یہ بے چارہ نہیں جانتا کہ زہد و ورع کا تعلق پیشانی سے نہیں ہے تاکہ اس پر شکن ڈال دیئے جائیں

---

[۱] جس کے بارے میں تکبر سے کام لیا جائے۔

چہرے سے نہیں ہے کہ اُس پر عبوست طاری کرلی جائے، بے رخی سے نہیں ہے کہ لوگوں سے بے التفاتی برتی جائے، گردن سے نہیں ہے کہ اُسے جھکا لیا جائے، لباس سے نہیں ہے کہ اُسے سمیٹ کر چلا جائے بلکہ ان تمام امور کے برعکس زہد و ورع کا تعلق تو خالصتاً قلب و دل کی دنیا سے ہے[1]۔"

تیسرا درجہ یہ ہے کہ کبر کی نجاست زبان پر آجائے اور ہر وقت ادعاء، مفاخرت، تزکیۂ نفس اور ہمچو من دیگرے نیست کا نعرہ زبان پر ہو اور اپنے احوال و مقامات کی فرضی داستانیں رہ رہ کر دوسروں سے کہتا پھرے۔

(سوم) حسب و نسب پر تکبر کرنا۔

(چہارم) حسن و جمال پر اترانا اس کا زیادہ تر شکار عورتیں ہوتی ہیں۔

(پنجم) مال و دولت، تکبر کی یہ قسم ملوک و سلاطین کے مابین کثرت خزائن، تاجروں میں کثرت سامانِ تجارت، زمینداروں میں کثرتِ اراضی، خوش ذوق و خوش پسند لوگوں میں خوش لباسی، گھوڑوں اور دوسری سواریوں کی فراوانی و کثرت میں مقابلہ و مسابقت کی وجہ سے زیادہ پائی جاتی ہے۔

(ششم) قوت و اقتدار کی وجہ سے متکبر ہونا۔

(ہفتم) اتباع و انصار، تلامذہ و مستفیدین، حشم و خدم اور اعزہ و اقارب کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے متکبر ہونا اس کے سب سے زیادہ شکار دو گروہ ہوتے ہیں، علماء اور سلاطین — جہاں سلاطین یہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی افواج دوسرے سلاطین سے زیادہ ہوں وہاں علماء کو ہمیشہ یہ بھوت سوار رہتا ہے کہ اُن کے تلامذہ اور شاگرد دوسرے معاصر علماء سے کسی صورت کم نہ ہوں۔

غزالی کہتے ہیں:-

---

[1] ج ۳ ص ۳۵۵

"حاصل کلام یہ کہ ہر وہ نعمت جو فی نفسہٖ چاہے کمال نہ ہو لیکن اُسے کمال سمجھ لیا جائے اس کے ساتھ کہیں نہ کہیں تکبر کی آلائش ضرور شریک ہو جاتی ہے"

غزالی کی رائے کے مطابق تکبر کی علامات کو کسی شخص کے عادات و اطوار کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً دوسروں سے بے رخی سے پیش آنا، ترچھی نگاہ کرنا، سر کو جھکانا، تکیہ لگا کر بیٹھنا، رفتار میں بانکپن کا لحاظ رکھنا۔ غرضیکہ نشست و برخاست، چال ڈھال، حرکت و سکنت قول و عمل سب چیزوں سے انسان کے تکبر کو معلوم کر لیا جا سکتا ہے۔

غزالی کی رائے میں تکبر کو اپنے سے دور اور الگ کرنا فرض عین ہے اور اس باب میں صرف تمنا اور آرزو ہی کافی نہیں بلکہ کسی نافع اور مفید علاج کی طرف رجوع ضروری ہے۔

تکبّر کا علاج

تکبر کا علاج دو طرح سے کیا جاتا ہے (اول) دل کی زمین سے اس کا شجرۂ خبیثہ ہی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ غزالی کی رائے میں یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کو اللہ کی عزت و جبروت اور اپنی ذلت و عاجزی کا پورا پورا احساس ہو جائے۔ (دوم) تکبر کے اسباب و بواعث کو اپنے سے زائل اور دور کر دیا جائے۔ اس کے منجملہ اسباب کے سات اسباب ابھی ابھی بیان ہو چکے ہیں اور گو غزالی نے ہر سبب کے لئے ایک الگ اور مخصوص علاج تجویز کیا ہے لیکن چونکہ نتیجہ و ماحصل کے اعتبار سے تکبر کا علاج عُجب و خود پسندی کے علاج سے زیادہ مختلف نہیں ہے اس لئے ہم صرف اتنے بیان ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ تکبر و غرور، عجب و خود پسندی ہی کے شجرۂ خبیثہ کا برگ و بار ہے اور ان دونوں کے اسباب تقریباً مساوی و یکساں ہیں

چھٹی فصل

زبان کی تباہ کاریاں

چونکہ غزالی کی رائے میں زبان تمام فتنوں کی جڑ ہے اور انسان کا فرض ہے کہ حتی المقدور اس کو ضبط اور قابو میں رکھے۔ اس لیے انھوں نے اس کے نقصانات اور تباہ کاریوں کو بڑی بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے اور تقریباً پچاس صفحات میں ان نقصانات کے اسباب، حدود نتائجِ بد اور ان سے اجتناب و احتراز کے طرق و تدابیر قلمبند کیے ہیں۔

زبان کے نقصانات بیان کرنے سے قبل تمہیداً انھوں نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں بڑے مبالغے اور شدت کے ساتھ خاموش رہنے کی تلقین کی ہے اور آخر میں اس کے حسن و خوبی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اگر تم پوچھو کہ خاموشی کی اتنی بڑی فضیلت کی وجہ کیا ہے تو یاد رکھو خطا کاری، جھوٹ، غیبت چغل خوری، نمائش پسندی، نفاق، بے ہودہ درزی، کج بحثی، خودستائی، باطل پروری، خصومت یاوہ گوئی، تصرف بے جا، زیادتی اور کمی، ایذا رسانی اور پردہ دری وغیرہ ساری قباحتوں کا منبع و سرچشمہ تنہا زبان ہی ہے

یہاں سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ زبان کے نقصانات کتنے بڑے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ گذشتہ قباحتوں میں سے کوئی قباحت زبان پر بار نہیں گذرتی بلکہ اس کے برعکس ان سے دل میں ایک گونہ حلاوت اور ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ حرص و طمع کے ساتھ شیطان بھی ان نقصانات کے اسباب کو ہوا دیتا ہے اس لیے بڑا مشکل ہے کہ کوئی شخص زبان کو پوری طرح قابو میں رکھ کر صرف جائز اور پسندیدہ امور میں اسے استعمال میں لائے، ہاں تنہا وہی شخص ایسا کر سکتا ہے جس کی نگاہ ہر آن اور ہر لحظہ علم و معرفت کی گہرائیوں پر رہے"

آخر میں غزالی نے محسوس کیا کہ کہیں اس سلسلے میں انھیں مبالغہ آرائی اور سخن بے دردی کا الزام نہ دیا جائے چنانچہ اس سے بچنے کے لئے کہتے ہیں:۔

"صرف ایک بات سے خاموشی کی خوبی و فضیلت تم پر واضح ہو جائے گی۔ اور وہ یہ کہ کلام کی چار قسمیں ہیں (اول) جس میں نقصان ہی نقصان ہے (دوم) جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، (سوم) جس میں کچھ نقصان اور کچھ فائدہ ہے (چہارم) جس میں نہ فائدہ ہے نہ نقصان۔ پہلی اور تیسری قسم میں ظاہر ہے کہ خاموشی ہی کو ترجیح ہونی چاہیے، چوتھی قسم فضول اور زائد ہے اور اس سے بجز تضیع اوقات اور اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے اور کچھ حاصل نہیں۔ اب مجموعۂ کلام کی صرف ایک چوتھائی باقی رہی سو وہ بھی خطرے سے خالی نہیں، کیونکہ اس میں بھی نمائش، تصنع، غیبت، خودستائی اور بیہودہ گوئی، ایسے مخفی طرق سے راہ پا لیتی ہیں کہ انسان کو علم تک نہیں ہونے پاتا اور اس طرح وہ اپنے آپ کو نادانستہ طور پر ایک بہت بڑے خطرے اور مصیبت سے دوچار کر دیتا ہے"[1]

حقیقت یہ ہے کہ غزالی نے عافیت کوشی اور سلامت پسندی کی تلقین میں بڑے مبالغے اور اغراق سے کام لیا ہے۔ ہم زبان کے جمیع نقصانات کو بالاختصار یہاں درج کئے دیتے ہیں، تاکہ اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکے کہ مختلف افراد کی طبائع کے بارے میں غزالی کی رائے اور نظریہ کیا ہے؟

بے ہودہ گوئی

زبان کا پہلا نقصان بے ہودہ گوئی ہے اور اس کی تعریف غزالی نے یہ کی ہے کہ ہر وہ کلام جس سے اگر تم خاموش رہتے تو حال و مآل میں نہ تو تمھیں کوئی نقصان اور ضرر پہنچتا اور نہ ہی گنہگار ہوتے۔ مثلاً تم اپنے مختلف سفر یا ان سفروں میں جو دریا یا پہاڑ دیکھے ہیں یا جن مشاہیر علماء و مشائخ سے ملے ہو یا جن حوادث و واقعات سے دوچار ہوئے ہو، یا جن جن عمدہ کھانوں،

---

[1] ج ۳ ص ۱۱۸

کے کھانے یا جن جن عمدہ لباسوں کے پہننے کا تمہیں موقع ملا ہے ان کا ذکر کرو۔

افسوس ہے غزالی کی نگاہ سے ان باتوں کی خوبیاں اوجھل رہیں۔ سفروں اور سیاحتوں کا تذکرہ، مختلف ممالک کی آب و ہوا، اور وہاں کے باشندوں کے اخلاق و عادات وغیرہ پر دوسروں کو مطلع و آگاہ کرنا حقیقت میں انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ جن لوگوں نے مختلف اُمم و اقوام کے اخلاق و اطوار پر ہمیں مطلع کیا اور اپنی سیاحتوں کی اثناء میں انھیں جن جن پہاڑوں اور دریاؤں کے دیکھنے یا جن جن کھانوں کے تناول اور جن جن لباسوں کے پہننے کا موقع ملا ان کا ہم سے تذکرہ، غزالی کی نگاہ میں اضاعت اوقات کے مرادف ہی کیوں نہ ہو حقیقت میں ہم پر بہت بڑے احسان اور بہت بڑے کرم کے مرادف ہے۔

ایک بات کے لایعنی قرار دینے میں غزالی بالکل حق بجانب ہیں اور وہ یہ کہ جب کوئی دوست اتفاق سے راستے میں ملے تو آپ اُس سے پوچھیں کہ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں ہو سکتا ہے کسی مصلحت سے وہ آپ کو صحیح مقام پر مطلع کرنا مناسب نہ سمجھتا ہو۔ اب اگر وہ صحیح صحیح مقام بتا دے تو اُسے دکھ ہوگا یا شرم آئے گی اور اگر غلط بتائے گا تو جھوٹا ہوگا اور چونکہ سبب اس کے تم ہی بنے ہو لہذا بار بھی تم ہی پر ہوگا۔ ایسے ہی یہ بھی درست نہیں کہ کسی شخص سے اُس کے گناہوں کو کرید کرید کر پوچھا جائے یا کسی سے ایسے امور دریافت کیے جائیں جن کو وہ مخفی رکھنا چاہتا یا ان کے ذکر میں شرم اور عار محسوس کرتا ہے۔

غزالی کی رائے میں اس آفت و نقصان کا باعث و سبب، غیر ضروری امور کے دریافت کرنے کی خواہش اور ہر ایک یا بیکار گپ شپ اور دل لگی، یا بیہودہ داستان سرائی کے ساتھ دفع الوقتی ہوتی ہے۔ علاج اس کا یہ ہے کہ انسان اس امر میں غور و فکر کرے کہ موت سامنے ہے اور ہر ہر بات کے لئے میں اللہ کے ہاں مسئول و جوابدہ ہوں۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک سانس بھی نہایت قیمتی ہے۔ میری زبان کیا ہے ایک جال ہے اگر چاہوں تو اس سے جنت کی حوروں کو شکار کر سکتا ہوں پھر یہ کیا بدبختی ہے کہ میں اس قیمتی متاع کو یونہی بیکار کھو رہا ہوں۔

غزالی کہتے ہیں :۔

"گزشتہ علاج تھا نصتاً علمی ہے۔ عملی علاج یہ ہے کہ انسان عزلت وانفراد اختیار کرے منہ میں کنکری رکھ لے اور مفید باتوں میں بھی بہت کم زبان کو کام میں لائے تاکہ بے کار اور لایعنی باتوں کی عادت ہی سرے سے چھوٹ جائے[1]"

یاوہ گوئی

زبان کا دوسرا نقصان یاوہ گوئی ہے۔ یہ لایعنی اور بے ہودہ کلام کے ارتکاب اور ضرورت سے زائد بات چیت دونوں کو شامل ہے۔ انسان جب کوئی جائز بات کرنا چاہے تو اس کے لئے دو صورتیں ممکن ہیں، چاہے تو نہایت مختصر الفاظ سے کام لے اور چاہے تو اُسے بڑھا چڑھا کر مبالغے کے ساتھ بیان کرے۔ غزالی کہتے ہیں :۔

"جب صرف ایک کلمے سے مقصود پورا ہو سکتا ہے تو دوسرے کلمے کا لانا گناہ اور نقصان کا موجب نہ سہی لیکن فضول اور مذموم ضرور ہے[2]"

اس نقصان کا سبب اور علاج بعینہٖ وہی ہے جو بے ہودہ گوئی کے تحت بیان ہو چکا ہے۔

لغو گوئی اور باطل پسندی

زبان کا تیسرا نقصان لغو گوئی اور باطل پسندی ہے۔ غزالی نے اجنبی عورتوں کے احوال و واقعات، فساق و فجار کی محافلِ عیش و نشاط، دولت مندوں بالخصوص جابر و قاہر بادشاہوں کے علاوہ و مذموم آداب و رسوم وغیرہ کے تذکرہ و بیان کو بھی باطل پسندی، لغو گوئی اور بیہودہ سرائی میں شمار کیا ہے۔ اور اُن کی رائے ہے کہ گو بے ہودہ گوئی اور یاوہ گوئی کا ارتکاب صرف استحباب اور اولویت کے خلاف ہے لیکن لغو گوئی کا ارتکاب شرعاً بالکل حرام اور ممنوع ہے بدعات اور مذاہب باطلہ کا بیان کرنا یا صحابہ کے مابین جو معرکے ہوئے ہیں ان کا اس طریق پر ذکر کرنا کہ جس سے ان پر طعن ہوتا ہو لغو گوئی اور باطل پسندی کے تحت داخل ہے آخر میں

---

[1] ج ۳ ص ۱۲۱

[2] ج ۳ ص ۱۲۱

کہتے ہیں :۔

کثرت و تعدد کی وجہ سے باطل کے مختلف انواع و اقسام کا حصر و شمار ممکن نہیں ہے لہذا ان سے مخلصی کی صورت یہی ہے کہ انسان دین اور دنیا کے صرف اہم امور ہی میں زبان کو جنبش و حرکت میں لائے[1]۔"

کج بحثی اور کج روی

زبان کا چوتھا نقصان کج بحثی اور کج روی ہے، غزالی نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ

"انسان دوسرے کے کلام میں کوئی نقص و خلل ظاہر کرے یا اُس کے لفظ یا معنی یا قصد اور نیت پر گرفت اور شبہ کرے۔"

اس سے باز رہنے کی تدبیر یہ ہے کہ انسان دوسرے کے کلام پر کوئی جرح و قدح نہ کرے بلکہ اگر حق ہے تو اس کی تائید کرے اگر باطل ہے اور اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں تو اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرے کسی کے کلام میں لغوی اور نحوی غلطیاں نکالنا یا نظم و ترتیب اور معنی و مفہوم یا قصد و نیت پر حملہ کرنا یا کہنا کہ تمہاری بات تو درست ہے لیکن تمہاری نیت درست نہیں ہے۔ صرف کسی ذاتی غرض سے ایسا کہہ دینا ہو، ہرگز جائز نہیں ہے۔ غزالی کہتے ہیں۔

"اگر کوئی شخص کسی علمی اور ادبی مسئلے میں یہ رویہ اختیار کرے تو اسے جدل کہتے ہیں جو انتہائی مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ اگر کسی مسئلے میں کوئی شک اور شبہ ہو تو یا تو اس میں خاموشی اور سکوت اختیار کیا جائے یا ایسے طریق سے اس کا استفسار کیا جائے جس سے ضد اور عناد کی بو نہ آتی ہو۔"

"دوسرے کو ساکت کرنا یا نیچا دکھانا، اُس کے کلام میں نقص یا عیب نکالنا، اسے کوتاہ فہمی یا جہالت کا الزام دینا، ان سب کو مجادلہ کہتے ہیں۔"

غزالی کی رائے میں اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے علم و فضل کی برتری اور

---

[1] ج ۳ ص ۱۲۲

دوسرے کی جہالت و غفلت کو ظاہر کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے اور حقیقت میں یہ دونوں باتیں سبعیت اور تکبر کا مظہر ہیں۔ علاج اس کا یہ ہے کہ کبر اور سبعیت کے قلع قمع کی فکر کی جائے (متقدمین کی رائے میں سبعیت اُس طبیعت و وجدان کا نام ہے جو انسان اور دوسرے بڑے بڑے حیوانات کے مابین مشترک ہے مثلاً انتقام قوتِ سبعیہ ہے کیونکہ یہ اصل میں اونٹ کا خاصہ ہے۔ دوسرے کی کمائی کھانے سے اجتناب کرنا اس لئے قوتِ سبعیہ ہے کہ یہ شیر کا خاصہ ہے جو دوسرے کا کیا ہوا شکار کبھی نہیں کھاتا۔

خصومت اور تکرار

پانچواں نقصان خصومت ہے۔ مال و دولت یا کسی دوسرے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے کسی سے لڑنا جھگڑنا اور تکرار کرنا خصومت کہلاتا ہے، غزالی کہتے ہیں۔

"اگر تم اعتراض کرو کہ جب کسی کا کوئی حق دوسرے کے ذمے واجب ہو تو اُس کو حاصل کرنے کے لئے بحث و تکرار تو ناگزیر ہے پھر اُس کو تم نے مذموم کیوں قرار دیا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے مذمت اُس خصومت و تکرار کی کی ہے جس میں حق و باطل کی تمیز روا نہ رکھی جائے رطب و یابس جو زبان پر آئے اُسے بے تکلف لڑھکا دیا جائے، یہاں تک کہ گالی گلوچ نکتہ چینی اور عیب گیری کہ جس کے بغیر بھی کام نکل سکتا تھا اُس سے بھی احتراز نہ کیا جائے اور ضد و عناد میں آکر دوسرے کو نیچا دکھانے پر کمر باندھ لی جائے۔ رہا وہ شخص جو بغیر افراط و تفریط کے اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے اور ناسزا امور کا ارتکاب ہرگز نہیں کرتا وہ کسی مذمت و نکوہش کا مستحق نہیں، ہاں پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ اولیٰ اور انسب اس حالت میں بھی یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تکرار سے اجتناب کیا جائے۔"

غزالی نے بوضاحت بیان کیا ہے کہ کس طرح غیظ و غضب کی آگ سینے کو بھر دیتی ہے اور کس طرح متنازع فیہ مسئلہ درمیان سے رخصت ہو کر اپنے پیچھے کینے کو چھوڑ جاتا ہے یہاں تک کہ فریقین میں سے ہر فریق دوسرے کے دکھ درد سے خوش اور اُس کی خوشی و مسرت سے

ناخوش ہوکر ایک دوسرے کے بارے میں اپنی زبان کو بے لگام کر دیتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئیے کہ جو شخص خصومت و تکرار کا شکار ہو گا اُسے لامحالہ ان کانٹوں سے اپنا دامن بھرنا ہی پڑے گا

کلام میں تکلف و تصنع

چھٹا نقصان چبا چبا کر باتیں کرنا اور جیسی کہ متفاصحین کی عادت ہے دور از کار مقدمات و تشبیہات سے کام لینا اور بہ تکلف سجع و قافیہ کے درپے رہنا اور رہندی کی چندی کرنا ہے۔

ایک خطیب اور عام آدمی کے کلام میں غزالی فرق کرتے ہیں۔ اول الذکر کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی تقریر کو موثر بنانے اور دین کی طرف لوگوں کے شوق اور رغبت کو بڑھانے کے لئے زیادت و افراط سے بچ کر محسّنات لفظیہ سے کام لے سکتا ہے۔ کیونکہ الفاظ کی عمدگی اور فصاحت کو بات کے مؤثر و کارگر بنانے میں بڑا دخل ہے۔

روزمرہ کی بات چیت اور کاروباری کی عام گفتگو میں غزالی سجع و قافیہ کی اجازت نہیں دیتے

"بلکہ اس کے برعکس مناسب یہ ہے کہ صرف سیدھے سادے الفاظ پر اکتفاء کیا جائے۔ کیونکہ کلام سے مقصود افہام و تفہیم ہے اور جب یہ سیدھے سادے الفاظ سے پورا ہو سکتا ہے تو پھر تکلف و تصنع کی ضرورت ہی کیا ہے۔

تصنع کا باعث اکثر خود نمائی اور دوسروں پر اپنی فصاحت و بلاغت کا سکہ جمانا ہوتا ہے

فحش گوئی

ساتواں نقصان فحش گوئی ہے اور اس کی تعریف یہ ہے کہ قبیح و ناپسندیدہ امور کو صریح و واضح عبارات میں ادا کیا جائے۔ یقیناً فحش گوئی کے درجات بھی باہم متفاوت اور مختلف ہیں کیونکہ بعض الفاظ کم اور بعض الفاظ زیادہ فحش ہوتے ہیں، نیز ہو سکتا ہے کہ بعض ممالک کی عادات و رسوم کو بھی اس کی و بیشی میں دخل ہو۔ غزالی نے جماع و مباشرت کو صریح و نازیبا الفاظ سے تعبیر کرنے یا اُن عیوب و امراض کے ذکر کرنے کو جن سے انسان عموماً حیا اور شرم محسوس کرتا ہے مثلاً برص، گنجاپن اور بواسیر وغیرہ کو بھی اسی نوع میں داخل کیا ہے اور تلقین کی ہے کہ ایسے امور

کے ذکر میں صرف رمز و کنایہ سے ہی کام لینا چاہیئے۔

فحش گوئی کا استعمال دوسروں کو ایذا پہنچانا اور یا فساق و فجار کی متواتر صحبت و ہم نشینی ہوتی ہے۔

فحش گوئی، گالی گلوچ اور بکواس کو ایک ہی چیز قرار دیتے ہوئے غزالی نے اس "بیان" کو بھی اسی میں شامل کیا ہے جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں مذمت کی ہے (البذاء والبیان شعبتان من شعب النفاق) اور اس بیان کی تفسیر و تشریح یہ کی ہے کہ انسان ان باتوں کو برملا کہے جن کے برملا کہنے کی اجازت نہیں یا کسی مسئلے کی وضاحت میں اتنا مبالغہ کرے کہ جس سے تکلف و تصنع کی بو آنے لگے، یا عوام کے سامنے دین کے گہرے مسائل اور اللہ کی صفات کو بیان کرے کیونکہ بعض اوقات کسی مسئلے کی انتہائی توضیح و تشریح کرنے کی وجہ سے بھی عوام کے دلوں میں شکوک و شبہات کروٹیں لینے لگتے ہیں۔

لعن و طعن

آٹھواں نقصان جمادات، حیوانات اور انسانوں پر لعنت بھیجنا ہے اور یہ سب کا سب مذموم ہے۔

اس باب میں غزالی کی نگاہ نہایت دقیق ہے۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم کسی زندہ یہودی کے متعلق بھی کہیں کہ اس پر خدا کی لعنت کیونکہ ممکن ہے آگے چل کر وہ اسلام لے آئے اور اللہ کا مقرب و برگزیدہ مومن ہو کر مرے۔ کسی مبتدع پر بھی لعنت بھیجنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ بدعات کا علم نہایت دقیق اور غامض ہے۔

"جس شخص کے متعلق ہمیں پورا یقین ہے کہ وہ کفر پر مرا ہے[1]، اس پر لعنت بھیجنے میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں بشرطیکہ اس سے کسی مسلمان کی دل شکنی نہ ہوتی ہو۔ یزید بن معاویہ پر لعنت بھیجنا بھی روا نہیں کیونکہ یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ اس نے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا یا شہید کرنے کا حکم دیا۔ جب تک پوری تحقیق نہ کر لی جائے اس وقت تک کسی مسلمان کو

---

[1] جیسے ابوجہل اور فرعون

کبائر میں سے کسی کبیرہ یا فسق اور کفر کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔"

غزالی کہتے ہیں:۔

"مومن کا کام لعنت بھیجنا نہیں۔ اس شخص کے علاوہ جس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے، دوسروں کے معاملے میں زبان کو ضبط و قابو میں رکھنا چاہئے اور ہمیشہ اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ لعنت مخصوص و معین افراد پر ہرگز نہ کی جائے۔"

ہنسی مذاق

نواں نقصان ہنسی مذاق ہے۔ غزالی کی رائے میں اس میں افراط یا اس پر مداومت مذموم ہے اور اگر اس میں آداب کا پاس و لحاظ رکھا جائے کہ اس سے کسی کی دل شکنی نہ ہوتی ہو اور باطل کے ساتھ زبان آلودہ نہ ہو اور انسان کا اپنا مرتبہ و وقار خطرے میں نہ پڑے تو ایسی ہنسی مذاق میں کوئی مضائقہ نہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔

تمسخر و استہزا

دسواں نقصان تمسخر و استہزا ہے اور اس کی تعریف غزالی کی رائے میں یہ ہے

"دوسروں کی اہانت و تحقیر کی جائے یا ایسے طریق پر ان کے عیوب اور نقائص بیان کئے جائیں جس سے لوگوں کو ہنسی آئے۔ ایسا کبھی تو دوسرے کے قول و فعل کی نقالی سے اور کبھی اشارہ وادر ایما سے ہوتا ہے۔"

غزالی نے بیان کیا ہے کہ تمسخر و استہزا کی حرمت و ممانعت اس شخص کے حق میں ہے جس کو اس سے دکھ اور تکلیف ہوتی ہو رہا وہ شخص کہ جس کے ساتھ اگر تمسخر کیا جائے تو وہ خوش ہو تو اس کے باب میں تمسخر کا حکم بعینہٖ ہنسی مذاق کا سا ہے کیونکہ حرمت کی علت دوسرے کا دکھ یا تحقیر اور تنقیص ہے۔

افشائے راز

گیارھواں نقصان افشائے راز ہے۔ یہ مذموم اس لئے ہے کہ اس سے دوسروں کو ایذا

پہنچنا اور احباب و معارف کی حق تلفی ہوتی ہے۔ غزالی کہتے ہیں:۔

"اس سے اگر دوسرے کو نقصان پہنچے تو حرام اور اگر نقصان نہ پہنچے تو دوں ہمتی و سفلگی ہے"

صحبت و ہم نشینی کے باب میں غزالی نے احباب کے منجملہ حقوق کے ایک حق یہ بھی بیان کیا ہے کہ:۔

"دوست کا جو راز اس کے پاس محفوظ ہے اس کا کسی سے ذکر نہ کرے اور اگر کوئی دریافت بھی کرے تو صاف مکر جائے کیونکہ ہر مقام میں سچ بولنا واجب اور ضروری نہیں، جس طرح اپنے عیوب و نقائص پر پردہ ڈالنا ضروری ہے چاہے جھوٹ ہی کا کیوں نہ ہو اسی طرح دوست کے راز کی حفاظت بھی ضروری ہے چاہے جھوٹ ہی سے ہو، کیونکہ دوست اور وہ ایک ہی چیز ہیں صرف جسم اور بدن کا فرق ہے"

جھوٹا وعدہ

بارھواں نقصان جھوٹا وعدہ ہے۔ غزالی نے بیان کیا ہے کہ اس نقصان کا شکار وہ شخص ہوتا ہے جو وعدہ کرتے وقت وعدہ خلافی کا ارادہ رکھتا ہے۔ یا بغیر کسی مانع یا عذر کے ایفائے عہد نہیں کرتا، رہا وہ شخص جو وعدہ کرتے وقت ایفائے عہد کا پورا پورا ارادہ رکھتا تھا لیکن کسی عذر اور مانع کی وجہ سے اس کو پورا نہیں کر سکا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

جھوٹا قول و قرار

تیرھواں نقصان قول و یمین میں جھوٹ ہے۔ غزالی کہتے ہیں۔

"جھوٹ فی حد ذاتہ حرام نہیں بلکہ حرام اس لئے ہے کہ اس سے دوسرے کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ اقل درجہ جھوٹ کا یہ ہے کہ مخبر کسی چیز کے متعلق خلافِ حقیقت و واقعہ اعتقاد رکھے سو اس صورت میں وہ جاہل ہوگا (اور اس سے دوسروں کو کبھی کبھار نقصان بھی پہنچے گا) چونکہ بعض اوقات غفلت و جہالت، فائدہ و منفعت کا موجب ہوتی ہے لہذا جس جھوٹ سے یہ غفلت و جہالت پیدا ہوگی وہ مباح و ماذون بلکہ بعض حالتوں میں واجب ہوگا"

وسائل ومقاصد کے باب میں ہم اُن مقامات و مواقع کو بالتفصیل بیان کر چکے ہیں جن میں غزالی نے جھوٹ کی رخصت واجازت دی ہے۔

غیبت

چودھواں نقصان غیبت ہے اور اس کی تعریف یہ ہے کہ

"تم اپنے دوست کا ذکر اس طرح پر کرو کہ اگر یہ ذکر اُس تک پہنچے تو اسے بُرا اور ناگوار گذرے۔ عام اس سے کہ تم اُس کے بدن یا نسب یا خلق یا فعل یا قول یا دین یا دنیا میں کوئی نقص نکالو بلکہ یہاں تک کہ اُس کے لباس، اُس کے گھر یا اُس کی سواری پر کوئی نکتہ چینی اور عیب گیری کرو۔"

غزالی کہتے ہیں غیبت کے لئے صراحت شرط نہیں بلکہ اشارہ ایماء، طنز، تعریض، کتابت اور حرکت وغیرہ تمام وہ امور جن سے مقصود سمجھ میں آسکتا ہے، غیبت کے لئے کافی ہیں۔

غیبت کے کئی اسباب ہیں ہم اُن میں سے صرف مندرجہ ذیل چار کو بیان کرتے ہیں:۔

(۱) احباب ورفقاء کی ہم نوائی، ہم آہنگی، اور اُن کی ہاں میں ہاں ملانا۔

(۲) اپنے گنبدِ فخر ومباہات کی تعمیر کے لئے دوسروں کی عزت کو خاک میں ملانا۔

(۳) خوش گپی اور دل لگی کا سامان بہم پہنچانا اور دوسروں کے عیوب ونقائص بیان کرکے بے کاری اور فرصت کے اوقات کو دھکا دینا۔

(۴) دوسروں کے عیوب بیان کرکے یہ ظاہر کرنا کہ میں ان سے بالکل بری اور پاک ہوں۔

غزالی، علمائے دین کے اس سلوک اور رویہ سے پوری طرح آگاہ اور باخبر تھے کہ کس طرح یہ گروہ دوسروں کے نام لے لے کر انہیں کوستا اور اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ ہم کوئی بہت بڑی دینی خدمت انجام دے رہے ہیں، حالانکہ کسی تنقید کا جائز اور پسندیدہ طریق یہ ہے کہ صرف عیوب ومنکرات کے ذکر پر اکتفاء کیا جائے اور اشخاص وذوات کی طرف اشارہ ہرگز نہ کیا جائے بعض اوقات یہ گروہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے کر بہت کچھ اجر وثواب

کھا سکتا ہے لیکن صرف اشخاص و ذوات کی صراحت کر کے سب کچھ اکارت اور ضائع کر دیتا ہے۔
غیبت کا علاج غزالی نے یہ تجویز کیا ہے کہ اُن احادیث و آثار کا مطالعہ کیا جائے جو اس مہلک مرض کی بدانجامی اور نافرجامی میں وارد ہوئی ہیں۔ بدگمانی کو قلب کی غیبت قرار دیتے ہوئے اس سے بھی منع کیا ہے۔ آخر میں اُن مقامات کو بیان کیا ہے جن میں غیبت جائز ہے۔ ہم ان تمام امور کو بھی وسائل و مقاصد کے باب میں بیان کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں۔
کہ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ مظالم سے اپنے آپ کو بکلی بری اور پاک کر لیا جائے۔

چغل خوری

پندرھواں نقصان چغل خوری ہے اور اس کی تعریف غزالی یہ کرتے ہیں۔
"اس بات کو ظاہر کرنا جس کا کشف و اظہار کردہ ہے۔ چاہے یہ اظہار اس شخص کو مکروہ و ناگوار گذرے جس کی چغلی کھائی گئی ہے یا اس کو ناگوار گذرے جس کے سامنے کھائی گئی ہے اور چاہے کسی تیسرے کو۔ پھر عام اس سے کہ یہ کشف و اظہار قول سے ہو یا کتابت اور رمز و کنایہ سے اور چاہے وہ بات جس کے بارے میں چغلی کھائی گئی ہے از قبیل اعمال ہو یا از قبیل افعال، اور خواہ یہ بات منقول عنہ میں عیب و نقص کی ہو یا خوبی و عمدگی کی۔"
غزالی نے صرف چغل خوری کی قباحت اور مذمت کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جس کے پاس چغلی کھائی ہے اُس کے لئے مندرجہ ذیل خاص قسم کے آداب بھی مقرر کر دیے ہیں۔
(۱) چغل خور کو کبھی سچا نہ سمجھے کیونکہ وہ فاسق ہے اور فاسق کی شہادت کسی صورت مقبول نہیں
(۲) اُس کے سامنے نمیمہ کاری کی مذمت کرے اور اُسے اس خلق بد سے باز رہنے کی نصیحت و تلقین کرے۔
(۳) نمّام کے بارے میں بغض فی اللہ سے کام لے کیونکہ وہ اللہ کے ہاں بھی مبغوض ہے
(۴) چغل خور نے جو کچھ کہا ہے اُس کی تحقیق کے لئے بحث و تجسس نہ کرے۔
(۵) اُس کی چغلی کا دوسرے سے ذکر نہ کرے ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس بات سے چغل خور

کو منع کیا ہے خود اس کا شکار ہو جائے۔

غزالی کہتے ہیں :-

"سعایۃ بھی نمیمہ (چغلخوری) ہی ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ جب چغلی کسی حاکم کے پاس کھائی جائے تو اسے نمیمہ نہیں سعایۃ کہتے ہیں"

اس کے بعد حضرت مصعبؓ بن زبیرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"ہماری رائے میں سعایۃ کی نسبت سعایۃ کا قبول کر لینا زیادہ بُرا ہے کیونکہ سعایۃ تو صرف اشارہ و دلالت اور شکایت کا نام ہے لیکن اس کا قبول کرنا اجازت کے مرادف ہے پس جو شخص کسی کی بُرائی کی اطلاع دیتا ہے وہ یقیناً اس کی نسبت کم بُرا ہے جو اسے قبول کرتا اور اس کی اجازت دیتا ہے۔ لہذا ساعی سے بچ کر رہنا چاہئے اس لئے کہ فرض کیجئے اگر وہ سچا بھی ہے تو بھی بے مروت ہے کیونکہ اس نے دوسرے کی عزت و آبرو کا پاس و لحاظ نہیں کیا"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ غزالی حضرت مصعبؓ کے گذشتہ قول و رائے سے متفق ہیں کیوں کہ انھوں نے اس قول پر نہ کوئی تنقید و تبصرہ کیا ہے نہ سلف کے کچھ ایسے اقوال نقل کئے ہیں جو اس رائے کی وقعت و اہمیت کو گھٹاتے ہوں۔ سعایۃ و نمیمۃ بالکل ایک، یا تقریباً ایک ہی چیز ہیں۔ گو غزالی نے کہیں اس امر کے متعلق تصریح نہیں کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں انسان کو ساعی کے مقابلے میں بھی بعینہٖ وہی رویہ اور وہی آداب اختیار کرنے چاہئیں جن کو نمّام کے مقابلے میں اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔

غزالی کی رائے میں نمیمہ کاری کا جو حصہ مباح اور جائز ہے اُسے ہم وسائل و مقاصد کے باب میں بیان کر چکے ہیں۔

دو رُخے کی باتیں

سولھواں نقصان دو رُخے کی باتیں ہیں اور ان سے مراد یہ ہے کہ انسان دو ایسے شخصوں سے

---

[1] ص ۲۵۸

ملے. جو باہم دشمن ہیں اور ہر ایک کے سامنے اسی کے مطلب کی بات کہے. غزالی کی رائے میں یہ نفاق ہے۔

▪ اگر کوئی شخص دو باہم دشمنوں سے ملتا ہے اور سچے دل سے ہر ایک کے ساتھ حسن روّیہ اور حسن سلوک سے پیش آتا ہے تو وہ منافق نہیں ہے. کیونکہ ایک شخص دو باہم دشمنوں سے دوستی کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دوستی بالکل ناکارہ اور بے ہودی ہوگی اور اس پر اخوت اور بھائی چارہ کا اطلاق نہیں ہو سکے گا کیونکہ صحیح اخوت و صداقت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان دوست کے دشمن کو دشمن سمجھے. ہاں اگر دونوں میں سے ہر ایک کے پاس جاکر لگائی بجھائی کرتا ہے تو ایسے شخص کو دو لسانین کہتے ہیں اور یہ خلق بد چغلخوری سے بھی کہیں برا ہے. کیونکہ چغلخور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے لیکن دو رنگا دو آدمیوں کے درمیان فتنہ پردازی اور مفسدہ اندازی کی خدمت انجام دیتا ہے. فرض کیجیے کہ وہ دونوں کے پاس لگائی بجھائی نہیں کرتا لیکن ہر ایک کے پاس جاکر اس کی دشمنی اور مخالفت کی باتوں کی تائید کرتا اور جب اس سے الگ ہوتا ہے تو اس کی مذمت کرتا ہے تو یہ بھی دو رنگا اور دو جیسا ہے. اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ اسے یا تو خاموش رہنا چاہیے اور یا پھر دونوں میں سے جو حق و صداقت پر ہے اس کی ہر حال میں تعریف کرنی چاہیے غلط بات کی زبان سے تصدیق کرنا یا تائیداً سر ہلانا ریا اور نفاق ہے. ایسے موقع پر مناسب یہ ہے کہ یا تو غلط کار کو برملا ٹوک دیا جائے یا اگر اس کی جرأت وہمت نہیں ہے تو پھر زبان سے چپ رہا جائے اور دل میں اسے برا سمجھا جائے[۱]۔

مدح و تعریف

سترھواں نقصان مدح و تعریف ہے. یہ بعض حالتوں میں منع اور بعض حالتوں میں جائز بلکہ مستحب ہے. غزالی نے مادح کے حق میں اس کے چار نقصان اور ممدوح کے حق میں دو نقصان

[۱] ج ۳ ص ۱۶۰

بیان کئے ہیں۔ مادح کے سلسلے میں چار نقصان یہ ہیں۔

(۱) یہ مدح و تعریف میں کبھی ایسا غلو کرے گا جو اُسے کذب تک پہنچائے گا۔

(۲) کبھی مادح ریار کا شکار ہو جائے گا کیونکہ کسی کی مدح کرنا حقیقت میں اُس کی محبت کا اظہار ہے اور جب اس اظہارِ محبت میں قلب و لسان متحد اور ہم آہنگ نہ ہوں گے تو یہ مرائی اور منافق کہلائے گا۔

(۳) کبھی ایسے امور سے ممدوح کو متصف اور منسوب کرے گا جن پر یہ (مادح) کسی طور مطّلع ہی نہیں ہو سکتا۔ غزالی کی رائے میں یہ نقصان اُن اوصاف و احوالِ مطلقہ کی وجہ سے مدح میں راہ پاتا ہے جن کو براہین و ادلّہ سے معلوم کر لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فلاں شخص متقی ہے۔ متورع ہے زاہد و عابد اور نیکوکار ہے۔

(۴) کبھی ممدوح، مادح کی مدح و ستائش سے مسرور و دل خوش ہو گا حالانکہ واقع میں وہ ظالم اور فاسق ہے تو اس صورت میں تعریف کسی حالت میں جائز ہی نہیں ہے۔

ممدوح کے حق میں مندرجہ ذیل دو نقصان ہیں۔

(۱) تعریف سننے کی وجہ سے اُس میں کبر و عجب کے جذبات ابھریں گے حالانکہ یہ دونوں باتیں مہلک اور تباہ کن ہیں۔

(۲) مدح و توصیف سن کر اُس کی قوت عمل میں ایک گونہ سستی اور فتور آ جائے گا اور وہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو رہے گا کہ اُس کے پاس عمل صالح کی پونجی بہت کافی ہے۔

مدح و تعریف کی تباہ کاریوں اور خانہ ویرانیوں کو بیان کرنے کے بعد غزالی نے ممدوح کو اس امر کی نصیحت اور تلقین کی ہے کہ وہ کبر و عجب اور سستی اور فتور سے مجتنب رہے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ وہ خاتمے کی خطرناکی، ریار کی نظر بندی اور اعمال و افعال کی نقصان دہی میں غور و فکر کرے۔ کیونکہ وہ اپنی ذات میں اُن کوتاہیوں اور خامیوں سے بخوبی باخبر ہے۔ جن پر مادح کسی صورت مطّلع اور آگاہ نہیں ہو سکتا اور فرض کیجیے کہ مطلع ہو بھی جاتا تو اس کی

مدح و توصیف سے محترز رہتا۔ آخر میں غزالی نے ممدوح کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مادح کو ذلیل و رسوا کرکے مدح کے بارے میں کراہت و ناپسندی کا اظہار کرے۔

غفلت

اٹھارھواں نقصان اثنائے کلام میں نہایت مخفی قسم کی غلطیوں سے غفلت اور بے نیازی ہے خصوصاً جبکہ ان کا تعلق اللہ کی ذات و صفات اور دینی امور سے ہو۔ اس باب میں غزالی نے جو مثالیں پیش کی ہیں اُن میں بڑی مثال یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے ملازم یا ملازمہ کو میرے بندے یا میری بندی کہہ کر پکارے کیونکہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں اور عورتیں سب اللہ کی بندیاں ہیں بلکہ اس کے برعکس انھیں جب پکاریں تو میرے ملازم یا میری ملازمہ کہہ کر پکاریں۔

اللہ کی صفات کے بارے میں سوال

انیسواں نقصان اللہ کی صفات اس کے کلام اور اُس کے حروف کی قدامت و حدوث کے متعلق عوام کا سوال ہے۔ غزالی کہتے ہیں۔

"ایک عام آدمی کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ علمی امور میں لب کشائی کرے بالخصوص جبکہ ان امور کا تعلق اللہ کی ذات و صفات سے ہو۔ عوام کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کتاب و سنّت کی تعلیمات پر محکم ایمان رکھیں اور عبادات میں مشغول رہیں۔ عبادات کے علاوہ دوسرے امور میں ان کا سوال و استفسار حقیقت میں اپنی راہ میں کانٹے بونے اور اپنے آپ کو اللہ کے قہر و غضب کا شکار بنانے کے مرادف ہے اور بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک چرواہا و گلہ بان یا کوئی طبیلہ والا امراء و سلاطین کے اسرار و رموز کی چھان بین کرنے کی لاحاصل و ناکام کوشش کرے۔"

گانا

بیسواں نقصان گانا ہے۔ اور اس کی تفصیل آپ فنونِ لطیفہ کے باب میں ملاحظہ فرمائیں گے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزالی نے زبان کے نقصانات بیان کرنے میں کمال مبالغہ اور

غلو سے کام لیا ہے لیکن ذرا غور کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں بھی ایک گونہ تدبیر و احتیاط ملحوظ ہے۔ اور جو شخص مکارم اخلاق کے زیور سے اپنے آپ کو مزین و آراستہ کرنا چاہتا ہے اُس کے لئے یہ ساری باتیں ہر حال میں لابدی اور ناگزیر ہیں۔

ساتویں فصل

ریاء

ریاء کے بارے میں غزالی نے جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھ کر یقیناً آپ کو اُن پر رحم اور ترس آئے گا کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ و عصر کے جہّال کی کثرت سے نہایت پریشان اور سخت نالاں ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہم اُن کی آراء کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ وہ خود ریاء اور نمائش سے کس قدر متنفر اور نمائش پسندوں اور ظاہر پرستوں کے کس قدر جانی دشمن ہیں۔

غزالی کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں ہے کہ کوئی مسلمان کم خوری اور راتوں کی بیداری کو ظاہر کرنے کے لئے اپنے بدن کو لاغر اور چہرے کو زرد رکھے۔ فرماتے ہیں۔

"آواز کا پست کرنا، آنکھوں کا دھنسانا، ہونٹوں کا افسردہ اور خشک رکھنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ شخص ہمیشہ روزے سے رہتا ہے اور شریعت کی پابندی اور وقار و تمکنت نے جہاں اس کی آواز کو پست اور سنجیدہ کر دیا ہے وہاں بھوک کی شدت نے اس کے بدن کو گھلا دیا ہے حقیقت میں بہت بڑا فریب اور کھلی نمائش ہے۔"

بالوں کا پراگندہ رکھنا، مونچھوں کا مونڈنا، چلتے وقت نگاہ کا نیچا رکھنا، حرکت میں متانت اور سنجیدگی برتنا، پیشانی پر سجدہ کا نشان ڈالنا، گاڑھا پہننا، پائجامے کو تقریباً پنڈلی تک اونچا رکھنا، آستینوں کو چھوٹا کرنا، لباس کی صفائی اور ستھرائی کا خیال نہ رکھنا، لمبے لمبے رکوع اور سجدے کرنا یہ سب

باتیں بدترین قسم کی ریاکاری اور انتہائی بھونڈی قسم کی نمائش کی غماز ہیں۔

غزالی مجلسی اور اجتماعی امور سے بھی بیگانہ اور بے خبر نہ تھے چنانچہ ریا، کے ذکر میں انھوں نے ان لوگوں کی بھی عیوب قلعی کھولی ہے جو اپنے نام نہاد تقویٰ اور زہد و ورع کا ڈھنڈورا پیٹتے اور مشکوک و مشتبہ رزق کے کمانے سے صرف اس لئے بچتے ہیں تاکہ ان کی دیانت و امانت کی تشہیر ہو اور رقفار اوقات یا وصایا وغیرہ کا عہدہ ان کے سپرد کیا جائے۔ یا یتیموں کے مال کا انھیں نگراں مقرر کیا جائے تاکہ وہ جی کھول کر اس پر ہاتھ صاف کرسکیں یا صدقات و زکوٰۃ کی تقسیم ان کے حوالے کی جائے تاکہ وہ اس میں اپنی من مانی کارروائی کرسکیں یا ان کی نیک شہرت سے متاثر ہو کر لوگ ان کے پاس اپنا مال و دولت امانت رکھیں اور یہ موقع پاکر مکر جائیں یا انھیں امیر حج مقرر کیا جائے اور بادشاہ کی طرف سے حج کے راستے میں خرچ کرنے کے لئے جو روپے انھیں ملیں ان میں سے کچھ یا پورے کے پورے ہضم کر جائیں۔

واقعی اس باب میں غزالی کی رائے نہایت صائب اور دور رس ہے۔ انھوں نے جہاں مجلسی اور اجتماعی امور کی ذلتوں اور قباحتوں کو بیان کردیا ہے وہاں علماء و زہاد کے عیوب و نقائص اور ابلہ فریبیوں کو بھی چن چن کر ہماری نگاہوں کے سامنے لایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کے زمانے میں لوگوں نے اپنے شیطانی اغراض و مقاصد فسق و فجور اور دوسروں کا مال لوٹنے کے لئے اللہ کے پاک دین کو ایک قوی ذریعہ و وسیلہ بنالیا تھا

ہم یہاں اس بات کا اعادہ و تکرار پھر ضروری سمجھتے ہیں کہ غزالی کسی رذیلت و قباحت سے اس وقت تک نہیں ہٹتے جب تک اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔ لہٰذا ریاء کے باب میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ صرف ان کے قدیم کتب کے مطالعہ کا حاصل و نتیجہ ہی نہیں۔ بلکہ ان کے اپنے زمانے کی سچی تصویر ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے تو احیاء العلوم سے اس زمانے کے علماء و زہاد کا ایک عمدہ مرقع تیار کرلے سکتا ہے۔ میں نے علماء و زہاد کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ غزالی نے اپنے عہد و دور کے امراء و حکام سے زیادہ تعرض نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ملوک و سلاطین ان کی زبان کی تیغ بے نیام سے صاف بچ گئے ہیں۔

نواں باب

علوم و فنون اور تربیت

اس باب میں ہم علم و عمل، اور علمِ دنیا و علمِ آخرت کے مابین فرق کے بارے میں غزالی کے آراء کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد بتائیں گے کہ علم فقہ اور علم توحید کا مفہوم ان کے ہاں کیا ہے؟ اور آخر میں نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ فنونِ لطیفہ کے سلسلے میں ان کا نظریہ واضح کرتے ہوئے جہاں تربیتِ اطفال اور معلمین و متعلمین کے لئے ان کے وضع کردہ آداب و قواعد کو بیان کریں گے وہاں اس امر پر بھی مطلع کر دیں گے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کو کس بری طرح انہوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

پہلی فصل

علوم

غزالی نے اپنی تالیفات میں علم و عمل اور ان دونوں میں سے اشرف و افضل کے متعلق کسی جگہ سیر حاصل بحث کی ہے۔

ہیں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اُن کی کوئی مستقل رائے نہ تھی۔ اگر ایک جگہ وہ علم کو عمل پر مقدم رکھتے ہیں تو دوسری جگہ عمل کو علم پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس شک و تردد کا باعث ایک تو اُن کے متصوفانہ رجحانات ہیں اور دوسرا اپنے اہلِ زمانہ و اہلِ عصر کی ہم آہنگی اور مدارات ہے۔ کہیں جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم و عمل میں سے راجح و مرجوح پر سے آخری پردہ بھی ہٹا دینا چاہتے ہیں لیکن پھر ٹھٹھک سے جاتے ہیں۔ اگر وہ تھوڑی سی جرائت و ہمت اور وسعتِ نظر سے کام لیتے تو ہمیں ضرور بتاتے کہ علم نافع تنہا عبادات کے علم و معرفت اور تصوف و توحید کی موشگافیوں ہی میں منحصر نہیں بلکہ طبائعِ اشیا کا معلوم کرنا اور کائنات کے سربستہ اسرار کا سراغ لگانا بھی علمِ نافع کے تحت داخل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام مخلوق کو ہمارے تابع و مسخر بنایا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی "فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر"[51] کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جس علم کو اس حدیث میں عمل پر ترجیح دی گئی ہے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں یا تو کیفیتِ عمل کا علم ہے (یعنی علم فقہ اور علم عبادات) یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا علم ہے۔ پہلا علم دو وجہ سے مراد و مقصود نہیں ہو سکتا۔ اول اس وجہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کو عابد پر فوقیت دی ہے اور عابد وہی ہو سکتا ہے جس کو عبادات کا علم ہو ورنہ وہ نکما اور فاسق ہے۔ دوم علم بالعمل عمل سے اشرف و افضل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس صورت میں علم مقصود لذاتہ نہیں بلکہ عمل کی خاطر مقصود ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز مقصود لغیرہ ہو وہ مقصود لذاتہ سے ارفع و اعلیٰ کسی صورت نہیں ہو سکتی۔"

اس طویل مقدمے کے بعد ہمیں بجا طور پر توقع تھی کہ وہ علوم کی فضیلت و فوقیت سے بحث کریں گے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا بلکہ اُن کی تقسیم شروع کر دی ہے اور کہا علوم کی

---

[51] عالم کو عابد پر ایسی ترجیح و مزیت ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو باقی راتوں کے چاند پر۔

دو قسمیں ہیں۔ عملی اور نظری۔ عملی کے متعلق وہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ عمل سے کمتر ہیں رہے نظری سو وہ بھی سب کے سب بیکار ہیں۔ بجز اُن علوم کے جن سے اللہ اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں کے سمجھنے میں مدد ملے یا آسمانوں اور زمینوں کے اسرار اور انسانی یا حیوانی نفوس کے عجائب تک اس معنی میں رسائی حاصل کرنے میں سہولت و آسانی ہو کہ یہ سب کی سب چیزیں اللہ کی قدرت و طاقت کی بدولت باہم مرتبط و پیوستہ ہیں نہ اس معنی میں کہ یہ چیزیں فی حد ذاتہ خود کوئی بڑا درجہ اور بڑی قیمت رکھتی ہیں۔

ایک مختصر مناقشہ

غزالی کے گذشتہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عابد و زاہد کا کام فقط اتنا ہے کہ وہ عبادت و زہد، اللہ کی ذات میں نظر و فکر، ملائکہ، کتب سماویہ، انبیاء و رسل اور زمین و آسمان کے علم و معرفت میں اپنے آپ کو معروف و مشغول رکھے۔

ہم غزالی سے یہاں ایک بات دریافت کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ جب کتب سماویہ اور شرائع الٰہیہ کا سمجھنا روح تشریع اور اصولِ قوانین کے سمجھنے پر موقوف ہو، یا انبیاء و رسل کی معرفت تاریخ قدیم و جدید کے مطالعہ کی اس لئے متقاضی ہو کہ ہر زمانہ و ہر عصر میں انبیاء و رسل اُس زمانے کے حوائج اور تقاضوں کے مطابق شریعت لائے ہیں یا وہ سیاست جس کو کتب سماویہ میں بیان کیا گیا ہے اُس کا سمجھنا علم الاجتماع کے پڑھنے پر موقوف ہو تو غزالی فرمائیں کہ ان موقوف علیہ علوم کے باب میں ان کی کیا رائے اور کیا نظریہ ہے؟ کیا ان کی تحصیل ضروری ہے یا نہیں؟

علومِ عقلیہ و نقلیہ کی ضرورت و اہمیت سے غزالی انکار نہیں کرتے لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے ان میں سے بعض کو علوم نظریہ کے لئے بمنزلہ ذریعہ و وسیلہ قرار دیا ہے اور بعض کو علوم عملیہ میں شمار کیا ہے۔ جو عمل کے لئے بمنزلہ آلہ و واسطہ ہیں اور ظاہر ہے کہ ذریعہ و واسطہ غرض اور مقصد سے کبھی اشرف اور بلند تر نہیں ہو سکتا۔ آخر لے دے کے صرف وہی علم عمل پر

مقدم رہا، جو اللہ کی ذات، ملائکہ، انبیاء و رسل اور یوم آخرت کے باب میں مفید اور سود مند ہوا اور واقعی یہ علم فی حد نفسہ نہایت مہتم بالشان اور ارفع و اعلیٰ ہے لیکن اس کی وقعت و اہمیت کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ دوسرے علوم بالکل بے وقعت اور بے قیمت ہیں۔

میں یہاں ایک اور سوال بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایئے کہ جس طبیب نے اپنی ساری عمر اس بات کے دریافت کرنے میں کھپا دی کہ اُن جراثیم کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے جو سل دموی جیسے خطرناک اور مہلک مرض کا باعث ہوتے اور ہر برس لاکھوں انسانوں کو موت و فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ آیا عقل و شرع کی نگاہ میں یہ طبیب افضل و برتر ہے یا وہ شخص جس نے ایک الگ زاویے میں بیٹھ کر ہمیشہ اپنے آپ کو الٰہیات کے دقیق و غامض مسائل کے سمجھنے میں غرق اور گم رکھا۔ کیا قیامت کے دن محی الدین بن عربی مقدم و افضل قرار دیئے جائیں گے یا وہ طبیب جو ساری زندگی سل اور سرطان جیسے موذی اور مہلک امراض کے خلاف برابر نبرد آزما رہا۔

یقین کی راہ شک کے خارزار سے ہو کر نکلتی ہے

علم کی مناسبت سے ہم غزالی کا وہ قول نقل کرتے ہیں جس پر انھوں نے اپنی کتاب میزان کو ختم کیا ہے۔

"میری گذشتہ تحریر سے تمہارے آبائی اور موروثی عقائد میں اگر کوئی خلل اور نقص واقع ہو جائے جو حق و صداقت کی تلاش کے لئے تمہارے پائے طلب میں قوت و ہمت پیدا کر دے تو یاد رکھو یہ بھی بڑے فائدے کی بات ہے کیونکہ حق الیقین کی راہ شک ہی کے خارزار سے ہو کر نکلتی ہے۔ جب تک کسی کے دل میں شک و شبہ کا کانٹا نہیں چبھے گا یقین کی منزل تک اُس کی رسائی اور باریابی مشکل ہے اور ظاہر ہے کہ جو لیلائے مقصود سے ہمکنار نہیں ہو سکا اُس کی محرومی و نامرادی اور ضلالت و گمراہی قابل صد ہزار لعنت اور لائق صد ہزار نفرین ہے۔"

افسوس ہے کہ غزالی نے یہ نہیں بتایا کہ اُس شخص کا کیا حشر اور کیا انجام ہوگا جو شک ہی
کی دلدل میں پھنس کر رہ گیا اور ہزار ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی یقین کی منزل تک پہنچ نہ سکا
میں سمجھتا ہوں اس سوال کا جواب نہایت واضح اور سہل تھا لیکن غزالی کے زمانے کی
تنگ نظری اور تنگ حوصلگی نے غالباً اس باب میں انھیں لب کشائی کی اجازت و مہلت
نہیں دی جب انسان کو اس امر کا حق و اختیار حاصل ہے کہ کسی قدیمی اور موروثی عقیدے
کو صرف اس بنا پر قبول نہ کرے کہ اُس کی صحت و اصابت پر تمام لوگوں کے اجماع و اتفاق
کی چھاپیں لگی ہوئی ہیں (کہ اس کے باوجود اُس میں غلطی و بطلان کا احتمال موجود ہے) تو وہ
اللہ کے ہاں یقیناً اس بات کے لئے مسئول و جواب دہ نہیں ہوگا کہ وہ کسی معین و یقینی نتیجے تک کیوں
نہیں پہنچا بلکہ اس کے برعکس اگر اُس سے پوچھا جائے گا تو صرف اُس اعتقاد اور نظریے کے متعلق
جس تک دلائل کے ہاتھ نے اُس کی قیادت اور رہنمائی کی۔

ہم یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ غزالی نے اپنی تصنیفات
میں کئی موقعوں پر معلم و مربی کو اس امر کی نصیحت و تلقین کی ہے کہ وہ عوام و ضعفائے طریق کے
سامنے صرف مانوس اور متداول و مالوف عقائد ہی کو بیان کرے اور اُن اُمور کے بیان کرنے
سے قطعاً اجتناب و احتراز کرے جن کی وجہ سے عوام کے دلوں میں شکوک و شبہات کروٹیں
لینے لگیں اس کا معنی یہ ہے کہ غزالی کی رائے کے مطابق اگرچہ یقین کی راہ شک ہی کے دشتِ
خارزار سے ہو کر نکلتی ہے لیکن شک کے برتنے میں بھی ایک خاص حد اور ایک خاص مقدار کا خیال
رکھنا ضروری ہے۔ غزالی کا یہ وضع کردہ لائحہ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ہیئت اجتماعیہ
کی وحدت و اتحاد پر کس طرح جان و دل سے فدا اور ان تمام اُمور سے کس قدر نفور و گریزاں
تھے جو وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ علماء کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بعض مسائل میں شک کریں جتنا
بھی چاہے باہم مباحثہ و اختلاف کریں لیکن خدارا عوام کو اپنے اس شک و اختلاف سے دور رکھیں
ہم یہاں سے اس بات کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ غزالی بعض سوالوں کا جواب دینا حرام کیوں

قرار دیتے ہیں۔ آگے چل کر جہاں ہم جدید فلاسفہ اور غزالی کے مابین موازنہ کریں گے وہاں اس مسئلے پر بھی دوبارہ سیر حاصل بحث کریں گے۔

علم فقہ

تصوف کی دل ربائیوں سے غزالی کی نگاہ اس قدر خیرہ ہے کہ وہ فقہ کو بھی علوم دنیا میں شمار کرتے اور فقہا کو علمائے دنیا کے نام سے پکارتے ہیں اور پھر آپ جانتے ہی ہیں کہ ان کی نگاہ میں دنیا کا معنی اور مفہوم کس قدر بھیانک اور گھناؤنا ہے۔

کیا فقہ اُن قوانین کے مجموعے کا نام نہیں ہے جس کے مطابق لوگوں کے مابین دنیوی امور میں فصل خصومات اور رفع نزاع کیا جاتا ہے؟ یقیناً ایسا ہی ہے۔ تو پھر بتائیے فقہا کی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ہے؟ کیا اللہ نے آدم کے ڈھانچے کو مٹی سے تیار نہیں کیا؟ کیا اُس کی نسل اور ذریت کو اُس منی کے قطرے سے پیدا نہیں کیا جو باپ کی پشت سے اُتر کر ماں کے رحم میں آتا اور انسانی شکل و صورت اختیار کرتا ہے اور پھر انسان ماں کے رحم سے مکمل ہو کر نکلتا اور دنیا میں آنکھ کھولتا ہے اور کچھ عرصہ یہاں جی کر قبر کی طرف سدھارتا اور بہشت یا دوزخ کیلئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے تو بتائیے جب انسان کا آغاز وہ اور انجام یہ ہے اور دنیا اُس کے لئے منزل نہیں راہِ منزل کا حکم رکھتی ہے تو پھر اُس علم فقہ کی کیا وقعت و حقیقت ہونی چاہیئے جس کی ساری کائنات اور جس کا سارا مایۂ خمیر صرف دنیا ہی کی آلائشیں اور مکروہ و ناپسندیدہ زیبائشیں ہیں وہ فقہا کس عزت اور کس توقیر کے لائق ہیں جن کی عزت و توقیر تو بڑی بات ہے اُن کا نام اور وجود تک نہ ہوتا اگر لوگ باہم عدل و انصاف صلح و آشتی اور حق دہی و حق ستانی کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھتے۔

سُنا آپ نے؟ یہ ہے غزالی کی منطق اور یہ ہے اُن کا استدلال۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مشرق و اہل مشرق کو فقہ سے نجات دی اور اُس بدیسی شریعت کی زحمتوں اور برکتوں سے نوازا جس کی تحمید و تقدیس کے لئے آفتاب کے ہر طلوع اور

ہر غروب کے وقت کروڑوں ہاتھ اُٹھتے اور کروڑوں پیشانیاں خاک نیاز پر سجدہ ریز ہوتی ہیں
غزالی کی نگاہ میں فقہ اس لئے حقیر اور ہیچ ہے کہ اس کا تعلق اُن بدبخت انسانوں کی سیاسی
نگرانی سے ہے جنھوں نے اپنی فتنہ پردازیوں اور شرانگیزیوں کی وجہ سے ہمیں فقہ اور فقہا کا
محتاج بنا دیا ہے ورنہ ہمیں کبھی کسی قاضی اور فقیہ کی ضرورت و حاجت ہی لاحق نہ ہوتی۔

اے مرشد و آقا! آپ نے درست کہا بالکل درست۔ لیکن ہمیں فقط اتنی بات کہنے کی
اجازت دیجیئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی فقیہ تھے۔ آپ کی شریعت بھی فقہ ہی تھی۔ کیا فقہ
فصلِ خصومات و رفعِ نزاعات ہی کے قواعد کا دوسرا نام نہیں ہے؟

کیا دنیا آپ کی نگاہ میں اس قدر گھٹیا اور ہیچ ہے کہ اس کی وجہ سے آپ نے فقہ و تشریع
کی اہمیت کو بھی خاک میں ملا دیا۔

اے صوفیہ کے سادہ گروہ! دنیا کو دنیا والوں ہی کے لئے رہنے دو مسلمانوں کو دنیا میں
کوئی نام اور کوئی عزت و مقام حاصل کر لینے دو۔ کیا خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا اسی لئے
نہ بھیجا تھا کہ وہ مومنین کو ایک نمونہ اور ایک مثال بنا کر انھیں کرۂ ارضی کی حکومت و تسلط
کے تختِ شاہی پر بٹھائیں اور وراثتِ ارضی کا تاجِ عزت اُن کے سر پر رکھیں۔

علمِ توحید

غزالی کی رائے میں توحید پوری کی پوری علمائے مکاشفہ کے لئے وقف ہے۔

آخر علمِ مکاشفہ ہے کیا؟

ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے لیکن اتنا سنا ہے کہ جو اس علم سے بے بہرہ ہوگا اُس کا انجام
اور خاتمہ اچھا اور نیک کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں اس علم کا ادنیٰ اور کمتر درجہ یہ ہے کہ انسان
کشف اور اہل کشف پر ایمان لا کر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔

اس علم کی غایت و مقصد کیا ہے؟

غایت و مقصد یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور اُس کی مکمل اور لازوال صفات کا صحیح اور حقیقی

علم حاصل ہو جائے۔

معلوم نہیں اللہ کی ذات وصفات میں بحث کی عجیب غریب خواہش علماے دین میں پیدا کیوں ہوئی، آخر ان کے دل ایسے اندھے کیوں ہو گئے۔ ایسے نازک اور دقیق مباحث میں انھوں نے اپنے آپ کو بے وجہ اور بے ضرورت اُلجھایا کیوں؟ کیا ایک مومن ومسلم کا فرض اور وظیفہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ ایسے مسائل سے کامل بُعد اور دوری اختیار کرے

بخدا اس سے بڑھ کر جہالت وکوری اور کیا ہو سکتی ہے کہ غزالی اللہ کی ذات وصفات کے صحیح علم ومعرفت کی طمع وخواہش رکھتے ہیں اور اسی بنا پر اللہ کی صفات، اس کے کلام، اس کے افعال اور قیامت کے روز اس کی رویت ونظارہ کے بارے میں اشاعرہ اور معتزلہ سے اُلجھتے ہیں، حالانکہ اُن لوگوں کے علاوہ جو دلوں کے اندھے ہیں اور کون ایسے مسائل سے تعرض کی جرأت وجسارت کر سکتا ہے۔/

معلوم ہوتا ہے کہ غزالی اور اس وضع کے دوسرے حضرات کو زندگی میں حق وباطل اور ہدایت وضلالت کا معرکہ دیکھنے کا کبھی موقع میسر نہیں آیا۔ وہ نہیں جانتے کہ مختلف عقول ایک دوسرے کے خلاف کیا کیا جارحانہ کارروائیاں کرتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اللہ کی ذات وصفات سے بحث کرنا نہایت حماقت اور خام عقلی کی بات ہے۔ مومن کے مناسب صرف یہ ہے کہ وہ اس کائنات وموجودات میں غور وتامل کرے جن سے ہر طرف سے گھرا ہوا ہے اور اپنے اوپر اس بحث ونظر کا دروازہ کھولے کہ اللہ نے روئے زمین کی تمام اشیاء کو انسان کے لئے مسخر وتابع فرمان جو بنایا ہے تو اس کا معنی ومفہوم کیا ہے؟ ایک دانشمند کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ قریب اور پاس کی چیزوں سے مستفید ونفع اندوز ہونے کی بجائے اوہام وظنون کے ان لق ودق صحراؤں میں گم ہو جائے جن کا جہل وحماقت کی وجہ سے وہ علم توحید نام رکھتا ہے۔

مجھے کسی بات پر اتنا افسوس نہیں جتنا اس امر پر کہ تمام اسلامی خیالات وافکار کی جولانیاں "نبوت، نبی، وحی، شیطان اور ملک وغیرہ کے معانی دریافت کرنے کے لئے وقف ہو گئیں اور

اگر کہیں بہت زور دکھایا تو ان بے کار اور بے سود بحثوں میں پڑ گئے کہ شیطان کی انسان دشمنی کی کیفیت کیا ہے؟ فرشتے انبیاء کے پاس کن کن شکلوں میں آیا کرتے تھے؟ وحی پہنچنے کی صورت کیا تھی؟ آسمانوں اور زمینوں کے انتظامات فرشتے کس طرح انجام دیتے ہیں؟ قلب کیا چیز ہے؟ شیاطین و ملائکہ کی باہم جنگ دپیکار کی کیا صورت ہے؟ شیطان اور فرشتے کی چھوت میں کیا فرق ہے؟ یوم آخرت بہشت، دوزخ، عذاب قبر، پل صراط، میزان وغیرہ تعبیروں سے مقصود کیا ہے؟ اللہ کی رویت و ملاقات اس سے قرب یا اس کے جوار و ہمسائگی میں ہونے سے مراد کیا ہے؟ ملاء اعلیٰ کی معیت میں سعادت حاصل کرنے کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ اہل جنت کے باہم اس تفاوت درجات کا کیا مطلب ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو قیامت کے روز اسی طرح دیکھیں گے جس طرح چمکتے ہوئے تارے آسمان میں دکھائی دیتے ہیں۔

یہ تمام امور حقیقت میں رموز و اشارات تھے جنھیں مسلمان حقائق سمجھے اور لگے ان کی تاویل و تفسیر کے جھمیلوں میں پڑنے۔

قدیم کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور فقہاء و علماء دنیا کی نسبت آخرت کے نقشے کے زیادہ عالم و ماہر تھے، گو وہ دنیا کے دریاؤں اور نہروں کے بارے میں واقفیت نہیں رکھتے لیکن جنت کی نہروں کا طول و عرض انھیں خوب معلوم ہے۔ قوموں کے زوال و انحطاط کے وجوہ و اسباب کی انھیں خبر نہ ہی لیکن جہنم کی دروازوں کی تعداد اور ان کی مختلف سمتوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اس دنیا کی قوت و شوکت کے معنی سے وہ جاہل و ناآشنا ہی لیکن آخرت کی نعمتوں اور وہاں کی عیش و راحت پر بڑی غائر نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حشر و نشر اور قیامت کا نقشہ و جغرافیہ پڑھنا چاہے تو اسے سینکڑوں کتابیں مل جائیں گی لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا مطالعہ کرنا چاہے کہ اس خلافت اسلامیہ سے کیا مراد ہے جس کی وجہ سے دنیا میں سینکڑوں جنگیں اور ہزاروں فتنے بپا ہوئے تو یاد رکھیے اسے ایک کتاب بھی میسر نہیں آسکتی۔

غزالی بھی انھیں بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس غفلت و جہالت کو باقی و پائدار

رکھنے میں بڑی امداد دی اور خلوت وعزلت کی کیفیت و بیان میں بڑی لمبی چوڑی کتابیں مرتب کیں لیکن جب جناب نے اجتماعی امور کا نقد و جائزہ لینا چاہا تو التبرالمسبوک فی نصیحۃ الملوک لکھی جو بھدّے پن اور بھونڈے پن میں اپنی مثال آپ ہے۔

اب سنئے ہم علماء کو کس امر کی طرف دعوت دیتے ہیں؟

ہم انھیں دعوت دیتے ہیں قرآن حکیم کی طرف جس کے ہر ہر لفظ میں ملک و سلطنت قائم کرنے کی تلقین ہے۔ جس میں قدم قدم پر اس امر کی صراحت ہے کہ دنیا میں تسلط و غلبہ صرف اللہ، اُس کے رسول اور مومنین کے لئے مخصوص ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ کیا اخلاق اسی سے عبارت نہیں ہے کہ ذلت و قلت کے خلاف نبرد آزما دعف آرا ہو جایا جائے عام اس سے کہ یہ ذلت افراد میں ہو یا جماعتوں اور قوموں میں۔

اس کے بعد ہم ہر مسلمان کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت کمالِ احتیاط ملحوظ رکھے اس لئے کہ یہ لوگ سیاسی و اجتماعی امور سے بالکل بے گانہ تھے اور اگر ہماری بات کا یقین نہ آئے تو بتائیے سیاسیات اور اجتماعیات میں ان کا جمع کردہ مایۂ ناز لٹریچر کہاں ہے؟ جہانداری اور جہانبانی کی زندگی کی پاتال تک کی خبر لانے والی ان کی نگاہ کہاں ہے، نہیں نہیں صرف اتنا ہی بتا دیجیے کہ نفسِ انسانی کے بارے میں ان کی وہ خبرت و بصیرت کہاں ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ طالبین جنت اور اُن عباد و زہاد کے علاوہ کسی کو میسر نہیں آسکتی جنھوں نے فقر و افلاس کو اپنا شعار بنا لیا اور دنیا سے الگ ہو کر ایک گوشۂ قناعت میں مقیم ہو گئے۔

دوسری فصل

فنون

غزالی اس امر کو جائز اور مباح قرار دیتے ہیں کہ کسی انسان کو اس کے حسن وجمال کی وجہ سے عزیز اور محبوب رکھا جائے بالفاظِ دیگر غزالی کی طرف سے یہ اس فنی احساس وشعور کا اعتراف ہے جسے ایک ادیب ایک فن کار اور ایک فیلسوف اس عالم کے حسن وجمال کی گہرائیوں سے متاثر ہو کر اپنے اندر موجزن پاتا ہے۔

اسی کتاب میں جہاں غزالی نے حقوقِ اخوت کو بیان کیا ہے وہاں آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے پھلوں پھولوں کلیوں، سرخی مائل سیبوں، آبِ رواں اور سرسبز وشاداب خطوں اور باغوں پر نگاہ کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے تو گویا اس کا معنی یہ ہے کہ جب ان چیزوں کی طرف بلا کسی بری نیت وارادہ کے نگاہ کرنا ممکن ہے تو یہ بھی ممکن ہونا چاہئے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو بغیر کسی خبیث نیت وغرض کے عزیز اور محبوب رکھے۔

ہمارے اس گذشتہ نظریے کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ غزالی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ روح کو انسان پر ایک گونہ تسلط اور قابو حاصل ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ اس روح کے کچھ حقوق بھی ہیں سو جب حسن وجمال کا وجود انسانوں میں بکثرت پایا جاتا ہے اور ایک انسان کو صرف اس کی خوبروئی اور خوبصورتی کی وجہ سے محبوب رکھا جا سکتا ہے تو گویا روح کو اس امر کا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر خوبصورت چیز سے متمتع اور لطف اندوز ہو بشرطیکہ انسان اس باب میں ہر ممکن عفت اور پاکیزگی سے کام لے۔ میری رائے میں یہ بات غزالی کی طرف سے اس امر کے اعتراف کے مرادف ہے کہ ارواح کے تمتع اور لطف اندوزی کے لئے فنونِ جمیلہ کا وجود بھی ایسا ہی ضروری ہے جس طرح انسانی جسم وشکم کی تسکین کے لئے دولت وثروت کی کثرت

فراوانی لابدی اور ضروری ہے۔

ہم یہاں اس امر کی یاددہانی ضروری سمجھتے ہیں کہ علم تشریح کے باب میں ہم غزالی پر یہ اعتراض وارد کر چکے ہیں کہ جب وہ بھی علماء کے ایک گروہ کی پیروی میں نفس کے فنا ہو جانے کے قائل ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ علم تشریح کی تحصیل بھی حرام اور ممنوع ہے ظاہر ہے کہ اس سوال کا غزالی کے پاس کوئی جواب نہیں۔

اب ہم یہاں اُن سے ایک دوسرا سوال دریافت کرتے ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ ایک حسین و جمیل کو محبوب رکھا جا سکتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات یہ محبت انسان کو فسق و فجور کی وادی میں لے جاتی ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر حسین و جمیل سے محبت کرنا حرام ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کا بھی غزالی کے پاس کوئی جواب نہیں۔

فنونِ جمیلہ کے باب میں غزالی کی رائے بیان کرنے سے قبل ہم نے یہ چند باتیں اس لئے بیان کر دی ہیں تاکہ آپ بخوبی اندازہ کر سکیں کہ فنون جمیلہ پر نقد و جرح کے علاوہ انھوں نے اصول اخلاق میں سے کوئی ایسی اصل بیان نہیں کی جس سے ان فنون کے بارے میں ان کی رائے کی تصدیق و تائید ہوتی ہو۔ ہاں وہ اتنی بات کا اقرار ضرور کرتے ہیں کہ

"یقیناً سب موزوں نغموں میں اللہ نے ارواح کی تسکین کے لئے ایک خاص بات رکھی ہے"

میں سمجھتا ہوں اگر وہ اس مسئلے پر کچھ مزید غور و فکر کرتے تو یقیناً اس نتیجہ پر بھی ضرور پہنچتے کہ ان فنون کی بقیہ ساماں یوں میں بھی اللہ نے کوئی خاص بات رکھی ہے۔

شعر

نظم و شعر کے بارے میں غزالی کی رائے عجیب و غریب ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مقصود صرف مدح و ذم یا تشبیب ہی ہو سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایسا ہی ہے لیکن باستثناء بعض حالتوں کے، بتایئے ان امور میں قباحت ہی کیا ہے؟

غزالی نے دیکھا کہ یہاں وہ ایک عجیب امر واقعہ سے دو چار ہیں اور وہ یہ کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اشعار پڑھے گئے سو اس بارے میں وہ معذرت یہ لاتے ہیں کہ ان اشعار میں جن مبالغوں سے کام لیا گیا ہے اُن سے مقصود جھوٹ کو ہوا دینا نہیں بلکہ محض شاعرانہ خیال آفرینی اور صنعت گری ہے۔ سو اس لیے مقصود ان اشعار کی صورتیں نہیں بلکہ وہ معانی و مفاہیم ہیں جو ان کے قالب میں پیش کیے گئے ہیں۔

غزالی کی نگاہ میں شعر کی ذلت وحقارت کی سب سے بڑی دلیل اُن کا یہ قول ہے :۔

شعر اس کلام کا نام ہے جس کا اچھا حصہ اچھا اور بُرا حصہ بُرا ہے۔ مگر سرتاپا شعرگوئی ہی کے لئے وقف ہوجانا نہایت قبیح اور مذموم ہے[1]۔"

یاد رکھنا چاہیے کہ ایک شاعر وفن کا جو صفحۂ تاریخ پر اپنے زمانہ وعصر یا اپنے ملک وقوم کی سچی تصویر رقم کرنا چاہتا ہے۔ اُس کا ہمہ وجوہ شعرگوئی ہی کے لئے وقف ومخصوص ہوجانا معیوب اور قبیح نہیں بلکہ مستحسن اور قابل تعریف ہے۔ فرض کیجیے کہ اگر یہ معیوب ہے تو اس کا معنی یہ ہوا کہ افرادِ انسانی میں سے کسی شخص اور کسی فرد کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو نظم وشعر کے حوالہ ونذر کر دے لیکن عوام کو اس کا حق ہے کہ وہ اچھے اشعار گنگنائیں اور ان پر سر دھنتے پھریں کیونکہ ان اشعار کے باب میں بھی وہی فتویٰ ہوگا جو جملہ کلام اور جملہ اشعار کے لئے ہے یعنی ان کا اچھا حصہ اچھا ہے اور بُرا حصہ بُرا ہے۔

ہم یہاں اس امر کی طرف آپ کی نگاہ مبذول کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ شعر کی مذمت و قباحت میں غزالی نے جو احادیث پیش کی ہیں ان کا تعلق خاص قسم کے احوال وظروف سے ہے، بایں وجہ کہ اس باب میں غزالی نے خود جو کچھ بیان کیا ہے وہ بھی ان روایات کے بکلی مناقض ومنافی ہے لہٰذا اُن کے مناسب یہ تھا کہ وہ شعر کے متعلق فیصلہ صادر کرنے سے قبل ان مخصوص احوال کا پورا پورا پاس ولحاظ رکھتے۔

موسیقی

موسیقی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے غزالی نے جس احتیاط کو مدنظر رکھا ہے اُس سے

---

[1] ج ۳ ص ۱۳۱

بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس فن جمیل کے باب میں اُن کی رائے کس قدر وسیع اور ان کی نگاہ کس قدر غائر اور دقیقہ رس تھی۔ وہ مخارج کے اعتبار سے موزون و متناسب آوازوں کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں۔ اوّل وہ جو کسی ٹھوس جسم سے نکلے جیسے بانسریوں، تاروں، سازوں اور ڈھولوں وغیرہ کی آواز۔ دوم وہ جو کسی حیوان کے گلے سے نکلے، پھر یہ حیوان یا تو انسان ہوسکتا ہے یا دوسرے حیوانات مثلاً بلبل، قمری یا دوسرے خوش لحن پرندے۔ آخر میں یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ ان آوازوں کی موزونیت اور عمدگی کی وجہ سے ان کو سننے کو حرام قرار دینا قرینِ قیاس نہیں ہے، کیونکہ بلبل اور دوسرے پرندوں کی آوازوں کے سننے کو آج تک کسی نے حرام قرار نہیں دیا۔ چونکہ ایک گلے اور دوسرے گلے یا ایک ٹھوس جسم اور ایک حیوان کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا تمام ان آوازوں کو، جو انسان اپنی مرضی اور اختیار سے اپنے گلے یا ساز یا طبل اور دف وغیرہ سے پیدا کرتا ہے، اُن کو بھی بلبل کی آواز پر قیاس کرنا چاہیئے اور ان کے سماع میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے۔

یہاں تک تو خیریت تھی اور موسیقی کو غزالی نے اُس کے اونچے پائیے اور مقام سے نہیں گرایا تھا لیکن اس کے فوراً بعد کہتے ہیں۔

"اس جواز سے چنگ و نے اور دوسرے وہ آلاتِ طرب جن کی شرع نے مخالفت کی ہے مستثنٰے ہیں اس لیے نہیں کہ ان کی آواز میں لذت و طرب ہے ورنہ اس پر قیاس کرتے ہوئے تمام لذائذ حرام اور ممنوع ہونے چاہیئے تھے بلکہ اس کے برعکس دوسرے وجوہ سے یہ چیزیں حرام ہیں اول اس لیے کہ یہ شراب نوشی کی طرف داعی ہیں کیونکہ رقص و سرود کی محفلیں مے نوشی کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شراب کی کم سے کم مقدار کو بھی حلال نہیں کیا گیا۔ دوم جس شخص کو شراب ترک کئے ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ گذرا ہے اُسے چنگ و نے کی تانیں مے نوشی کی گذشتہ محفلیں یاد دلائیں گی جس سے اُس کا پرانا ذوق پھر سے اُبھرے گا اور ظاہر ہے کہ یہ شوق جب قوت پکڑ جائے گا تو

اُن کے قدم شراب نوشی کی لغویت کی طرف خود بخود دوبارہ اُٹھنے لگیں گے۔ سوم موسیقی کی وہ محفلیں جو چنگ ونے سے گرم ہوں گی اُن میں لامحالہ لوگ زیادہ سے زیادہ شرکت کریں گے حالانکہ ایسی محفلوں میں شرکت اور ہجوم واجتماع کرنا فساق وبدکار لوگوں کا شیوہ وشعار ہے۔

اس آخری جملے کے بعد انھوں نے عراقی نے تمام کے تمام تار مثلاً ساز، چنگ، رباب اور بربط وغیرہ وہ سب آلات جو شراب ومحافلِ شراب کی یاد تازہ کرتے ہیں ان کو حرام وممنوع قرار دیا ہے اس کے علاوہ تمام دوسرے نغموں کو پرندوں کی آوازوں پر قیاس کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان میں کوئی حرج اور کوئی مضائقہ نہیں۔

ہم غزالی سے اس رائے میں الجھنا چاہتے ہیں نہ اس بنیاد سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس پر انھوں نے یہ ساری دیوار کھڑی کی لیکن اتنی بات پر متنبہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ انھوں نے موسیقی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی پہلو کو قوی اور مضبوط رکھنے پر اُن کی نگاہ کتنی شدید تھی اور انسان کو نفسانی خواہشات کی دلدل سے دور رکھنے کے وہ کتنے متمنی تھے۔

موسیقی کے بارے میں اُن کی گذشتہ رائے پر ہم اتنی بات کا اضافہ اور کریں گے کہ اُنھوں نے بازاروں کے منکرات ومکروہات کو بیان کرتے ہوئے آلات موسیقی کی فروخت کو اُن منکرات میں سے شمار کیا ہے جن کا توڑ دینا واجب اور ضروری ہے، سازوں اور خوبصورت لڑکیوں کے گانے کے سننے کو ضیافت کے منکرات میں شمار کیا ہے۔ مطرب کو کچھ انعام دینے کو اسراف شمار کرتے ہوئے محتسب پر اس کی باز پرس ضروری قرار دی ہے۔ چونکہ مطرب کے پیشے کو انھوں نے متعین نہیں کیا لہذا مغنی اور موسیقار سب اسی کے حکم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ احیاء میں انھوں نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ سازوں اور بانسریوں کی آواز جب کوئی شخص سنے تو اُسے چاہیے کہ اُس گھر میں داخل ہو کر اُن کو توڑ پھوڑ ڈالے جب کسی شخص کو سازلے جاتے

ہوئے دیکھے تو اسے چھین کر بے کار کر دے۔

غزالی کی گذشتہ آرا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گو موسیقی کو یک قلم حرام نہیں کہتے لیکن ساتھ ہی اس کو عزت و وقعت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتے۔ بلاشبہ ہر فن میں جہاں خوبیاں ہوتی ہیں وہاں اُن میں کچھ خامیاں بھی ضرور ہوتی ہیں لیکن ایک فن کار کی نگاہ میں یہ خامیاں بھی خوبیوں سے کچھ کم درجہ نہیں رکھتیں۔ چونکہ فنونِ جمیلہ کا اکثر حاصل و نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عشاق بے جا جرأتوں اور جسارتوں کا شکار رہ جاتے ہیں اس لئے غزالی سرے سے ہی اس کا سدِباب کر دینا چاہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں جب غزالی یہ برداشت نہیں کرتے کہ کوئی شخص ساز لے کر چلے تو وہ اس بات کو گوارا کب کریں گے کہ فن موسیقی سکھانے کے لئے الگ عمارتیں اور کلب قائم کئے جائیں جہاں خوش گلو اور خوش صورت لڑکیوں کو موسیقی کی تعلیم دی جائے۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ وہ آلاتِ موسیقی کو حرام اس لئے قرار دیتے ہیں کہ یہ چیزیں شراب کی محفلوں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اور اسی قباحت کی خاطر اس عجیب و غریب روحانی لذت سے لوگوں کو محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ تمام برائیوں کا منبع اور سرچشمہ یہی چیزیں ہیں

غنا

غزالی نے موسیقی و غناء کے لئے کوئی الگ اور مستقل باب قائم نہیں کیا۔ ہم نے ان دونوں فنون کے بارے میں اُن کی یہ تمام آرا احیاء کے ربعِ عادات کی کتاب ثامن سے جمع کی ہیں جنھیں انھوں نے سماع اور وجد کے تحت ضمناً ذکر کیا ہے۔

گانے کے بارے میں اُن کی رائے سب سے پہلے وہاں سامنے آتی ہے جہاں انھوں نے حضرتِ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس امر میں اتفاق کیا ہے کہ جو شخص گانے کو اپنا پیشہ بنائے اُس کی شہادت مردود ہے۔ کیونکہ ان کی رائے میں گانا مکروہ اور باطل کے مشابہ ہے اور جو شخص اسے اپنا پیشہ بنائے گا وہ لوگوں کی نگاہ میں قدر و عزت حاصل نہیں کر سکتا۔

جب غزالی کی رائے میں مغنّی و مطرب کی شہادت مقبول نہیں ہے تو اس سے صاف

معلوم ہوتا ہے کہ گانا اُن کی نگاہ میں حقیر اور بے قیمت چیز ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ جس فن کی وجہ سے کوئی شخص ذلت و پستی کا شکار ہوا اور لوگوں میں اپنی وقعت و عزت کھو دے وہ کیا کبھی اس فن کی طرف توجہ کر سکتا ہے؟

فنِ غنا سے متعلق جو چند باتیں ہم نے ذکر کی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پہلو بہ پہلو ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ افراد اور حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اس فن کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کریں کیونکہ یہ کہنا کہ یہ فن بے ہودہ اور مکروہ ہے ہرگز درست نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ ایک نہایت ضروری، قابل قدر اور مہتم بالشان فن ہے جس کی جانب جسم اور روح ایسے ہی محتاج ہیں جس طرح دوسری غذاؤں کی جانب۔ رہا غزالی کا نظریہ سو اس کا کیا اعتبار؟ ان کی نگاہ میں تو تنہا پیشہ ور مغنی ہی مردود الشہادت نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو سماع کا دلدادہ اور شیفتہ ہے وہ بھی درجۂ ثقاہت سے گرا ہوا اور کسی شہادت کے لائق نہیں کیونکہ اُن کی رائے میں کسی بے ہودگی پر مداومت و استمرار انتہائی درجہ قبیح اور انتہائی درجہ ناپسندیدہ ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کوئی فن بغیر اپنے عشاق اور ہوا خواہوں کے زندہ نہیں رہ سکتا سو یہی حال گانے کے فن کا ہے۔ جب تک گانے اور سماع کے ہوا خواہ موجود نہیں ہوں گے یہ فن کسی صورت ترقی نہیں کر سکتا۔ جب گانے اور سماع سے عشق اور شیفتگی جرم اور گناہ قرار پائے اور ہر شخص بقدرِ بساط اس کے خلاف جہاد کرنا اپنا فرض اور نیکی سمجھے تو پھر یقین رکھئے کہ اس فن کی خیر نہیں۔ اگر آج نہیں تو کل مر جائے گا۔ رہا غزالی کا یہ قول و ارشاد کہ جب حرمت کا کوئی موجب و سبب موجود نہ ہو تو پھر یہ مباح ہے ہرگز لائق توجہ و اعتنا نہیں اس لئے کہ کسی فن کی اس سے بڑھ کر اہانت اور تحقیر کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مباح ہے۔

عورت اور خوبصورت لڑکے کا گانا

غزالی اس بات کو ایک لمحہ کے لئے بھی روا نہیں رکھتے کہ کسی ایسی عورت سے گانا سنا جائے جس کی طرف نگاہ کرنا شرعاً حلال نہ ہو اور جس کا گانا سننے سے فتنے کے شکار ہو جانے کا کھٹکا ہو۔

بے ریش و بے رودت لڑکا جس کے باب میں ایسے ہی کسی فتنے کا ڈر ہو اس کا بھی بعینہٖ یہی حکم ہو
غزالی کو اس بات کا خیال ہوا کہ یہاں کوئی شخص دریافت کر سکتا ہے کہ کیا یہ قطعاً حرام ہے یا صرف اُس شخص کے باب میں، جو فتنے کا شکار ہو کر گناہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ سو اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس مسئلے کی بنیاد دو باتوں پر ہے (اول) اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی اور اس کے چہرے کو دیکھنا حرام ہے خواہ کسی فتنے کا خوف ہو یا نہ ہو کیونکہ یہ باتیں فتنہ نہ سہی فتنے کی جائے گمان ضرور ہیں (دوم) جب کسی فتنے کا خوف نہ ہو تو لڑکوں کو دیکھنا اپنے اندر کوئی مضائقہ نہیں رکھتا لہٰذا عورتوں کے ساتھ حرمتِ قطعی میں لڑکوں کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ جیسا حال اور جیسا وقت ہوگا ویسا ہی فتویٰ دیا جائے گا۔ رہی عورت کی آواز سو اس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اگر ہم اُسے عورت کے دیکھنے پر قیاس کریں تو اسے بھی حرام ہونا چاہیئے اور گو قریبی قیاس یہی ہے لیکن ان دونوں میں باہم کچھ تھوڑا سا فرق ہے کیونکہ ابتدا میں جذبات میں جو ہیجان پیدا ہوتا ہے وہ گو دیکھنے کا شوق اور داعیہ ضرور پیدا کرتا ہے لیکن آواز سننے کی خواہش پیدا نہیں کرتا، پھر سماس کی خواہش سماع کی نسبت نظر سے زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ عورت کا گانا چونکہ شہوت کی تحریک کرتا ہے اس لئے ممنوع و حرام ہے ورنہ دوسری حالتوں میں عورت کی عام آواز سننا ممنوع نہیں ہے پس اس کا لڑکوں کے دیکھنے پر قیاس کرنا زیادہ قرین صواب ہے کیونکہ جس طرح عورتوں کی آواز داخل حجاب نہیں اسی طرح لڑکے بھی پردے میں رہنے کے مکلف نہیں ہیں لہٰذا فتنوں کے مقامات کی اچھی طرح چھان بین کر لینی چاہیئے اور حرمت کو صرف انہی مقامات تک محدود رکھنا چاہیئے۔

گانے کا موضوع

غزالی کی رائے میں ایسی غزلوں کا گانا جن میں عارض سیمیں، زلفِ عنبریں، حسنِ قد و درازیِ قامت، غرضیکہ عورت کے تمام اوصاف و محاسن کا بیان ہو کوئی ممانعت نہیں بشرطیکہ ان کا مصداق کوئی مخصوص اور معین عورت نہ ہو کیونکہ کسی خاص عورت کے حسن و جمال کا مردوں کی

محفلوں میں ذکر کرنا جائز نہیں ہے سننے والے کا فرض بھی یہی ہے کہ وہ ان امور کو کسی معین عورت پر محمول اور منطبق نہ کرے الا یہ کہ وہ اس کی بیوی یا اس کی باندی ہو۔ فرض کیجئے کہ کسی نے ان اوصاف کا مصداق کسی اجنبی اور غیر عورت کو ٹھہرایا تو وہ عاصی اور گنہگار ہوگا جب کسی پر جذبۂ شہوت غالب ہو تو خواہ اس کا تعلق خاطر کسی خاص شخص سے ہو خواہ نہ ہو اس کے لئے ایسے گانے کا سننا قطعاً حرام ہے۔

مباح گانا

غزالی کی رائے میں گانے کی مباح صورتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) حجاج کا طبل و شاہین کے ساتھ گاتے ہوئے چلنا۔

(۲) لوگوں کو جہاد کے لئے برانگیختہ کرنے کے لئے گانا۔

(۳) جہاد کے موقع پر بہادروں کا رجزیہ اشعار گانا۔ جو جنگ مباح ہو اس میں ایسے اشعار کا گانا بھی مباح اور جو جنگ مستحب ہو اس میں ایسے اشعار کا گانا بھی مستحب ہے لیکن مسلمانوں اور اہلِ ذمہ کے ساتھ جنگ میں ایسے اشعار کا گانا کسی صورت روا نہیں ہے۔

(۴) گناہوں پر گریہ و بکا کے وقت نوحہ خوانی کی آوازیں۔

(۵) جائز و مباح مسرتوں کے اوقات میں گانے کا سماع۔ مثلاً عید، شادی، ولیمہ، عقیقہ، بچے کی ولادت، اس کا ختنہ، اس کا قرآن پاک حفظ کر لینا یا مسافر کا سفر سے واپس لوٹنا۔

(۶) جذبۂ عشق کی تحریک اور نفس کی تسکین کے لئے عشاق کا سماع۔ یہ صرف اس صورت میں حلال ہے جب کہ معشوق بھی اس قبیل سے ہو جن کا لقاء وصال حلال ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنی لذت و مسرت کو دوچند کرنے کے لئے بیوی یا باندی کا گانا غور سے سنتا ہے یا مثلاً اس کی باندی اس سے ناراض ہے یا کسی سبب سے ان میں ناچاقی ہو گئی ہو تو ایسی صورتوں میں اس شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ سماع سے جذبۂ شوق کی تحریک اور لذتِ وصال کی امید اپنے اندر پیدا کرے لیکن اگر اسے فروخت کر دیا ہے یا طلاق دیدی ہو

تو اب یہ بات جائز نہیں رہی کیونکہ جس کی ملاقات و وصال حرام ہے اُس کی جانب شوق کی تحریک بھی حرام ہے۔

(۷) ان نیکوکار اور صالح بندوں کا سماع جو اللہ کے وصل و لقاء کا آبِ زلال پینا چاہتے ہیں اور ہر چیز میں اللہ ہی کو دیکھتے ہیں۔ غزالی نے اس مقام کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ اللہ کی محبت کے علاوہ دوسری محبتوں پر عشق کا اطلاق مجازاً ہوتا ہے کیونکہ اس کے سوا تمام محبوبوں کی نظیر و مثال، وجود میں اور اگر وجود میں نہیں تو امکان میں ضرور مل سکتی ہے لیکن اللہ کے جمال بے مثال کا کوئی ثانی و شریک نہیں نہ وجود میں، نہ امکان میں۔

آدابِ سماع

جو شخص صرف اپنی طبیعت و ذوق کی وجہ سے گانے سے خوش ہوتا اور محض تناسب و موزوں نغموں سے لذت و حظ اٹھاتا ہے غزالی اُس کے سماع کو کوئی وقعت نہیں دیتے کیونکہ ایسے پامال ذوق کے وجود کے لئے تو صرف ذی روح ہونا ہی کافی ہے۔ مزید کسی عامل و سبب کی ضرورت نہیں۔ ہر زندہ و جاندار چیز میں عمدہ آوازوں سے لذت گیری اور مسرت پذیری کا حس و ادراک موجود ہے۔ چنانچہ غزالی اُن لوگوں کا مذاق اُڑاتے ہیں جو گانے کا مصداق اپنی خواہشات اور اپنے مختلف احوال کو قرار دیتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ اُن کے الگ ذکر و بیان کے ساتھ اپنے قلم کو آلودہ کریں۔

غزالی تنہا اُسی شخص کے سماع کا اعتبار کرتے ہیں، جو گانے کو ان احوال و مقامات پر حمل کرے، جو اللہ کے معاملے میں اُس پر وارد و طاری ہوں یا وہ شخص، جو ماسوی اللہ سے بے خبر یہاں تک کہ اپنی ذات، اپنے نفس اور اپنے وجود سے بھی غافل ہو کر بحرِ شہود میں دیوانہ وار غوطے کھا رہا ہو اور اُس کی مثال اُن عورتوں کی سی ہو گئی ہو جنھوں نے جمالِ یوسفی کو دیکھ کر بے خودی میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔

ایسے خوش قسمتوں میں سے جب کوئی عتاب و خطاب، رد و قبول، وصل و ہجر، قرب و بعد گذشتہ پر ندامت، آئندہ کا شوق و انتظار، وعدہ وفائی، وعدہ شکنی، فراق کا خوف، وصال کی مسرت، ذکر ملاحظہ حبیب، مدافعت رقیب، غرضیکہ جن جن امور و معانی پر اشعار مشتمل ہو سکتے ہیں انھیں سنتا ہے تو ان میں سے کوئی نہ کوئی بات ٹھیک نشانے پر بیٹھ کر اس کے قلب کی بجھی ہوئی انگیٹھی کو پھر سے روشن کر دیتی ہے۔

ان حضرات کے لئے غزالی نے مندرجہ ذیل آداب وضع کئے ہیں۔

(۱) زمان و مکان اور ہم نشینوں کی رعایت و پاس خاطر چنانچہ اس کے لئے روا نہیں ہر کہ نفس کی پراگندگی و انتشار کے وقت گانے سننے یا شارع عام یا کسی دوسرے ناپسندیدہ مقام میں بیٹھ کر سماع کی محفل گرم کرے یا ایسی دنیاپرست جماعت کی معیت میں گانا سنے جو ابھی اصلاح کی محتاج ہے اور سماع کی اہل اور لائق ہرگز نہیں ہے۔

(۲) پورے حضور قلب اور بے خودی کے ساتھ قوال کے الفاظ پر کان دھرے اور جہاں دوسرے سامعین کے چہروں پر نگاہ کرنے سے اجتناب و احتراز کرے وہاں اس وجد کے عالم کی بھی پروا نہ کرے جو اس کے دوسرے ہم نشینوں پر طاری ہو ہر حال میں اپنی ذات میں گم اور اپنے قلب کے احوال و کیفیات پر نگاہ جمائے رکھے۔

(۳) جب تک ضبط پر قادر ہو نہ تو قیام کرے نہ ہی گریہ و بکا کے ساتھ اپنی آواز کو بلند ہو لے دے الّا یہ کہ بے خودی کے عالم میں بغیر کسی ریا و نمائش اور بغیر کسی تکلف و تصنع کے سرمستانہ اٹھ کھڑا ہو اور ناچنے یا رونے دھونے لگے تو ایسی حالت میں وہ معذور و مجبور ہے۔

(۴) جب کوئی شریک محفل بے خودانہ یا اپنی مرضی اور اختیار سے بغیر وجد کے قیام کرے تو دوسروں کو بھی حق صحبت و ہم نشینی کے پیش نظر کھڑا ہو جانا چاہیئے۔

(۵) پانچویں ادب کو غزالی نے شیخ و مرشد کے لئے مخصوص کیا ہے اور وہ یہ کہ اپنے مریدوں

کے احوال کی خاص رعایت کرے محفل میں جب کوئی ایسا مرید و مسترشد موجود ہو جو صرف ظاہری ظاہر کی خبر رکھتا اور باطن سے بیگانہ ہے اور جسے سماع کا ذوق نہیں ہے یا سماع کا ذوق تو ہے لیکن شہوتِ نفسانی کی کچھ زنجیریں ابھی اُس کے پاؤں میں اور بشری تقاضوں کے کچھ بندھن ابھی اُس کے ہاتھوں پر موجود ہیں یا فرض کیجیے کہ یہ تمام زنجیریں اور بندھن ایک ایک کر کے کٹ چکے یا ٹوٹ چکے ہیں اور اب اُس کے ہاتھ پاؤں آزاد اور اُس کی بصیرت کا چراغ پوری طرح روشن ہو چکا ہے لیکن ظاہری علم سے عاری اور اللہ کے اسماء و صفات اور دوسرے ان امور سے جاہل و ناواقف ہے جو اللہ کے باب میں جائز یا محال ہیں تو ایسے شخص کی موجودگی میں شیخ کا فرض ہے کہ وہ سماع کی محفل آراستہ نہ کرے۔

رقص

ہم دیکھتے ہیں کہ غزالی رقص کو مباح قرار دیتے ہیں لیکن کیسے رقص کو؟ وہ جو ایسے سرود کی محفلوں میں ہو جس سے مقصود عمل آخرت پر ابھارنا ہو۔ میرے خیال میں وہ اُس رقص میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے ہوں گے جو بیوی یا باندی کے گانے پر کیا جائے۔ بہرکیف ہم اتنا وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ غزالی کی رائے میں رقص و سرود کو نفسانی خواہشوں کی فتنہ گاہوں سے بکلی دور ہونا چاہیئے۔ ہم یہاں اس بات میں نہیں الجھنا چاہتے کہ اس تنگ نگاہی کا اثر قوموں کی زندگی پر کیا ہو گا بلکہ فقط اس بات پر مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ غزالی نفسانی خواہشات کے گرد آہنی اور فولادی دیواریں کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا یہی کہ ان کے مدرسۂ اخلاق سے جو لوگ نکلیں گے اُن کے ہاتھ پاؤں گو تدبیر و احتیاط کے زیور سے آراستہ ہوں گے لیکن ان کے ہونٹوں پر زندگی کی مسکراہٹیں نہیں ہوں گی اور یہ لوگ زندگی کے پُرشور و پُرخروش میدان میں کسی صورت بھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے کیونکہ زہد و انقطاع کی راہ گوشۂ عافیت تک تو ضرور پہنچاتی ہے لیکن زندگی کے رزم بازار کی طرف

کبھی نہیں کھلتی۔

نقش و تصویر

طب، حساب، لغت، شعر، نحو، فصلِ خصومات اور طرقِ مناظرہ کی تحصیل سے چونکہ انسان میں تکبر پیدا ہوتا ہے اس لئے غزالی ان علوم کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اُن کو بجائے علوم کے صناعتوں کا نام دینا چاہئے[1]۔ تو گویا علوم کی نسبت صناعتیں کمتر درجہ رکھتی ہیں طب اور حساب اس لئے داخل صناعات ہیں کہ غزالی کی رائے میں علم صرف وہی ہے جو آخرت کی طرف رہنمائی کرے۔ وہ علوم جو دنیوی زندگی کے ساتھ مخصوص ہیں وہ علوم نہیں صناعات ہیں انھوں نے کئی جگہ اس امر کی تصریح کی ہے کہ جہاں بعض فنون و صناعات اہم اور ضروری ہیں وہاں بعض بالکل بے ضرورت اور بیکار ہیں کیونکہ ان کا اکثر حاصل و نتیجہ دنیوی آرائش و زیبائش ہوتا ہے بنا بریں غزالی ایک مؤمن و مسلم کو اس کی تلقین کرتے ہیں کہ وہ صرف اہم درجے کے فنون و صناعات ہی سے تعرض داعتنا کرے تا کہ اس سے دوسرے مسلمانوں کی کوئی اہم اور معتدبہ خدمت انجام دے سکے۔ آخر میں کہتے ہیں نقاشی، مصوری عمارتوں کی تعمیر اور پختگی وغیرہ ایسے ہی دوسرے دنیوی مزخرفات سے کامل اجتناب کیا جائے کیونکہ تمام اہل دین نے ان امور کی مذمت کی ہے[2]۔

عیدوں اور تہواروں کے موقع پر بچوں کے لئے حیوانوں کی شکل کے کھلونے بیچنے کو ایسے منکرات میں سے شمار کیا ہے جن کا ازالہ ازبس ضروری ہے۔

"حمام میں داخل ہونے والے کا فرض ہے کہ اگر ممکن ہو تو حمام کے اندر یا باہر دروازے پر جو تصویریں ہوں اُن کو ضائع و بیکار کر دے۔ اگر یہ تصویریں اتنی اونچی ہوں کہ ان تک ضائع کرنے کے لئے ہاتھ نہ پہنچ سکتا ہو تو بغیر اشد شدید ضرورت کے اندر داخل نہ ہو بلکہ کسی اور حمام کا رُخ کرے کیونکہ منکرات کا مشاہدہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ تصویروں کے

---

[1] ملاحظہ ہو ج ۳ ص ۲۵۲ [2] ج ۲ ص ۷۹

ضائع کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے چہرے مسخ کر کے ان کی صورتیں بگاڑ دی جائیں"

ذی روح چیزوں کے علاوہ درختوں کی تصاویر اور دوسرے نقوش میں غزالی کوئی باک نہیں سمجھتے۔ تکیوں، مسندوں، بچھونوں، سینیوں اور پیالوں پر تصاویر میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے لیکن جو برتن تصاویر کی شکل میں ڈھالے اور بنائے گئے ہوں جیسے انگیٹھیوں کے سر بعض پرندوں کی شکل کے بنا لیے جاتے ہیں تو یہ حرام اور بلقدر صورت و شکل توڑ دینے کے لائق ہیں۔

عمارتوں کی تعمیر اور دوسرے سامان کی تزئین و آرائش میں غزالی کی آرا باہم متعارض ہیں آپ ابھی پڑھ چکے ہیں کہ وہ پختہ عمارتوں کی تعمیر اور دوسرے مزخرفات کے متعلق کہتے ہیں کہ اہل دین ان امور کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، لیکن آگے چل کر کہتے ہیں:

"جس شخص کے پاس مال و دولت وافر ہو اس کے لیے ان امور میں کوئی حرمت و قباحت نہیں کیونکہ آرائش بھی ایک صحیح اور پسندیدہ مقصد ہے یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ دروازوں اور چھتوں پر نقش و نگار کرنے سے سوائے آرائش کے کچھ حاصل نہیں لیکن اس پر بھی لوگ مساجد کے دروازوں اور چھتوں کو ہمیشہ خوبصورت اور منقش بناتے رہے ہیں سو یہی حال ذاتی گھروں کا ہونا چاہیے"۔

غور فرمائیے جب تحسین و آرائش بھی ایک جائز اور پسندیدہ مقصد ہے تو اس کا فن غیر اہم اور غیر ضروری کیسے ہو سکتا ہے[1]۔

گزشتہ بحث کا خلاصہ

ہم دیکھ چکے ہیں نقش و تصویر مکروہ ہے اور جاندار چیزوں کی تصاویر رکھنا کسی صورت جائز نہیں لیکن مصور تکیوں، مسندوں، سینیوں، پیالوں کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں

---

[1] اس باب میں غزالی کی آراء میں تردد و اضطراب کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ اس مسئلے پر خالص علمی نقطۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو اسے جائز اور پسندیدہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے برعکس جب صوفیانہ نقطۂ نگاہ اختیار کرتے ہیں تو اسے ناجائز اور حرام بتاتے ہیں۔ عبدالوہاب نجار

بظاہر اس انتشار کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ چیزیں گھروں میں عموماً استعمال کی جاتی ہیں اور کثرت استعمال کی وجہ سے ان کی تصویریں کسی عزت کے لائق نہیں سمجھی جاتیں غزالی اس باب میں فقہاء کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ فقہی نقطہ نگاہ کے مطابق تصویر بت پرستی کی طرف داعی ہے اور ہر وہ چیز جو بتوں کی عبادت کی طرف لے جائے وہ حرام اور ممنوع ہے۔

اس باب کے آخر میں ہم اس امر پر اجمالاً متنبہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ غزالی نے انسانی ذوق کی تربیت کا پاس و لحاظ نہیں رکھا، فنونِ لطیفہ کے بارے میں اُن کی گذشتہ آراء اس بات کی صاف غمازی کرتی ہیں کہ اُنھوں نے اس پہلو سے تعمیر اخلاق کو ایک قلم نظر انداز کر دیا ہے۔

بعض اوقات غزالی نہایت دقیق اور سنجیدہ حقائق و نظریات کو عمدہ قصوں اور دلچسپ کہانیوں میں ایسی بُری طرح لپیٹ دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ سب کام دھندے چھوڑ کر گم نامی کے گوشۂ عافیت میں نچنت اور بے خطر بیٹھ رہے یہاں میں پھر اُس بات کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں جسے کئی مرتبہ پہلے بھی دہرا چکا ہوں کہ اس تنگ نظری میں ایک پہلو حق اور خیریت کا بھی ہے اور وہ یہ کہ چونکہ غزالی نیکی اور صلاح کے دلدادہ ہیں اس لیے وہ اُن تمام امور کا بالکل سدباب کر دینا چاہتے ہیں جن میں بدی کا کوئی خفیف سے خفیف شائبہ تک بھی موجود ہو یقیناً اس طریق کار میں جہاں کچھ خوبیاں ہیں وہاں کچھ خامیاں اور عیوب بھی ضرور ہیں۔

تیسری فصل

تربیتِ اطفال

تربیت اطفال کو غزالی اپنی اصطلاح میں ریاضتہ صبیان کہتے ہیں۔ قدیم اظہار و تعبیر میں صبی کا وہی معنی ہے جو جدید زبان میں طفل کا ہے۔ اسی طرح صَبِیَّہ کا لفظ ہماری موجودہ

اصطلاح طفلۃ یا فتاۃ کے مرادف ہے جس طرح ہم کہتے ہیں دَخَلَتْ عَلَیْہِ فَتَاۃٌ حَسْنَاءُ قدیم لوگ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کہتے تھے دَخَلَتْ عَلَیْہِ صَبِیَّۃٌ حَسْنَاءُ (اُس کے پاس ایک حسین لڑکی آئی)

بچوں کی فطرت سے بحث کرتے ہوئے وراثتِ اخلاق وغیرہ کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اس لئے اب اس کا اعادہ نہیں کریں گے یہاں ہم صرف بچوں کی تربیت کے لئے غزالی کے وضع کردہ لائحہ عمل کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ والدین کے فرائض میں ہم نے جس اجمال سے کام لیا ہے حقیقت میں یہ اسی اجمال کی ایک گونہ تفصیل ہے۔

اُن کی رائے میں والد کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) بیٹے کو ادب و تہذیب سکھائے، عمدہ اخلاق کی تعلیم دے، بُرے ہم نشینوں کے میل جول سے روکے۔

(۲) بچپن ہی سے اُس کے سامنے زینت و آرائش اور راحت و آرام کی مذمت کرے تاکہ عیش و تنعم کا عادی اور سست و کاہل نہ ہو جائے، ورنہ جوان ہو جانے کے بعد اس کا سکھانا مشکل ہو جائے گا۔

(۳) بچے میں جس وقت حیا اور تمیز کے آثار ظاہر ہوں تو باپ کو سمجھ جانا چاہیئے کہ اب اس میں عقل کا چراغ روشن ہو رہا ہے اور اس سے فائدہ اُٹھانا ضروری ہے اور وہ بایں صورت کہ عقل کی روشنی سے اس کی تادیب اور تہذیب کا کام لیا جائے۔

(۴) یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بچے پر سب سے پہلے کھانے اور غذا کا لالچ غالب آتا ہے، لہٰذا تعلیم کا آغاز بھی یہیں سے ہونا چاہیئے اُسے سکھلانا چاہیئے کہ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرے، دائیں ہاتھ سے کھائے۔ دستر خوان پر جو کھانا سامنے اور قریب ہو اُس کی طرف ہاتھ بڑھائے، ساتھ کھانے والوں پر سبقت نہ کرے، کھانے کی طرف یا کھانے میں شریک لوگوں کی طرف نظر نہ جمائے آہستہ آہستہ کھائے، اور نوالے کو اچھی طرح چبائے۔ ایک لقمہ جب حلق سے اتر جائے تو دوسرا

لقمہ اٹھائے، ہاتھوں اور کپڑوں کو کھانے سے آلودہ نہ کرے۔ کبھی کبھار اسے روکھی روٹی بھی کھانے کو دی جائے تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ کھانے کے ساتھ سالن کا ہونا ہمیشہ ضروری ہے۔

(۵) پرخور بچوں کی مذمت اور کم خور بچوں کی تعریف کرکے اُس کے سامنے پُرخوری کی مذمت کی جائے۔ دوسروں کو کھلا دینا، کھانے کی باتوں میں دلچسپی نہ لینا جس طرح کا کھانا سامنے آجائے کھالینا، ان اوصاف کی خوبی اُس کے ذہن نشین کرنی چاہیئے۔

(۶) بچے کو سفید کپڑے پہننے کا شوق دلایا جائے اور اُس کو سمجھایا جائے کہ رنگین کپڑے پہننا مردوں کا کام نہیں، عورتوں اور مخنثوں کا شیوہ و شعار ہے۔ جو لڑکے اس قسم کے کپڑے پہننے کے عادی و شوقین اور عیش و راحت کے پروردہ ہوں اُن کی صحبت سے اسے بچایا جائے جو لوگ اس قسم کے خرافات کی ترغیب دیتے ہوں اُن کی ملاقات سے بھی باز رہنے کی تلقین کرنی چاہیئے۔

(۷) جب بچے سے کوئی پسندیدہ فعل ظہور میں آئے تو دوسروں میں تعریف کرکے اس کا دل بڑھایا جائے اور صلہ و انعام دیا جائے۔ اس کے خلاف کبھی کوئی بات وجود و ظہور میں آئے تو چشم پوشی اور اغماض سے کام لینا چاہیئے تاکہ بُرے کاموں کے کرنے پر دلیر اور گستاخ نہ ہو جائے خصوصاً جب وہ خود اس کام کو چھپانا چاہتا ہو۔ اگر دوبارہ یہی فعل اُس سے سرزد ہو تو تنہائی میں اُسے نصیحت و سرزنش کرنی چاہیئے اور یہ سمجھانا چاہیئے کہ یہ بہت بُری بات ہے لیکن باربار اُس کو ملامت نہیں کرتے رہنا چاہیئے۔ اس بات کا خاص لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ہر وقت زجر و توبیخ نہ کرتے رہیں کیونکہ باربار کہنے سے بات کا اثر کم ہو جاتا ہے اور بچہ زجر و توبیخ کا عادی ہو کر شوخ اور بیباک ہو جاتا ہے۔

(۸) دن میں سونے سے روکنا چاہیئے کیونکہ اس سے سستی اور کسل پیدا ہوتا ہے۔ رات کو خوب سونے دینا چاہیئے لیکن نرم اور آرام دہ بستر کی بجائے سخت اور کھردرے بستر پر سونے کا عادی بنایا جائے تاکہ اُس کے اعضا سخت اور مضبوط ہوں۔

(۹) اس بات پر خاص نگاہ رکھنی چاہیئے کہ بچہ کوئی کام چھپا کر نہ کرے کیونکہ بچہ تنہا اسی کام کو چھپا کر کرتا ہے جسے وہ بُرا سمجھتا ہے۔

(۱۰) دن کے کسی حصے میں اس کو پیادہ چلنے اور کھیلنے کودنے کا موقع ضرور دینا چاہیئے تاکہ محنت اور ورزش کا عادی ہو۔

(۱۱) ہاتھ پاؤں کھلے رکھنے سے منع کرنا چاہیئے۔

(۱۲) ہم صحبت بچوں پر، دولت، مال، لباس، غذا، قلم، دوات، تختی غرضیکہ کسی چیز پر بھی فخر کا اظہار کرنے سے روک کر تواضع اور خوش گفتاری کا خوگر بنانا چاہیئے۔

(۱۳) اگر بچہ امیر ہے تو اُسے بتانا چاہیئے کہ خوبی اپنے پاس سے کچھ دینے میں ہے، لینے میں نہیں کسی سے کچھ لینا حوصلہ مندی کے خلاف اور مروت کے منافی ہے۔ اگر بچہ مفلس و نادار ہے تو اس کے ذہن نشیں کیا جائے کہ کسی سے بخشش وعطا کا قبول کرنا سراسر دنائت اور کمینہ پن ہے۔

(۱۴) مجلس میں تھوکنا، ناک صاف کرنا، دوسروں کے سامنے جمائی اور انگڑائی لینا، لوگوں کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا، پاؤں پر پاؤں رکھنا، ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی رکھ کر بیٹھنا، سر کو بازو کا سہارا دینا۔ ان باتوں سے منع کرنا چاہیئے۔

(۱۵) قسم کھانے سے روکنا چاہیئے گو سچی ہی کیوں نہ ہو ورنہ قسمیں کھانے کا عادی ہو جائے گا

(۱۶) اُسے بتانا چاہیئے کہ بات خود شروع نہ کرے بلکہ جب کچھ پوچھا جائے تو بولے اور جتنی بات پوچھی جائے صرف اُتنی ہی کا جواب دے، جو اس سے عمر میں بڑے ہیں اُن کی بات توجہ اور غور سے سُنے۔ جب کوئی ذی مرتبہ آدمی مجلس میں آجائے تو اس کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور اُسے کھلی جگہ بٹھائے۔

(۱۷) فضول گوئی، دشنام طرازی اور سخت کلامی سے منع کیا جائے۔

(۱۸) اُسے سمجھانا چاہیئے کہ صبر بڑی اچھی چیز ہے، جب اُستاد مارے تو رونے کے ساتھ آواز بلند کرے نہ کسی کو سفارشی لائے۔ اس کے اچھی طرح ذہن نشین کرانا چاہیئے کہ صبر بہادروں اور

حوصلہ مندوں کا کام ہے اور رونا دھونا اور واویلا کرنا غلاموں اور عورتوں کا شیوہ ہے۔

(۱۹) مکتب سے پڑھ کر آئے تو کسی عمدہ کھیل کے کھیلنے کا موقع اُسے ضرور دینا چاہئے، بچے کو کھیلنے سے روکنے اور ہر وقت پڑھنے اور لکھنے میں مصروف رکھنے سے اس کا دل بجھ جاتا ہے ذہن کند ہو جاتا ہے اور پڑھنے لکھنے سے اُس کی طبیعت اُچاٹ ہو جاتی ہے تاآنکہ وہ مدرسے جانے سے بھی جی چرانے لگتا ہے۔

(۲۰) والدین، اُستاذ، عمر میں بڑوں، اپنوں اور پرایوں سب کی تعظیم و تکریم کی اُسے تلقین کرنی چاہئے۔

(۲۱) بچہ جب کچھ بڑا ہو جائے تو اُسے پاک صاف رہنے اور نماز پڑھنے کی تاکید کرنی چاہئے ماہ رمضان کے کچھ روزے بھی ضرور رکھوانے چاہئیں۔ ابتدائی شرعی احکام سے بھی اُسے آشنا کرنا چاہئے۔

(۲۲) چوری، خیانت، حرام خوری، جھوٹ، فحش گوئی، غرضیکہ جو جو باتیں عموماً بچوں پر غالب ہوتی ہیں اُن سب کے نتائج بد سے بچے کو پوری طرح آگاہ اور باخبر کرنا چاہئے۔

یہ ہے خلاصہ اُس دستور العمل کا جو غزالی نے بچوں کی تربیت کے لئے وضع کیا ہے یقیناً اس میں بعض چیزیں مکرر ہیں لیکن آپ جانتے ہیں تکرار ہر جگہ معیوب بھی نہیں۔

زکی مبارک کی تنقیص: میں سمجھتا ہوں یہ بات بالکل بے معنی ہے کہ بچے کو سفید لباس پہننے کا شوق دلایا جائے مگر ہو سکتا ہے کہ غزالی کے زمانے میں یہ کوئی بڑی خوبی کی بات سمجھی جاتی ہو، ساتھ ہی یہ بات بھی بالکل بے کار بلکہ بے ہودہ ہے کہ بچے کو بتایا جائے کہ دنیا میں کوئی گروہ ایسا بھی ہے جسے مخنثین کہتے ہیں اور یہ لوگ رنگین لباس پہننا پسند کرتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ بچے کے کان ایسے خرافات سے آشنا ہی نہ ہونے چاہئیں۔ اُسے معلوم ہی نہیں ہونا چاہئے کہ کبھی عورتوں اور مخنثوں کے عادات و اطوار بھی اپنائے جا سکتے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ بچہ کھلے ہاتھ نہ چلے بلکہ چلتے وقت اپنے ہاتھ کو سینے پر رکھے رہے۔ سچی بات ہے میں تو ہنسی ضبط

ضبط نہیں کرسکتا جب پڑھتا ہوں کہ غزالی بچے کو نصیحت کرتے ہیں کہ جب استاذ مارے تو اسے صبر کرنا چاہئے اور شور و واویلا نہیں کرنا چاہئے کیا مناسب یہ نہ تھا کہ وہ اپنے اساتذہ کو اس امر کی تلقین کرتے کہ وہ مار پیٹ کی بے ہودہ حرکت سے ہی سرے سے باز رہیں

یقیناً یہ غزالی کی بڑی دقیقہ شناسی اور تہ رسی کی بات ہے کہ جب بچہ جوان اور بالغ ہو جائے تو اُسے جوانی و بلوغ کے سارے اسرار و نکات پوری طرح سمجھا دئے جائیں۔

غزالی مدرسہ کو مکتب یا کتّاب کہتے ہیں۔ ان کے زمانہ و عصر میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بچوں کے لئے جو ایک مختصر اور ادھورا سا نصاب تعلیم ہو سکتا تھا وہ انھوں نے درج کر دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بچے کو قرآن حکیم کے ساتھ صلحاء اور نیکو کار لوگوں کے کچھ قصے کہانیاں از بر کرا دی جائیں۔ ریاضت و ورزش یا نصاب میں زبان و ادب وغیرہ کے پہلو کو انھوں نے یکسر نظر انداز اور فراموش کر دیا ہے۔ ایک جگہ صرف اتنا کہا ہے :-

بچوں کو عشقیہ اشعار اور عاشق مزاج لوگوں سے دور رکھا جائے۔ جو لوگ سمجھتے ہوں کہ عشقیہ اشعار سے طبیعت میں ایک گونہ رقت و حلاوت پیدا ہوتی ہے اور عقل کو ان سے جلا ملتا ہے اُن کی صحبت سے بھی بچوں کو بچانا چاہئے اس لئے کہ ایسی باتوں سے بچوں کے دلوں میں بے ہودگی اور فساد کی تخم ریزی ہوتی ہے۔"

بچوں کو آرام و راحت کے تمام اسباب و مظاہر سے دور رکھ کر غزالی حقیقت میں انھیں فوجی بنانا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی کتنا افسوسناک ہے کہ انھیں حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں :-

"انھیں یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ موت ہر گھڑی اُن کے انتظار میں ہے اور عقلمند وہ ہے جو اس دنیا سے آخرت کا توشہ بنائے۔"

میری رائے میں یہ نصیحت بڑی مہلک و خطرناک ہے کیونکہ اس سے زندہ لوگوں کے دل بیٹھ جائیں گے، ہمت و شجاعت کا جذبہ صاف جواب دیدے گا اور اسلامی سرحدوں کی

حفاظت وصیانت اور کسی ملک کو فتح کرنے کے لئے ہمیں ایک سپاہی بھی نہیں مل سکے گا حالانکہ فی الواقع اسلام کیا ہے؟ مجاہدوں، فاتحوں اور شجاعوں کا ایک دینِ قدیم ہے۔

تربیتِ بنات

افسوس ہے کہ غزالی نے بچیوں کی تربیت کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی، حالانکہ مناسب تھا کہ بچوں کے ساتھ انھیں بھی اپنی توجہ وعنایت سے نوازتے لیکن معلوم ہوتا ہے وہ بھی اپنے زمانے کی رسم وعادت سے متاثر ومرعوب ہو گئے کیونکہ پرانے لوگ بچیوں کی تربیت کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے۔

جب ہم بیوی کے حقوق کو بیان کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ غزالی شوہر پر یہ بات واجب ولازم گردانتے ہیں کہ اگر وہ پڑھا لکھا ہے تو بیوی کو خود تعلیم دے، اگر جاہل ہے تو بیوی کی طرف سے علماء سے مسائل دریافت کرنے میں نیابت کرے لیکن وہ علم جس کا سکھانا مرد پر فرض ہے وہ غزالی کی رائے میں صرف نماز اور روزے کے مسائل تک محدود ہے حالانکہ خانگی زندگی میں تنہا نماز روزے کے مسائل ہی جاننا کافی نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا علم بھی انتہائی ضروری ہے جن کا بھاری بوجھ عورتوں کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیا گیا ہے۔

چوتھی فصل

معلّمین کے آداب

بچوں کی تربیت کے لئے غزالی نے جو دستور العمل مرتب کیا ہے وہ آپ کی نگاہ سے گذر چکا ہے، ساتھ ہی آپ وہ مختصر سا نصاب تعلیم بھی ملاحظہ کر چکے ہیں جو انھوں نے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے لئے وضع کیا ہے۔ اب ہم آپ کو طلبہ کی تعلیم وتربیت کے باب میں غزالی کی رائے سے متعارف وآشنا کرتے ہیں۔ طلبہ سے مراد وہ ہیں جو ابتدائی اور ثانوی تعلیم

کے دور سے نکل کر اعلیٰ تعلیم کی طرف قدم بڑھانا چاہتے ہیں۔

غزالی نظامیہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے جہاں ان کے حلقۂ درس میں تقریباً تین سو طلبہ پروانہ وار شریک ہوتے تھے۔ اس یونیورسٹی میں یقیناً ان کے کچھ دوسرے ہم کار بھی تھے جن کے اپنے اپنے حلقہ ہائے درس ان سے الگ تھے۔ لہٰذا ناممکن ہے کہ گرد وپیش کے ان تمام امور سے متاثر ہو کر غزالی نے فن تعلیم پر متانت اور سنجیدگی سے کوئی غور ہی نہ کیا ہو۔

احیاء اور ایہاء علیٰ ما اشکل من الاحیاء میں فن تعلیم پر انھوں نے بڑی طویل اور سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ تمام فنون میں فن تعلیم سب سے افضل و برتر ہے اور آخر میں اس افضلیت و برتری کو پوری وضاحت و تفصیل سے بیان بھی کر دیا ہے۔

غزالی کی رائے میں تعلیم کے لئے شرط اول یہ ہے کہ اس سے مقصد خالصتاً اللہ کی رضا جوئی اور رضا طلبی ہو چنانچہ کہتے ہیں:

"جو شخص علوم آخرت پڑھاتا ہے یا ان کی بجائے علوم دنیا پڑھاتا ہے لیکن اس سے بھی اس کا مقصود آخرت کی سرخروئی ہے تو ایسا شخص ابدی اور اخروی زندگی کے باب میں بڑا ہی مفید ہے۔ رہا محض دنیا طلبی اور جاہ پرستی کے لئے علم کا سیکھنا اور سکھانا سو یہ معلم اور متعلم دونوں کے لئے باعث موت و ہلاکت [1] ہے۔"

ان کی رائے میں دنیوی علوم سے مراد طب، حساب، ہندسہ، جغرافیہ اور وہ تمام علوم ہیں جن کا اللہ، ملائکہ، صحف سماویہ، رسل و انبیاء اور یوم آخرت سے کوئی ربط و تعلق نہ ہو۔ پس جو شخص علوم دنیا کی تعلیم دیتا ہے اس کا فرض ہے کہ اس سے اپنا مقصد و مطمح نظر آخرت کی سرخروئی قرار دے تاکہ اپنی نجات و مغفرت کا کوئی سامان کر سکے۔

مزید براں غزالی اپنی نیکی و صلاح کی وجہ سے علم کو دولت سے تشبیہ دیتے ہیں جس طرح ایک دولت مند کی مختلف حالتیں ہیں کہ کبھی دولت کما رہا ہے کبھی جمع کر رہا ہے کبھی اپنی

---

[1] ج ۱ ص ۶۰

ذات پر صرف کر رہا ہے کبھی دوسروں پر بخشش وعطا کی بارش کر رہا ہے اور یہ آخری حالت سب حالتوں میں زیادہ قابل قدر اور قابلِ تعریف ہے۔ بالعینہٖ اسی طرح صاحبِ علم کی بھی مختلف حالتیں ہیں کبھی وہ علم کی طلب وتحصیل میں مشغول ہے کبھی اس سے خود روشنی حاصل کر رہا ہے کبھی دوسروں کو روشنی دے رہا ہے (اور یہ حالت سب حالتوں میں زیادہ افضل وقابل تعریف ہے)

علم کی روشنی دینے سے مراد تعلیم ہے۔ غزالی معلّم کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ وہ خود بھی معلّم تھے۔ وہ معلّم سے صرف اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ یا تو وہ صرف علومِ آخرت ہی کی تعلیم دے اور یا پھر علومِ دنیا کو بھی بقصدِ آخرت پڑھائے۔ عن قریب معلم کے آداب میں آپ پڑھیں گے کہ وہ اس کو تعلیم پر اجرت لینے سے منع کرتے ہیں لیکن اس سے یہ کہیں لازم نہیں آتا کہ وہ تعلیم کو کوئی پیشہ نہیں سمجھتے۔ دوسرے پیشوں کی طرح یہ بھی ایک پیشہ ہے۔ جہاں اس کو خوبی وعمدگی کے ساتھ انجام دینا ممکن ہے وہاں اس میں کسی کوتاہی یا خامی کا رہ جانا بھی بعید نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ معلّم ایسے طریق سے تعلیم دے کہ جس سے اُس کا علم دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ نافع ومفید ہو تاکہ وہ اپنے فرض کی ادائگی سے بکمال حسن وخوبی عہدہ برآ ہو۔

معلّم کے لئے انھوں نے مندرجہ ذیل آداب وضع کئے ہیں۔

(۱) متعلمین کو بمنزلہ اولاد کے سمجھے اور انھیں شفقت ورافت سے پیش آئے۔ غزالی آگے چل کر متعلمین کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں جس طرح ایک ہی باپ کی اولاد کا فرض ہے کہ وہ باہم اتحاد وتعاون سے کام لیں اسی طرح ایک ہی استاد کے تمام شاگردوں کا فرض ہے کہ باہم صلح وآشتی اور محبت واخوت سے رہیں۔

(۲) معلّم کا فرض ہے کہ شارع علیہ السلام کی پیروی اور اتباع کرے اور تعلیم جیسے اعلیٰ مقصد کا صلہ وجزا یا شکر وسپاس کا طالب نہ ہو۔

(۳) متعلم کی بہی خواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے اور وہ بایں صورت کہ جب تک طالب علم میں کسی معین علم کے پڑھنے کی قوت واستعداد پیدا نہ ہو جائے اُسے اس علم کی طلب سے باز رکھے اور جب تک وہ علم ظاہر سے فارغ نہ ہو جائے علم باطن میں اُسے مشغول نہ ہونے دے

(۴) اشارہ وکنایہ کے پیرایہ میں اُسے ہر طرح کی بداخلاقیوں سے روکے۔ نہایت لطف و محبت کے ساتھ ان قبیح امور کی بدانجامیوں اور نافرجامیوں پر اُسے مطلع وآگاہ کرے لیکن یہ بات ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھے کہ بات کی صراحت سے بات کا وقار اور اثر کم ہو جاتا ہے اس لئے صریح زجر و توبیخ سے کبھی کام نہ لے۔

(۵) اُن علوم کے علاوہ جن کی وہ خود تعلیم دیتا ہے دوسرے علوم کی مذمت وقباحت طالب العلم کے دل میں کبھی راسخ وجاگزین کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مثلاً لغت وادب کے معلم کو ہرگز اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ طالب العلم کی نگاہ میں علم فقہ کی عزت ووقعت کم کرے بلکہ اُس کے مناسب یہ ہے کہ اس پر تمام علوم کے دروازے پوری طرح کھلے چھوڑے اگر وہ خود کئی علوم پڑھاتا ہے تو ان کی تعلیم میں طالب العلم کی ذہنی استعداد کا خاص لحاظ رکھے اور نہایت تدریج کے ساتھ اُسے ایک علم سے دوسرے علم کی طرف لے جائے۔

(۶) طالب علم کے فہم وقابلیت کے مناسب تکلم کرے اور جو باتیں اس کی عقل اور سمجھ سے ماوراء ہیں اُن کے درس وتلقین سے احتراز کرے

(۷) کم استعداد کے طالب العلم کے سامنے صرف چیدہ چیدہ اور موٹی موٹی باتیں رکھے اور اُس سے یہ ہرگز نہ کہے کہ ان باتوں کے پیچھے کئی دقیق نکتے ہیں جن کو وہ اُس کی بے لیاقتی اور کم فہمی کی وجہ سے بیان نہیں کر رہا ہے۔

(۸) معلم کو خود عمل کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیئے تاکہ اُس کا قول وعمل ہم آہنگ ہو، گو یہ بات صرف معلمین ہی سے مخصوص نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خوبی دوسروں کی نسبت معلمین میں بدرجہ اتم موجود ہونی چاہیئے کیونکہ معلم کا مرتبہ ایک مربی اور ایک ہادی و مرشد

کا مرتبہ ہے اس لیے حسن سیاست کا کم سے کم درجہ اور تقاضا یہ ضرور ہونا چاہیئے کہ ہادی و مرشد قول کے ساتھ عمل کی دولت سے بھی مالا مال ہو۔

(۹) اُس کا فرض ہے کہ اپنے ظاہری لباس کو بھی ستھرا رکھے تاکہ طلبہ کی نگاہوں میں عزت و توقیر پیدا ہو اور وہ کسی پہلو سے بھی اُس کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ غزالی نے اس بات کو معلمین کے آداب میں بیان نہیں کیا بلکہ نظافت کے باب میں ایک جگہ ضمناً تحریر کیا ہے جہاں کہا ہے :۔

" چونکہ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم دعوت الی اللہ کے لیے مامور تھے اس لئے آپ کے منجملہ وظائف کے ایک بڑا وظیفہ یہ بھی تھا کہ آپ عزتِ نفس سے کام لیں تاکہ دوسروں کے دلوں میں بھی آپ کی عزت و تکریم کا صالح جذبہ پیدا ہو ظاہر کو بھی صاف اور ستھرا رکھیں تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں آپ کا مرتبہ اور مقام کم نہ ہو۔ اب جو شخص بھی دعوت الی اللہ کا بیڑا اُٹھائے گا اُس کا فرض ہے کہ وہ بھی اسی قصد اور اسی نیت سے اپنے ظاہر کی صفائی اور ستھرائی پر خاص توجہ دے تاکہ لوگوں کی نفرت اور بے وقعتی کی نگاہوں کا ہدف نہ بنے۔

(۱۰) متعلم کی نیت اور ارادہ کو خوب اچھی طرح جانچ پرکھ لے اگر اُس کی نیت نیک ہو تو اسے علم سکھائے، اگر بری اور فاسد ہو تو علم سکھانے سے باز رہے۔ گویا جس طالب العلم کے اقوال و افعال، خوراک و پوشاک اور رہنے سہنے سے معلوم ہو کہ علم کی تحصیل سے اس کا مقصد نیک اور صحیح نہیں، غزالی کی رائے میں اُسے تعلیم دینا جائز نہیں ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں :۔

" معلم کا یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ میرا مقصود تو نشرِ علم ہے۔ علم حاصل کرنے کے بعد متعلم کو اختیار ہے چاہے اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے چاہے نقصان کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص راہزن کے ہاتھ میں ایک تیز دھار تلوار دے کر کہے کہ اس سے میرا مقصود تو سخاوت اور دوسرے عمدہ اخلاق کے ساتھ تخلق یا جہاد کے بارے میں اس کی امداد کرنا ہے اب اگر یہ تلوار کو کسی کی اذیت و ضرر پہنچانے کے لئے استعمال کرتا ہے تو اس کے لئے

مسئول میں نہیں وہ ہے۔"

میرے خیال میں غزالی کے مناسب یہ تھا کہ وہ معلم کو اس امر کی نصیحت کرتے کہ متعلم میں برائی کے جو جراثیم پائے اُن کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرے، رہا علم کے باب میں اس سے بخل برتنا سو یہ ایک عمدہ فرض سے فرار اور خالصتاً سلبی عمل ہے۔ جو کسی صورت بھی مفید و سود مند نہیں۔

پانچویں فصل

متعلمین کے آداب

متعلم کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) سب سے پہلے رذائل اخلاق اور مذموم اوصاف سے اپنے نفس کو بکلی پاک کرے۔

(۲) جس قدر ممکن ہو دنیوی علائق کو کم کرے اور طلب علم میں اپنے خویش و دیار سے دور نکل جائے کیونکہ دل جس قدر پراگندہ ہوگا حقائق کے ادراک سے اسی قدر محروم رہے گا۔

(۳) جس طرح ایک جاہل مریض اپنے آپ کو شفیق و حاذق طبیب کے حوالے کر دیتا ہے اسی طرح طالب العلم کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو معلم کے حوالہ، و سپرد کر دے۔

(۴) آغاز کار میں اختلافی مسائل پر مطلقاً کان نہ دھرے کیونکہ اس سے ذہن پراگندہ و حیران ہو جاتا ہے سب سے پہلے اپنے استاذ کے مسلک و طریق کو خوب اچھی طرح سمجھ لے اور اس سے فراغت کے بعد اختلافی مذاہب کے مطالعہ کی طرف رجوع کرے۔

(۵) ابتدا میں تمام عمدہ فنون سے آگہی اور اطلاع بہم پہنچائے۔ آگے چل کر اگر عمر وفا کرے تو کسی ایک فن کو اپنے لئے مخصوص کر لے اور اس میں مہارت و تبحر پیدا کرنے کی کوشش کرے یا صرف اہم علوم میں اپنے آپ کو مشغول رکھ کر انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور بقیہ علوم سے

یک سوئی اور دوری اختیار کرے۔

(۶) کسی فن کی تحصیل بے قاعدہ اور اندھا دھند نہ شروع کر دے بلکہ اس میں تدریج اور ترتیب کا خیال رکھے۔

(۷) جب تک نیچے کے فن سے فارغ نہ ہو لے اوپر کے فن کی طرف نہ بڑھے کیونکہ تمام فنون کی تکمیل میں ایک خاص ترتیب رکھی گئی ہے اور ان میں سے بعض سے بعض تک راہ نکلتی ہے بعید نہیں کہ یہ طریق کار اُن فنون کے بارے میں مناسب ہو جو غزالی کے زمانے میں رائج اور متداول تھے کیونکہ ظاہر ہے کہ فقہ کی تحصیل اصول فقہ کی تحصیل میں ممد و معاون ہے لیکن کیا ہمیں آج کل بھی اسی طریق کار پر عامل و کاربند ہونا چاہیئے؟ یقیناً نہیں کیونکہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ منطق حساب کے لئے یا نحو، جغرافیہ اور تاریخ تمدنِ اقوام کے مطالعہ کے لئے بمنزلہ مقدمہ و تمہید ہے۔

(۸) طالب العلم کو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ کسی علم کی فضیلت و برتری کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے حاصل و نتیجہ اور قوتِ دلیل پر پہلے نگاہ کر لی جائے مثلاً غور کیجئے کہ علم دین، علم طب کی نسبت اشرف و افضل ہے کیونکہ اول الذکر کا ثمرہ اُخروی سعادت و کامرانی ہے اور ثانی الذکر کا دنیوی سعادت و کامجوئی، اور ظاہر ہے کہ آخرت دنیا پر مزیت و ترجیح رکھتی ہے اسی طرح علم حساب، علم نجوم سے برتر ہے کیونکہ اول الذکر میں جو قوتِ ادلہ موجود ہے وہ دوسرے میں سرے سے مفقود اور ناپید ہے۔ علم طب، علم حساب پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ اس کا حاصل و ثمر قوتِ دلیل سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

کاش غزالی کو اس بات کی خبر ہوتی کہ علم حساب میں صرف دلیل کی پختگی ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی موجود ہے لیکن وہ بھی معذور ہیں کیونکہ اُن کے زمانے کے انسان کو اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ اُس کی تخلیق سے غرض و غایت دنیائے وجود کی استواری و تعمیر ہے۔

دسواں باب

حقوق و واجبات

جو آپ کا دوسرے کے ذمے ہے وہ آپ کا حق ہے، جو دوسرے کی طرف سے آپ پر عائد ہوتا ہے وہ آپ کا واجب ہے، مثلاً آپ کہتے ہیں میرا حق ہے کہ میں علم حاصل کروں میرا واجب[1] ہے کہ میں اپنے پڑھے ہوئے پر عمل کروں۔

غزالی ان دونوں لفظوں میں کوئی فرق نہیں کرتے حق کو واجب کی جگہ اور واجب کو حق کی جگہ آزادی سے استعمال کرتے ہیں اور بعض اوقات ان دونوں کو تنہا ادب کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزالی نے انسان پر اپنے نفس، اپنے پروردگار، اپنے بھائی، اپنے ہمسایہ، اپنے والدین، اپنی اولاد، غرضیکہ سب کے حقوق کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ ایک تاجر، ایک صانع اور ایک مسافر کے قواعد و آداب کیا ہیں۔ کسی انسان کے دوسروں پر حقوق اور دوسروں کی طرف سے اس پر عائد شدہ فرائض پر بھی مکمل اور سیر حاصل تبصرہ

---

[1] ہم نے اکثر جگہ واجب کا ترجمہ فرض کیا ہے۔ مترجم

کیا ہے۔

ہم یہاں حقوق و واجبات کے بارے میں غزالی کے نقطۂ نگاہ کا خلاصہ درج کرتے ہیں تاکہ آپ اس زمانے کے اسلامی رجحانات کا آسانی سے اندازہ کر سکیں۔

(۱)
انسان پر اس کی ذات کا حق

غزالی کی رائے میں انسان کا فرض ہے کہ اوامر پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ نواہی سے پوری طرح اجتناب اور پرہیز کرے۔ تدبیر اس کی یہ ہے کہ اپنے مختلف اوقات کی تقسیم کرلے اور صبح سے شام تک برابر اوراد و وظائف میں مشغول رہے۔

غزالی کی رائے میں انسان کو چاہیئے کہ صبح سویرے اُٹھے سب سے پہلے اللہ کو یاد کرے مسواک کرنا کبھی نہ بھولے کیونکہ اس سے جہاں منہ صاف اور ہلکا ہو جاتا ہے وہاں اس سے اللہ خوش اور شیطان ناراض ہو۔

ہم اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ وضو، غسل یا طہارت و پاکیزگی کے دوسرے انواع و اقسام، جن کی طرف شریعتِ اسلامی داعی ہے، غزالی کا ان امور پر زور دینا حقیقت میں ایک عمدہ زندگی کی طرف دعوت دینے کے مرادف ہے۔ اسلام کا ہر نماز سے پہلے وضو کو ضروری قرار دینا، احتلام اور جماع کے بعد غسل کو فرض قرار دینا واقع میں انسان کے سر پر سے سستی اور کاہلی کا بوجھ اتارنے کے ہم معنی ہے۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اگر مشرق میں اسلام نہ پھیلتا تو اس کی کیا کیفیت ہوتی۔ سلامتِ ذوق اور طہارت و نظافت جس سے اکثر مشرقی اقوام محروم تھیں، اسلام ہی کی بدولت ان میں عام ہوئیں۔ مگر غور کیجئے آج بھی بعض علمار کی نگاہ میں صفائی اور ستھرائی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے وضو کرتے وقت تنہا صفائی کی نیت کی تو اس کا وضو بے حقیقت ہو جائے گا کیونکہ صفائی اور ستھرائی محض ایک ذریعہ اور ایک

وسیلہ ہے جن پر کوئی غرض اور کوئی مقصد متفرع نہیں ہو سکتا سبحان اللہ یہ حضرات اپنے خیال میں کیا دور کی کوڑی لائے ہیں۔

نیند کے بیان کردہ آداب میں، افسوس ہے کہ ہم غزالی کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اس امر کا مشورہ دیتے ہیں کہ انسان کو چاہیئے کہ جس طرح مردہ قبر میں لیٹتا ہو اسی طرح وہ سوتے وقت دائیں کروٹ لیٹے اور ساتھ ہی تصور کرے کہ نیند موت کی طرح اور بیداری قیامت کی گھڑی کی طرح ہے کیا بعید ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسی رات میں اس کی روح قبض کر لیں، ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ ہمیشہ باوضو ہو کر سونا چاہیئے اور لکھی ہوئی وصیت ہمیشہ سرہانے موجود رہنی چاہیئے۔

میں غزالی سے اس باب میں اس لئے اتفاق نہیں کر سکتا کہ میری رائے میں زندوں کو موت کی فکر سے ہمیشہ دور رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ موت کا پیہم تصور جہاں انسان میں بے رغبتی اور تعطل وجمود کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے وہاں بلند ہمتی اور بلند خیالی کے جذبات کو بھی سرے سے فنا کر دیتا ہے۔

اگر انسان کو اچھے اعمال واخلاق پر آمادہ کرنا مقصود ہو تو یہ غرض، موت کا خوف دلائے بغیر بھی پوری ہو سکتی ہے۔ مثلاً اچھائی کی خوبی، عمدگی اور برتری کو ہم اس پیرایے میں بھی تو بیان کر سکتے ہیں کہ اس سے رفعتِ مرتبت، بلند حوصلگی اور اولوالعزمی کے جذبات پرورش اور نشوونما پاتے ہیں۔

غزالی نے اپنی اکثر اخلاقی کتب میں انسان پر اس کی ذات کے حقوق کو بیان کیا ہے لیکن ہر جگہ یہ نقص نمایاں ہے کہ وہ اس کے ضمن میں دنیا کو بڑی حقارت اور بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حقیقت میں یہ بہت بڑی لغزش ہے کیونکہ غزالی اور ان کے ہم مشرب دوسرے لوگ جو موت کو بھی ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں، ان کے ذہن وتصور میں دنیا کی جو بھیانک اور گھناؤنی صورت آتی ہے واقع میں دنیا اس سے کہیں زیادہ ارفع وبلند اور حسین ودلکش ہے۔

وہ دنیا جس کے عشاق کو تم فسق و فجور کے ساتھ متہم کرتے ہو کیا اس کی تخلیق اللہ نے یونہی عبث اور بے فائدہ کی ہے؟

(۲)

انسان پر اپنے ہم مذہبوں کا حق

کسی ہم مذہب کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری کے لئے غزالی نے کئی آداب وضع کئے ہیں جن میں سے بعض باہم داد وستد اور بعض نفس کو کینے سے پاک رکھنے کے ساتھ مخصوص ہیں اور بعض اس امر سے متعلق ہیں کہ انسان کو دوسرے کی طرف سے دکھ اور درد سہہ کر بھی اس سے نیکی اور بھلائی کا سلوک کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہاں دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا غزالی کے خیال میں دنیا میں کوئی غیر مسلم موجود نہیں؟ اگر ہے تو پھر اُن کی رائے میں اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔

اس سوال کا جواب احیاء العلوم میں کہیں نظر نہیں آتا ہاں البتہ اپنے فتاویٰ[1] میں ایک جگہ غزالی کہتے ہیں:-

"ضرر رسانی میں ذمی کا بھی وہی حکم ہے جو ایک مسلمان کا ہے کیونکہ شریعت نے ان کے بھی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اور ذمی کے ساتھ تقریباً ایک ہی جیسا سلوک کرنا چاہیئے۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمانوں کی طرف سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن کا خلاصہ ماحصل یہ ہے:-

(۱) کسی کو اپنے قول و عمل سے ضرر و نقصان نہ پہنچائے۔

(۲) ہر ایک سے تواضع سے پیش آئے اور کسی پر تکبر نہ کرے۔

(۳) چاہے کسی پر کتنا ہی غصہ کیوں نہ آئے تین دن سے زیادہ اُس سے ناراض نہ رہے۔

---

[1] شرح زبیدی ج ۱ ص ۱۵

(۴) جس کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ کرنے پر قادر ہو بلا تمیز و استثنا اُس سے نیکی کا برتاؤ کیے جائے۔

(۵) کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہو بلکہ تین مرتبہ تک اجازت طلب کرے اگر اجازت مل جائے تو فبہا ورنہ واپس لوٹ جائے۔

(۶) ہر ایک کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے اور ہر ایک سے اُس کے مرتبے اور مقام کے مطابق گفتگو کرے۔ اگر اُس نے نادان سے علم کی باتیں، جاہل سے فقہ کی باتیں کوتاہ بیان اور بے بصیرت سے خطابت کی باتیں شروع کردیں تو اس سے نہ صرف مخاطب کو نقصان پہنچے گا بلکہ خود متکلم کو بھی بہت زحمت اور کوفت اٹھانا پڑے گی۔

(۷) بڑوں کی عزت کرے اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت و رافت کا سلوک کرے۔

(۸) ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی اور خندہ روئی سے پیش آئے۔

(۹) جب مسلمان کے ساتھ کوئی وعدہ کرلے تو اُسے ضرور ایفا کرے۔

(۱۰) ہر ایک کے ساتھ انصاف کرے جس طرح کے برتاؤ کا خود دوسروں سے متوقع ہو اُسی طرح کا برتاؤ خود اُن کے ساتھ کرے۔

(۱۱) جس کی ہیئت وصورت اور لباس و انداز سے معلوم ہو کہ کوئی قابل قدر اور عالی مرتبت آدمی ہے اُس کی عزت و توقیر کرے۔

(۱۲) حتی الامکان اصلاح ذات البین کی کوشش کرے۔

(۱۳) تمام مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرے یہاں غزالی نے اس حدیث سے استشہاد کیا ہے :-

"اے لوگو جو زبانوں سے ایمان لائے ہو لیکن ابھی تک ایمان کو تمہارے دلوں میں بار نہیں ملا۔ دوسروں کی غیبت نہ کرو اُن کے عیوب پر مطلع ہونے کی کوشش نہ کرو، کیونکہ جو مسلمان دوسرے مسلمان کی عیب جوئی اور پردہ دری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کی پردہ دری

کرتے ہیں اور جس کی پردہ دری اللہ کریں وہ اُسے یقیناً شرمندہ کر کے چھوڑتے ہیں چاہے وہ اپنے گھر کے اندر کیوں نہ چھپا ہوا ہو۔"

(۱۴) حتی المقدور ہر حاجت مند مسلمان کی حاجت روائی کرے اور جب کوئی اُس سے ایسے شخص کے باب میں سفارش کا طالب ہو جس پر اُس کا اثر ہے تو ضرور اُس کا ساتھ دے۔

(۱۵) اخوتِ اسلامی اور حمیت دینی کے پیشِ نظر مسلمان بھائی کی عزت، جان اور مال کی حفاظت کرے اور جو اُس پر ظلم کرنا چاہے اُس کا ہاتھ پکڑے اور پورا پورا مقابلہ و دفاع کرے

(۱۶) تہمتوں کے مواقع سے بچے تاکہ لوگوں کے دل اُس کی بدگمانی سے اور اُن کی زبانیں اُس کی غیبت اور بدگوئی سے محفوظ رہیں۔

(۱۷) اپنے بھائی سے حسنِ سلوک سے پیش آئے اور جب وہ کسی آفت و بلا میں گرفتار ہو تو اُس کی ہمدردی و غمگساری کرے۔

(۱۸) دولتمندوں کی مجالست و ہم نشینی سے احتراز کرے اور درویش و فقراء کے ساتھ ربط و ضبط اور میل جول زیادہ بڑھائے۔

ان حقوق کے بیان میں یقیناً آپ ایک گونہ تکرار ضرور محسوس کریں گے لیکن اس سے بھی آپ کو اخلاق کے بارے میں غزالی کا نقطۂ نگاہ سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہو گی وجہ اُس کی یہ ہے کہ غزالی نہایت محتاط اور جزرس قسم کے آدمی ہیں وہ ایک ہی مفہوم کو کئی تصنیفات میں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک ہی تصنیف میں مکرر سہ کرر لاتے ہیں تاکہ اس کے تمام پہلو اور تمام جزئیات طالب و مستفید کے دل میں خوب اچھی طرح راسخ و جاگزیں ہو جائیں۔

(۳)
ہمسائیگی کے حقوق

غزالی کی رائے ہے کہ ہمسائیگی کا حق اخوت اسلامی کے حق سے بھی برتر ہے کیونکہ مسلمان ہمسایہ اسلامی حق کے علاوہ کچھ زائد حق کا بھی مستحق ہے۔ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا

ارشادِ گرامی ہے کہ

"ہمسائے تین طرح کے ہوتے ہیں اول وہ جس کا ایک ہی حق ہے، دوم جس کے دو حق ہیں، سوم جس کے تین حق ہیں آخر الذکر وہ ہمسایہ ہے جو مسلمان ہونے کے علاوہ رشتہ دار بھی ہے اس کے تین حق یہ ہیں حقِ جوار، حق اسلام اور حق قرابت داری جس کے دو حق ہیں وہ مسلمان ہمسایہ ہے اس کا ایک تو حقِ اسلامی اور دوم حق ہمسائیگی جس کا تنہا ایک ہی حق ہے وہ وہ پڑوسی ہے جو مومن و موحد نہیں بلکہ مشرک و کافر ہے۔"

اس حدیث کی شرح میں کہتے ہیں۔ غور کیجیے محض ہمسائیگی کی وجہ سے کس طرح ایک مشرک و کافر کے حق کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

ہمسائے کے لئے انھوں نے مندرجہ ذیل فرائض قرار دئے ہیں۔

(۱) جب ہمسائے سے ملے تو اُن سے سلام میں پہل کرے۔

(۲) اُس کے ساتھ سلسلۂ کلام کو دراز نہ کرے۔

(۳) اُس کی ہر بات میں ہندی کی چندی نہ نکالے اور جو کچھ وہ اپنے گھر کو لے جا رہا ہو اُسے گھور گھور کر نہ دیکھے۔

(۴) جب وہ بیمار ہو تو اُس کی عیادت کو جائے۔

(۵) جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو اُس کا درد بٹائے۔

(۶) خوشی و مسرت میں اُسے مبارکباد دے اور ظاہر کرے کہ وہ بھی اس مسرت میں اُس کا شریک ہے۔

(۷) اُس کی لغزشوں سے درگذر کرے اور اُس کے خلاف کسی کی بات پر کان نہ دھرے۔

(۸) اُس کے عیوب پر اطلاع حاصل کرنے کے لئے چھت پر سے اُس کے گھر میں نہ جھانکے اگر اتفاقاً نگاہ پڑ گئی ہے تو جو کچھ نظر آئے اُسے چھپائے اور اُس کا چرچا نہ کرتا پھرے۔

(۹) اُس کی دیوار پر شہتیر رکھ کر اُسے رنج نہ پہنچائے

(۱۰) نہ اُس کے پرنالے میں پانی گرائے اور نہ اُس کے صحن میں مٹی اور کوڑا وغیرہ پھینکے۔

(۱۱) اُس کے گھر کا رستہ تنگ نہ کرے۔

(۱۲) جب وہ کسی مصیبت کا شکار ہو تو اُس سے نکلنے میں اُس کی دستگیری کرے۔

(۱۳) جب وہ کہیں سفر میں ہو تو وقتاً فوقتاً اُس کے گھر کی خبر گیری کرے۔

(۱۴) اُس کی غیرت و حمیت کے مواقع کا پاس و لحاظ رکھے اور اُس کی خادمہ کو ٹکٹکی باندھ کر نہ دیکھے

(۱۵) اُس کے بچوں سے پیار کی باتیں کرے۔

(۱۶) دین یا دنیا کے جن امور سے وہ ناواقف ہے اُن کے بارے میں اُسے بصیرت دلائے۔

غزالی کہتے ہیں اِن حقوق کے علاوہ ہمسائے کے وہ تمام عمومی حقوق بھی ہیں جو ہم نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر بیان کیے ہیں ہمسائے کے حقوق میں گو انھوں نے مومن و مشرک کی تمیز نہیں کی لیکن آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے ان مساویانہ حقوق کے ساتھ کفار میں سے صرف ذمی کو مخصوص کیا ہے کیونکہ اُن کی رائے میں حربی کو اذیت پہنچانا حرام نہیں ہے

(۴)
رشتہ داروں کے حقوق

گذشتہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ جوار اور قرابت کی وجہ سے مشرک کا حق بھی ثابت ہے چنانچہ اس باب میں غزالی حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کا واقعہ نقل کرتے ہیں وہ کہتی ہیں:-

میری والدہ میرے پاس آئیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری والدہ تشریف لائی ہیں اور وہ مسلمان نہیں ہیں کیا میں اس پر بھی اُن کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کروں؟ آپ نے فرمایا ضرور، دوسری روایت میں ہے کیا اس پر بھی میں ان کو کچھ دوں، آپ نے فرمایا ہاں ضرور دو۔

یہ بات واضح ہے کہ قرابت اور رشتہ داری کے ساتھ اخوت دینی اور ہمسائگی کی وجہ سے حقوق اور دوچند ہو جاتے ہیں۔

(۵)

والدین کے حقوق

غزالی کہتے ہیں کہ اخوت کے حقوق سے والدین کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کیونکہ ابوّت کا رشتہ اخوّت کی نسبت کہیں زیادہ مضبوط اور قوی ہے بلکہ بعض علماء کی رائے ہے کہ والدین کی اطاعت و فرماں برداری گو شرعی محرمات میں نہ ہی لیکن ضرف مشتبہ امور میں بھی واجب ہے۔ اس لئے کہ کسی مشتبہ امر سے بچنا تقویٰ اور ورع کا کام ہے لیکن والدین کی رضا جوئی فرض اور واجب ہے۔

غزالی کی رائے ہے کہ حج گو فرض ہے لیکن اس میں بھی عجلت کرنا اور والدین کی رضامندی کے بغیر چلا جانا جائز نہیں کیونکہ فریضۂ حج کی ادائیگی میں عجلت نفل ہے فرض نہیں۔ اسی طرح بلا والدین کے اذن و اجازت کے طلب علم کے لئے نکلنا بھی روا نہیں۔ ہاں البتہ اگر نماز، روزہ اور دوسری فرض عبادات کا علم سکھانے والا بھی کوئی اس شہر میں موجود نہ ہو تو پھر ان کی اجازت کے بغیر بھی ان علوم کی تحصیل کے لئے سفر کرنا جائز ہے۔ کاش غزالی صرف اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اس حکم کو تمام ان علوم کے لئے عام رکھتے جو زندگی کے لئے لازمی اور ناگزیر ہیں

غزالی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ والدہ کی خدمت میں رہنا جہاد میں شریک ہونے سے افضل و اشرف ہے۔ تو گویا ان کی رائے میں والد کی نسبت والدہ کے ساتھ حسن سلوک زیادہ ترجیح رکھتا ہے۔

(۶)

اولاد کے حقوق

والد کا فرض ہے کہ

(۱) بیٹے کا نام عمدہ تجویز کرے

(۲) چھ برس کی عمر میں اسے ادب اور تہذیب سکھانا شروع کرے۔ نو برس کی عمر میں اس کا

بستر الگ کر دے۔ تیرہ برس کی عمر میں نماز نہ پڑھنے پر اس کو سزا دے سولہ برس کی عمر میں اُس کی شادی کر دے۔

(۳) نیک بننے میں اُس کی امداد کرے اُسے عاق یا نافرمان ہونے کا موقع نہ دے۔

(۴) تمام اولاد سے یکساں اور مساوی سلوک کرے۔

(۵) جب بچوں کے لئے بازار سے کچھ لائے تو اُس کی تقسیم بچیوں سے شروع کرے۔

(۷)

تاجر کا فرض

غزالی کی رائے میں تاجر کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) گرانی کے انتظار میں غلے کا احتکار نہ کرے۔ خوراک کی تمام مختلف اور متفرق اجناس کا یہی حکم ہے۔ رہی وہ چیزیں، جو غذا، اور خوراک کے قبیل سے نہیں ہیں مثلاً دوائیں، جڑی بوٹیاں اور زعفران وغیرہ تو وہ بھی گو مطعومات میں شمار ہوتی ہیں لیکن اس حکم سے خارج ہیں، گوشت پھل، یا ایسی ہی دوسری اشیاء جن کے تناول پر کھانے کی طرح مداومت تو نہیں کی جاتی لیکن گاہے گاہے یہ خوراک کے قائم مقام ہو سکتی ہیں۔ ان کے احتکار کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی گھی، شہد، شیرہ، پنیر اور تیل کے احتکار کو بھی بعض علماء نے حرام قرار دیا ہے جب کھانے پینے کی چیزیں عام ہوں اور اُن کے ذخیرہ کر لینے سے قحط کا خوف و خطرہ لاحق نہ ہوتا ہو تو اس حالت میں اُن کا احتکار ممنوع نہیں ہے۔ اس بارے میں عام اصول یہ ہے کہ اجناس خوردنی کے جمع رکھنے سے عوام کو جتنی تکلیف ہو گی اتنی ہی ان چیزوں کے جمع رکھنے کی کراہت و حرمت بھی بڑھ جائے گی۔

جب کوئی مرض یا وبا پھیل جائے تو اُس وقت ادویہ کے احتکار کا کیا حکم ہے غزالی کا فرض تھا کہ اسے بھی بیان کرتے کیوں کہ بعض حالتوں میں کھانے کی اشیاء کی نسبت ادویہ کی ضرورت و حاجت زیادہ اہم اور شدید ہو جاتی ہے اور ایسے وقت میں ان کی

ذخیرہ اندوزی بہت بڑے نقصان کا موجب بن سکتی ہے۔[1]

(۲) سامان تجارت کی تعریف میں مبالغہ نہ کرے۔

(۳) اُس کے عیوب اور نقائص کو نہ چھپائے

(۴) اُس کا وزن اور مقدار صحیح صحیح بتائے۔

(۵) اُس کا وہ اصلی نرخ بتانے میں بخل نہ کرے کہ جس کا اگر گاہک کو علم ہو جاتا تو وہ اُس کے خریدنے سے گریز کرتا۔

(۶) روپے ادا کرتے وقت کھوٹے سکوں کو چلانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ دوسرے فریق کو اگر اس کا علم نہ ہو سکا تو اُسے نقصان اٹھانا پڑے گا اور اگر علم ہو گیا تو وہ بھی انھیں اور آگے چلا دے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ فریب ایک عرصے تک چلتا رہے گا یہیں سے یہ بات بھی معلوم و محقق ہو گئی کہ تاجر کو کھرے کھوٹے کی پرکھ بھی سیکھنی چاہئے۔ اس لئے نہیں کہ روپے لیتے وقت بصیرت سے کام لے سکے بلکہ اس لئے کہ غفلت و جہالت میں کہیں دوسروں کو کھوٹے روپے نہ دے جائے اور اس بے تمیزی اور کوتاہی کی وجہ سے گنہگار نہ ہو۔

(۷) بازار کے داموں سے زیادہ دام وصول نہ کرے، رہی مطلق زیادتی سو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ تجارت اور سوداگری سے مقصود نفع اُٹھانا ہے اور یہ بجز کچھ زیادہ دام وصول کرنے کے ممکن و متصور نہیں لہذا اعتبار زیادتی کی مقدار کا ہوگا۔

(۸) تجارت کا پیشہ اختیار کرتے ہی اپنی نیت درست کرلے۔ اُس کا قصد یہ ہونا چاہئے کہ میں اس پیشے کی بدولت بھیک مانگنے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے محفوظ رہوں گا بال بچوں کے رزق کا کفیل اور ذمہ دار بن سکوں گا۔

---

[1] غزالی کے کلام سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے کلام کا مدار و محور تنہا عوام کی بہبودی اور نفع رسانی ہے ان کی رائے ہے کہ خلق خدا کو جتنا بھی فائدہ پہنچایا جا سکے اُس میں دریغ نہ کیا جائے لہذا جب ادویہ کی ضرورت عام ہو جائے تو اُس وقت ان کے احتکار کا بھی وہی حکم ہے جو ضرورت کے وقت غلے کے احتکار کا ہے۔
عبدالوہاب نجار

(۹) تجارت یا کسی صنعت و حرفت سے اس کی غرض یہ ہونی چاہیئے کہ میں اس کی وجہ سے ایک فرض کفایہ کو انجام دے رہا ہوں کیونکہ تجارت یا دوسرے پیشوں کی طرف اگر کوئی توجہ نہ کرے تو انسانوں کی آبادی کا اکثر حصہ تباہ و برباد ہو جائے۔

(۱۰) بازار جانے اور خرید و فروخت کرنے کا ایسا دلدادہ نہ ہو کہ صبح سویرے سب سے پہلے بازار میں پہنچے اور شام کو سب سے آخر میں واپس لوٹے۔ تجارت کی غرض سے سمندر کا سفر اختیار نہ کرے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و ارشاد ہے کہ سوائے حج، عمرہ اور جہاد کے سمندر کا سفر جائز نہیں۔

یہ ہے غزالی کا نظریہ۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی ان کا تصوف کی طرف رجحان و میلان صاف کارفرما ہے۔ ورنہ عملی اور اجتماعی زندگی میں انسان کے اخلاقی فرائض کے ساتھ ان باتوں کو کیا مناسبت ہے؟ یقیناً تاجر کو چاہیے کہ سب سے اول بازار پہنچنے کی کوشش کرے اور سب سے آخر واپس لوٹے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کا فرض ہے کہ ایسا کرے، تجارت کی غرض سے سمندر کی ہولناک موجوں پر ضرور سوار ہو حاصل یہ ہے کہ نفع اندوزی اور کاروباری کے لئے جد و جہد اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے آخر حج، عمرہ اور جہاد بھی کیا ہیں زندگی کے من جملہ اسباب و ذرائع کے ایک ذریعہ اور وسیلہ ہی تو ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اکثر لوگ ان باریک امور کو سمجھنے کی صلاحیت و استعداد ہی نہیں رکھتے۔

(۱۱) صرف حرام ہی سے اجتناب پر اکتفا نہ کرے بلکہ مشکوک و مشتبہات کے مقامات سے بھی بچے۔ اس باب میں دوسروں سے فتویٰ پوچھنے کی ضرورت نہیں خود اپنے قلب سے استفتا کرے۔ جب سامانِ تجارت میں اسے کوئی شک یا شبہ پڑ جائے تو خوب اچھی طرح اس کی تحقیق کر لے ورنہ اس کے منافع کی حلت بھی مشکوک اور مشتبہ ہو جائے گی۔

(۱۲) جن لوگوں کے ساتھ اسے لین دین کا سابقہ پڑے ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرے ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھے کہ اسے قیامت کے روز پائی پائی کا حساب دینا پڑے گا۔

(۱۳) جب کوئی بیوپاری مال خریدنے کے بعد کسی وجہ سے اسے واپس کرنا چاہے تو بطیب خاطر اس کی اس خواہش کو قبول کرے کیونکہ مال واپس وہی کرتا ہے جو سودے پر نادم ہو اور سمجھتا ہو کہ اس میں اُسے نقصان ہے لہذا بائع کا فرض ہے کہ وہ اپنے بھائی کی مضرت کا باعث نہ بنے۔

(۱۴) قرض پر سودا دینے کے لئے فقرا اور درویش کی ایک جماعت کو مخصوص کر لے اور سودا دیتے وقت ہی دل میں یہ عہد کر لے کہ اگر ان سے اس کی قیمت نہ بن پڑی تو اس کیلئے وہ مطالبہ نہیں کرے گا۔

(۱۵) قیمت یا قرض وصول کرتے وقت حسن سلوک اور خوش معاملگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھے لہذا کبھی مطالبے میں نرمی برتے کبھی مقروض کی میعاد اور مہلت بڑھا دے کبھی دوسرے کے ذمّے واجب الادا رقم میں کچھ کمی اور تخفیف کر دے۔

ان آداب کو بیان کرنے کے بعد ہم اس بات کی طرف اشارہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ غزالی نے معاشرہ اور ہیئتِ اجتماعی کو سدھارنے اور بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی قصر اُٹھا نہیں رکھی کیونکہ جو تاجر مندرجۂ بالا آداب کے ساتھ مزین ہوگا اس کی تجارت حقیقت میں لوگوں کے لئے آیۂ رحمت اور مایۂ سعادت ہوگی چاہے عوام کو اس کا علم نہ ہو لیکن واقع میں ایسا تاجر اپنے شہر اور اپنے قریہ کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہا ہوگا۔

جہاں تجارت کے مبیّنہ آداب کی خوبی اور عمدگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہاں اس امر سے بھی انکار مشکل ہے کہ غزالی نے تاجر کے کاندھوں پر ظاہری اور باطنی آداب کا ایک نہایت وزنی اور بھاری بوجھ رکھ دیا ہے حالانکہ مناسب یہ تھا کہ اس کو زندگی کے باب میں بازی لگانے اور جان پر کھیل جانے کی مشق کی تلقین کی جاتی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ غزالی عافیت اور سلامتی کے برابر کوئی دولت قرار نہیں دیتے اور ان کی رائے میں خوش قسمت اور خوش بخت وہ ہے جو اپنے دین کو بحفاظت بچا لے جائے چاہے اس سے

اُس کی دنیا بگڑتی ہے تو ہزار بار بگڑا کرے۔

(۸)

مسافر کے آداب

غزالی نے سفر کے فوائد اور نقصانات کے سلسلے میں کئی طویل فصلیں سپردِ قلم کی ہیں اور سفر کو مختلف قسم کے لوگوں سے ملاقات اور میل جول کا ذریعہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا باعث یا تو کسی چیز کی تلاش اور جستجو ہوتی ہے اور یا کسی چیز سے گریز اور اجتناب، ان تمام امور کو انھوں نے اس عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انسان پڑھ کر بے اختیار عش عش کر اُٹھتا ہے۔

مسافر کے لئے وضع کردہ آداب میں سے ہم صرف ایک مختصر سا مجموعہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) جن لوگوں کو کبھی اُس کے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے اُن سب سے معافی چاہے اُس کے ذمے لوگوں کے جو قرض ہیں اُن کو ادا کرے جن افراد کی کفالت اُس پر واجب ہے اُن کے نان نفقے کا مکمل انتظام کرے۔ لوگوں کی جو امانتیں اُس کے پاس محفوظ ہیں اُنھیں واپس لوٹا دے، زادِ راہ کے لئے صرف حلال اور پاک مال کو منتخب کرے اپنی ضرورت سے فاضل سفر خرچ ساتھ لے تاکہ کچھ اُس کے رفقا کے بھی کام آ سکے۔

(۲) تنہا سفر کبھی نہ کرے بلکہ پہلے کسی دیندار رفیقِ سفر کو تلاش کرے کیونکہ بمصداق المرء علیٰ دین خلیلہ دوست دوست ہی کے مذہب پر ہوتا ہے

(۳) سفر میں یوں ہی نہ چل دے بلکہ پہلے دوستوں، شناساؤں اور اپنے بال بچوں کو الوداع کہے۔

(۴) تڑکے ہی گھر سے نکلے کیونکہ سویرے نکلنے میں بڑی خیر و برکت ہے۔

(۵) اکثر مسافت راتوں میں طے کرے کیونکہ دنوں کی نسبت راتوں میں مسافت زیادہ

اور بسہولت طے ہوتی ہے۔

(۶) دن میں بڑی احتیاط سے چلے ایسا نہ ہو کہ کہیں قافلے سے الگ ہو کر راستہ بھول جائے یا خدانخواستہ کسی اور مصیبت و آفت کا شکار ہو جائے۔ رات کو خبردار اور چوکس سوئے۔

(۷) سواری کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے اُس کی طاقت سے زیادہ اُس پر بوجھ نہ لادے ہنکانے کے لئے اُسے چہرے پر نہ مارے۔ صبح و شام اُس سے اتر کر اُسے دم لینے اور ستانے کا موقع دے۔

(۸) شیشہ، سرمہ دانی، قینچی، مسواک، کنگھی، صراحی، مشکیزہ اور رسی ہمیشہ ساتھ رکھے۔

(۹) ہر شہر میں وارد ہونے سے اُس کی نیت یہ ہو کہ وہاں کے بڑے اور بزرگوں سے ملے گا اور ان میں سے ہر ایک سے کوئی نہ کوئی خوبی اور اچھائی کی بات سیکھے گا۔

(۱۰) کسی دوست کے ہاں تین روز سے زیادہ قیام نہ کرے۔ جب سفر میں کسی استاذ کی ملاقات کو جائے تو ایک رات دن سے زیادہ اُس کے پاس نہ ٹھہرے۔

(۱۱) جب دیکھے کہ گھر میں رہنے کی نسبت سفر میں اُس کا کوئی ذاتی نقصان ہے تو فوراً واپس لوٹنے کی فکر کرے۔

آپ یقیناً محسوس کریں گے کہ یہ آخری بات اپنے کمالِ دقت و خوبی کے لحاظ سے خاص غور و فکر کی طالب ہے۔

(۹)
بیوی کے حقوق

غزالی کی رائے میں عورت اور مرد حقوق میں باہم برابر اور مساوی نہیں ہیں بلکہ مرد، عورت کا آقا اور مالک ہے۔ جو شخص تمام امور عورت کے سپرد کر دے اور ہر بات میں اُسی کی اطاعت اور پیروی کرے اس کے متعلق کہتے ہیں:۔

"ایسے شخص نے اُلٹی راہ اختیار کی اور شیطان کی اطاعت کو اپنی طرف راہ پانے کا موقع

دیدیا کیونکہ اُسی نے کہا تھا میں ان پر مسلط ہو جاؤں گا اور وہ اللہ کی قائم کی ہوئی سنت کو یکسر بدل دیں گے" مرد کے مناسب یہ ہے کہ وہ متبوع ہو تابع نہ ہو، مخدوم ہو خادم نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مردوں کو قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کہا ہے اور وَاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ میں شوہر کو سید و آقا کا لقب دیا ہے، پس جہاں مخدوم، خادم اور متبوع، تابع ہو گیا تو گویا اس نے اللہ کی دی ہوئی نعمت و عزت کی بے قدری اور ناشکری کی۔[1]

غزالی نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے چل کر عورت کی طبیعت و فطرت پر ایک بھرپور اور کارگر حملہ اور وار کیا ہے۔ چنانچہ عورتوں کے آداب بیان کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں "ان پر بد خلقی اور کم عقلی عموماً سوار رہتی ہے" اور اس موقع پر ایک حدیث نبوی سے استدلال و استشہاد کیا ہے جس کی صحت کے باب میں کم سے کم میں ہرگز مطمئن نہیں ہوں اور وہ یہ ہے "نیکو کار بیوی کی مثال اُس سفید بازو کوے کی طرح ہے جو سو میں ایک آدھ ہوتا ہے"

غزالی نے بیوی کے لئے جو حقوق وضع کئے ہیں اُن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

(۱) شوہر کا فرض ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ حسن خلق سے پیش آئے، اُس کی کم عقلی اور کم فہمی پر رحم و ترس کھاتے ہوئے اس کی اذیت و تکلیف کو برداشت کرے۔ آگے یوں کہتے ہیں۔

"اس بات کو ذہن میں رکھو کہ عورت کو تکلیف اور نقصان پہنچانے سے باز رہنے میں کمال نہیں ہے کمال اس میں ہے کہ اُس کی ہر بری بھلی بات کو برداشت کرو اور اُس کے غصہ

---

[1] عورتیں طبعاً درشت طبیع اور عصبی المزاج ہوتی ہیں ادنیٰ سی ادنیٰ بات پر چڑ جانا، ہلکی سی ہلکی بات پر بگڑ بیٹھنا ایک پل میں رائی کا پہاڑ بنا دینا، کمزور سے کمزور بنیاد پر لڑائی کی لمبی چوڑی دیوار کھڑی کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جن لوگوں کو عورتوں کے مسائل کا علم اور تجربہ ہے وہ اس بات کی یقیناً تائید کریں گے۔ بالخصوص جس گھر میں عورت کی دیورانی جیٹھانی، نند اور ساس وغیرہ بھی ساتھ رہتی ہوں وہاں تُو تُو میں میں کی داستان اور آئے دن کی نکا فضیحتی ایک مسلمہ امر ہے۔ اس تمام جھگڑے کو چکانے کی ایک ہی صورت اور ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ گھر میں مرد کا رعب اور دبدبہ ہو اور اُس کی ہر چھوٹی بڑی بات بلا چون وچرا مانی جاتی ہو۔

عبدالوہاب نجّار

طیش کو صبر و تحمل اور علم و بردباری کے ساتھ ٹال دو۔"

(۲) چونکہ عورتیں دل لگی اور ہنسی مذاق سے خوش ہوتی ہیں اس لئے ان کی طرف سے تکلیف اور اذیت کے بدلے میں تم دل لگی اور مذاق کی باتیں کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات سے ظرافت و خوش طبعی کی باتیں کیا کرتے تھے اور تمام اعمال و اخلاق میں ان کی ذہنی سطح اور عقلی معیار کا خاص خیال رکھتے تھے۔ عورتوں کی طبیعت اور فطرت کے بارے میں غزالی کی پختہ رائے اور نظریہ یہی ہے

(۳) غیرت کے بارے میں اعتدال برتے جن امور کے عواقب و نتائج خدشہ و خطرہ سے خالی نہیں اُن کے مبادی و مقدمات میں غفلت، اور تساہل کبھی نہ برتے بدگمانی، بدسلوکی اور مخفی امور کے تجسس اور تحقیق میں مبالغہ نہ کرے۔

(۴) خرچہ دینے میں میانہ روی کو اپنا شعار بنائے۔ ایسا بخیل نہ ہو کہ بیوی پیسے پیسے کو ترسے ایسا فیاض نہ ہو کہ ترنگ میں آکر سب کچھ اُس کے حوالے کر دے، روکھی پھیکی پر ہی ہمیشہ زور نہ دے بلکہ کبھی پُر تکلف کھانے کو بھی گھر میں پکانے کی اجازت دے، بچا کھچا کھانا یا وہ چیزیں جو دیر تک گھر میں رکھنے سے خراب ہو جاتی ہیں اُن کے بارے میں بیوی کو مستقل طور پر اجازت دیدے کہ صدقہ و خیرات کر دیا کرے۔ بیوی کو حق پہنچتا ہے کہ بلا شوہر کی اجازت کے ان امور میں جیسا تصرف چاہے کرے۔ مرد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ خود تو چکنی چپڑی کھائے اور دوسرے گھر والوں کو روکھی پھیکی دے کیونکہ یہ پرلے درجے کی بے مروتی اور ناہمدردی ہے

(۵) شوہر کا فرض ہے کہ بیوی کو نماز کے مسائل و احکام سکھائے اگر خود نہ جانتا ہو تو جو کچھ وہ پوچھے علما سے دریافت کر کے آئے۔ جب تک شوہر اس خدمت کو انجام دے رہا ہے بیوی کو اجازت نہیں کہ وہ خود ان مسائل کو دریافت کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑی ہو ہاں اگر وہ اس میں کوتاہی برتتا ہے تو پھر اُسے اجازت ہے اور اجازت کیا بلکہ اُس کا فرض ہے کہ استفتا دے کے لئے خود جائے اگر اس بارے میں شوہر اُسے منع کرتا ہے تو

عاصی اور گنہ گار رہو گا جب فرائض کا علم سیکھ چکے تو اس سے زیادہ تعلیم کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ شوہر کو حق ہے کہ وہ اجنبی اور غیر مردوں کو اس کے پاس نہ آنے دے اور بازاروں اور مسجدوں میں جانے سے اسے روکے۔

یہاں ہم اس بات کی طرف آپ کی نگاہ مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ غزالی ایک لمحہ کے لئے بھی اجنبی عورت کے ساتھ مرد کی تنہائی و خلوت کو روا نہیں رکھتے۔ اس باب میں علما اور غیر علما کی کوئی تمیز نہیں اُن کی رائے میں صرف بوڑھی عورتوں کو ہی مساجد میں جانے کی اجازت ہے اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد باسعادت میں عورتوں کو مسجدوں میں جانے کی اجازت و رخصت تھی لیکن غزالی کا خیال ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِن زمانے کی بے ہودگیوں اور بدعنوانیوں کا مشاہدہ کرتے تو معلوم نہیں عورتوں پر کیا کیا کڑی پابندیاں عائد کرتے۔

(۶) جب کسی کی کئی بیویاں ہوں تو اُن کے ساتھ مساوی سلوک کرے سفر میں جاتے وقت اُن میں سے اگر کسی کو ساتھ لے جانا چاہے تو اُن میں قرعہ اندازی کرے۔ نفقہ اور شب باشی میں ہر حال میں عدل و انصاف سے کام لے، رہی محبت اور جماع میں مساوات سو یہ ناممکن اور محال ہے

(۷) جب میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے اور کسی صورت بھی معاملہ سلجھانے میں نہ آئے تو اس حالت میں خواہ دونوں کی طرف سے زیادتی ہو خواہ تنہا شوہر کی طرف سے، دو حکم اور ثالث مقرر کئے جائیں ایک بیوی کے عزیزوں سے دوسرا شوہر کے عزیزوں میں سے تاکہ وہ مابہ النزاع امر کی چھان بین کریں اور ممکن ہو تو صلح و صفائی کی فضا پیدا کریں۔ اگر زیادتی شوہر کی طرف سے ہو تو بیوی کو ہرگز اس امر کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ شوہر کی اصلاح و تادیب خود اپنے ہاتھ میں لے کیونکہ اس حالت میں اس بات کا قوی خدشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بیوی کو شوہر پر برتری اور بالادستی حاصل ہو جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کی باہمی نزاع

کبھی ختم نہ ہو گی۔

جب نافرمانی اور بغاوت بیوی کی طرف سے ہو تو شوہر کو حق ہے کہ وہ اُسے سزا دے اور جبر و قہر کے ساتھ اُسے طاعت و راستی کی راہ پر لائے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سزا میں بھی تدریج کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ پہلے اُسے سمجھایا بجھایا جائے اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ڈرایا دھمکایا جائے اگر یہ بھی سود مند نہ ہو تو اُس سے بستر میں علیحدگی برتی جائے اور اُس کی طرف پشت کر کے سویا جائے اور ایک سے تین دن تک اُس سے گفتگو اور کلام نہ کی جائے اگر اس سے معاملہ سدھرنے میں نہ آئے تو ہلکی سی بدنی سزا دینی چاہئے۔ جس سے اُسے درد کے ساتھ عبرت تو ہو لیکن نہ تو اُس کی ہڈی پسلی ٹوٹے اور نہ اُس کے جسم سے خون بہے۔ چہرے پر مارنا کسی حال میں بھی روا نہیں۔

(۸) بیوی کی عفت و عصمت پر خاص نگاہ رکھے اس لئے کہ یہ امور شوہر کے ذمے واجب ہیں۔ اس باب میں غزالی کا کلام سادگی اور بھولے پن کا مرقع ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں گے کہ جماع کے وقت کے لئے انھوں نے دعاؤں کا ایک مجموعہ بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض محدثین کے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ وہ جماع کے وقت اتنی بلند آواز سے تکبیر کہتے تھے کہ پاس پڑوس کے رہنے والوں تک اُن کی آواز پہنچتی تھی۔ میں حیران ہوں کہ قطع نظر اس بات سے کہ [illegible] وقت ادعیہ اور اوراد کا متحمل کیسے ہو سکتا ہے کیا اتنے میں اس کے جذبات کی انگیٹھی بھی سرد نہ ہو جائے گی۔

(۹) طلاق گو مباح ہے لیکن اس پر بھی تکلیف اور ایذا کا دوسرا نام ہے لہذا بیوی کو طلاق کی اذیت پہنچانا یا تو اس کے ہی کسی گناہ اور قصور کی وجہ سے ہونا چاہئے یا اپنی کسی اشد شدید حاجت و ضرورت کے مدنظر۔ بیوی کا گناہ یہ ہو سکتا ہے کہ مثلاً شوہر کو تنگ کرے یا بد خلق، بدزبان اور بے دین ہو۔ غزالی کی رائے میں بیوی کے حق پر والد کا حق مقدم اور فائق ہے پس جب کسی جائز وجہ سے خسر بہو کو پسند نہیں کرتا تو بیٹے کے لئے جائز ہے

ممکن ہے جو وجہ خسر کی نظر میں جائز ہو وہ خود اس کے خاوند کی نظر میں اہمیت نہ رکھتی ہو۔

کہ وہ بیوی کو طلاق دیدے۔ اگر شوہر بیوی کو بے وجہ تنگ کرتا ہے تو بیوی کو حق ہے کہ وہ کچھ دے دلاکر اس سے گلو خلاصی کرالے، شوہر کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسے موقع پر بھاؤ تاؤ کرنے لگے اور جو کچھ دیا ہے اس سے زائد کا مطالبہ کرے کیونکہ اس میں بیوی کی دل آزاری اور دل شکنی ہے۔ وہ لاکھ عورت سہی لیکن تجارت کا مال تو نہیں۔ جب بیوی طلاق کا مطالبہ کرے تو شوہر کو چاہیے کہ نرمی شرافت اور دم دلاسے کے ساتھ اُسے ٹالتا رہے اور تلافیِ مافات[1] کے طور پر اُسے کچھ ہدیہ اور سوغات لاکر دے۔ نکاح اور طلاق کے وقت بیوی کے رازوں کا افشار ہرگز مناسب نہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غزالی نے عورت کے مسئلے پر صرف بیوی کی حیثیت سے نگاہ ڈالی ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کے اجتماعی اور معاشرتی حقوق کا کہیں ذکر نہیں کیا، شادی بیاہ سے پہلے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف اُن کے کلام میں کہیں کوئی اشارہ تک بھی موجود نہیں۔ شادی شدہ لڑکی کی تعلیم کا بھی ذکر کیا تو صرف اُسے فرائض تک محدود رکھا حالانکہ یہ نہایت سہل الحصول مقصد ہے اور اس کے جواز میں کوئی نزاع اور کوئی اختلاف ہی نہیں۔ یہ ساری باتیں لازمی نتیجہ ہیں اُس نظریہ کا جو غزالی نے ابتدا ہی میں عورت کے متعلق ذہن میں قائم کرلیا ہے کہ وہ تابع ہے متبوع نہیں اور جس نے اُسے متبوع سمجھا اس نے شیطان کی راہ اختیار کی۔

(۱۰)

بیوی کے ساتھ نرمی کا سلوک

عورت کی حفاظت وصیانت کے لئے غزالی نے ان ہی حقوق کے بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی مرد کو نصیحت و تلقین بھی کی ہے کہ ہر حال میں اُس کے ساتھ نرمی اور شرافت کا سلوک کرے التبر المسبوک میں کہتے ہیں :-

---

[1] ص ۱۲۱

"جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ نرمی اور پیار کا سلوک کرنا چاہے اُسے سوچنا چاہیئے کہ بیوی اُسے طلاق دینے پر قادر نہیں ہے اور وہ جب چاہے اُسے طلاق دے سکتا ہے بیوی بغیر شوہر کی اجازت کے اُس کے مال سے ایک تنکا بھی نہیں سرکا سکتی لیکن شوہر اپنے مال میں جیسا تصرف چاہے کر سکتا ہے۔ جب تک وہ اس کے حبالۂ عقد میں ہے دوسرا شوہر نہیں کر سکتی لیکن شوہر اس کے ہوتے ہوتے بھی دوسری بیوی لانے کا مجاز ہے۔ وہ اس سے ہر وقت سہمی رہتی ہے لیکن شوہر کے دل میں اس سے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شوہر کی خندہ روئی اور نرم کلامی ہی کو بڑی بات سمجھتی ہے لیکن بیوی کتنی ہی جان جوکھوں میں ڈالے شوہر کو خوش نہیں کر سکتی۔ بیوی نے اس کی خاطر اپنے والدین اور خویش واقارب سب کو چھوڑا ہے لیکن شوہر کو بیوی کی خاطر کسی سے جدا نہیں ہونا پڑا۔ وہ جب چاہے گھر میں کئی لونڈیاں رکھ سکتا ہے لیکن بیوی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ اُس کی اجازت کے بغیر کسی کی طرف دیکھ بھی سکے۔ بیوی ہمیشہ اُس کی مطیع اور خدمت گذار رہتی ہے لیکن شوہر ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کی خدمت نہیں کرتا۔ جب یہ بیمار ہوتا ہے تو بیوی اُس کی تیمارداری میں اپنے آپ کو وقف کر دیتی ہے لیکن اگر بیوی ہلک بلک کر مر بھی جائے تو شوہر کو کوئی غم اور قلق نہیں ہوتا۔"

میں سمجھتا ہوں اس تمام شاعرانہ نصیحت فرمائی کی دیوار اس مفروضے پر قائم ہے کہ مرد عورت پر حکومت اور بالادستی رکھتا ہے اور عورت کی حیثیت محض ایک عضو معطل کی ہے ظاہر ہے کہ ہر مرد کو یہ غلبہ اور تسلط حاصل نہیں ہو سکتا اور ہر عورت عضو معطل نہیں ہو سکتی لیکن مذکورہ بالا نصیحت و تلقین میں غزالی کا عذر بہانہ یہ ہے کہ زمام اقتدار عموماً مرد ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور عورت مرد ہی کے چشم و ابرو کے اشارے پر ناچتی ہے۔ رہی اس کے خلاف کوئی صورت سو وہ شاذ و نادر ہی کہیں پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ قاعدہ کلیہ اکثریت ہی کے لئے وضع کیا جاتا ہے شواذ کے لئے نہیں۔

غزالی کی مبتنیہ باتوں میں یہ باتیں بلا شبہ درست اور صحیح ہیں کہ مرد عورت کا حاکم و

آقا ہے وہ اگر چاہے تو پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی دوسری بیوی لا سکتا ہے گھر میں بلا روک ٹوک جو تصرف چاہے کر سکتا ہے۔ واقعی بیوی اس کی خاطر اپنے والدین اور خویش و اقارب کو خیر باد کہتی ہے لیکن شوہر کو اس کی خاطر دنیا کے کسی فرد کو چھوڑنا نہیں پڑتا

(۱۱)

بیوی کے فرائض

غزالی کے قول کے مطابق نکاح ایک گونہ غلامی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ بیوی گویا شوہر کی غلام ہے اُسے چاہیئے کہ جہاں تک بن پڑے شوہر کے جائز مطالبات کو پورا کرے۔ اب آپ بیوی کے فرائض کی ایک مختصر فہرست ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) وہ گھر میں پردہ نشیں رہے اپنا چبت اور دھیان چرخے میں رکھے، چھت پر چڑھ کر ہمسایوں کے گھروں میں زیادہ تاک جھانک نہ کرے۔

(۲) ہمسایوں سے بہت کم کلام کرے صرف کسی انتہائی ضرورت کے وقت ہی ان کے گھروں میں جائے۔

(۳) شوہر کی موجودگی اور غیر موجودگی دونوں میں اُس کی عزت کا خیال رکھے، تمام امور میں اُس کی دل جوئی اور مسرت کو اپنا شیوہ و شعار بنائے۔ اپنی ذات اور شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے۔

(۴) بغیر شوہر کی اجازت و رخصت کے گھر سے باہر قدم نہ نکالے جب اجازت سے بھی جائے تو ژولیدہ وضع و ہیئت کے ساتھ ویران اور کم ہجوم رستوں سے جائے، بازاروں اور سڑکوں سے نہ گذرے۔ اس بات کی کوشش کرے کہ نہ تو کوئی غیر محرم اُس کی آواز سُنے اور نہ اُسے پہچان سکے۔

(۵) اپنی ضرورت سے شوہر کے کسی دوست سے بات چیت کرنی پڑے تو اُسے جاننے پہچاننے کا موقع نہ دے۔ جس شخص کے متعلق گمان ہو کہ وہ پہچانتا ہے یا یہ اُسے پہچانتی ہے

اُس کے سامنے اجنبی اور ناآشنا بن جائے۔

(۶) جب شوہر کا کوئی دوست گھر پر دستک دے اور وہ موجود نہ ہو تو اپنی اور شوہر کی غیرت و حمیت کا پاس و لحاظ رکھے اور اُس سے اُس کا نام اور پتہ نشان دریافت نہ کرے اللہ نے اُس کے شوہر کو جتنا کچھ دیا ہے اُسی پر قناعت و اکتفا کرے۔

(۷) اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے حق پر شوہر کے حق کو مقدم اور فائق سمجھے۔

(۸) ہر وقت صاف ستھری اور بن سنور کر رہے تاکہ شوہر جب چاہے اُس سے متمتع اور بہرہ اندوز ہو سکے۔

(۹) اولاد کے ساتھ محبت اور پیار کو اپنا شیوہ بنائے۔

(۱۰) بچوں کو بُرا بھلا کہنے اور شوہر کے ساتھ سوال و جواب کرنے میں محتاط ہو۔

(۱۱) گھر میں جتنا کام انجام دے سکتی ہے اُس میں کمی اور کوتاہی نہ کرے۔

(۱۲) نہانے کے لئے حمام میں نہ جائے الّا یہ کہ گھر میں غسل خانہ نہ ہو اور وہ ایام نفاس سے پاک ہونا چاہتی ہے یا کسی اور مرض کی وجہ سے حمام میں اُسے غسل کرنا ناگزیر ہے تو ایسی حالت میں بھی جائے تو اپنے اوپر کوئی بڑی اور ساتر چادر لے کر جائے۔

(۱۲)

ادیبوں اور انشا پردازوں کے علوم و آداب

ادیبوں اور انشا پردازوں کے لئے غزالی نے جو آداب وضع کئے ہیں اُن سے اس امر پر خاص روشنی پڑتی ہے کہ اُن کے ہاں زندگی کا تصور اور تخیل کیا تھا اور ہر بات میں خوش سلیقگی اور حسن ترتیب کے وہ کس قدر دلدادہ اور شیفتہ تھے، ایک کاتب اور ادیب کے لئے علم و آگہی کے جو حدود انھوں نے مرتب کئے ہیں، اُن سے فن انشا میں اُن کے زاویۂ نگاہ کو بآسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے موجودہ زمانے میں جرنلزم اور صحافت کی مستقل درسگاہیں بھی ایسے ہی مقاصد کے لئے وجود میں آئی ہیں۔

غزالی ایک دبیر و کاتب کے لئے مندرجہ ذیل امور کا علم ضروری قرار دیتے ہیں

(۱) اُسے زمین میں پانی کی گہرائی اور قرب و بعد کا بخوبی علم ہو۔

(۲) موسم گرما اور سرما میں دن اور رات کے بڑھنے گھٹنے اور سورج، چاند، ستاروں کے سیر و حرکت سے پوری واقفیت ہو۔

(۳) حساب، ہندسہ اور جغرافیہ میں کامل دستگاہ رکھتا ہو۔

(۴) موسموں کے اثرات اور کسانوں کے مناسب و سازگار امور سے پوری طرح باخبر ہو۔

(۵) فن طب اور صیدلیہ میں خاصی درخور رکھتا ہو۔

(۶) شمالی اور جنوبی ہواؤں کو پہچانتا ہو،

(۷) علم شعر اور قوافی پر خاص نگاہ ہو۔

(۸) سبک روح اور خوش لقار ہو۔

(۹) قلم بنانے اُسے قط لگانے اور قلم اٹھانے اور رکھنے کا اُسے قوی ملکہ اور سلیقہ ہو۔

(۱۰) قلم کی بے راہ رویوں اور بے لگامیوں سے اپنے تئیں بچا سکتا ہو۔

(۱۱) جو بات ذہن میں آئے اُسے زبان قلم سے ظاہر کر سکتا ہو۔

(۱۲) حروف کی نوک پلک کو پہچانتا ہو۔

(۱۳) خوش خط ہو اور ہر حرف کو اس کا پورا پورا حق دے سکتا ہو۔

ان امور کے علاوہ غزالی نے کشیدہ اور غیر کشیدہ حروف کی صورتیں بھی دی ہیں ساتھ ہی عربی، فارسی اور عبرانی قلموں کے بنانے اور تراشنے کا طریقہ۔ قط زن کی صلابت، کاغذ کی برابری، صفائی اور چکناہٹ، خوش خطی کے لئے حروف کی ہم آہنگی اور تساوی وغیرہ سے بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں صرف اُن ہی کے زمانے کے ادبا و کتاب کے آرار و افکار کی ترجمانی کرتی ہیں۔

---

(۱۳)
سلاطین کے فرائض

امرا، وسلاطین اور اُن کے حقوق و واجبات کا ذکر غزالی اکثر کرتے ہیں۔ اسی تالیف میں محتسب کے حقوق کے ضمن میں آپ ملاحظہ کریں گے کہ عوام الناس اور امراء وسلاطین کے طریق اصلاح میں اُن کے ہاں کیا فرق ہے۔ اس موضوع پر ایک خاص کتاب التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک لکھ کر انھوں نے سلطان محمد بن ملک شاہ کی خدمت و بارگاہ میں پیش کی لیکن چونکہ ہم اس کتاب پر پہلے تبصرہ اور ریویو کر چکے ہیں اس لئے اب اعادہ و تکرار کی کوئی ضرورت و حاجت نہیں سمجھتے۔

غزالی کی رائے میں بادشاہ کے مناسب یہ ہے کہ وہ دن کو چار حصوں میں تقسیم کرلے ایک حصہ عبادت وطاعتِ الٰہی کے لئے دوسرا امور سلطنت کی انجام دہی مظلوموں اور بے نواؤں کی دادخواہی، علماء اور دانشمند لوگوں کی مدد سے کاروبار سلطنت کی چھان بین، رعایا کی خبر گیری اور دیکھ بھال، احکام وفرامین کے نفاذ خط وکتابت، اور ادھر ادھر سفراء کے روانہ کرنے کے لئے، تیسرا اکل وشرب اور لذائذ دنیا سے تمتع اور بہرہ وری کے لئے چوتھا سیر وتفریح، شکار اور چوگان وغیرہ کھیل کر جی بہلانے کے لئے۔

غزالی بادشاہ کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیشہ نرد وشطرنج کھیلنے، شراب میں بدمست رہنے، اور شکار وچوگان بازی وغیرہ میں مشغول نہ رہے کیونکہ یہ امور کاروبار جہانبانی کے سراسر منافی ہیں اور چونکہ ہر کام کے لئے ایک مخصوص وقت ہوتا ہے لہذا اگر یہ وقت یونہی بے کار نکل گیا تو پھر بجز لکیر پیٹنے کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے لئے کبھی کبھار تھوڑی سی مقدار میں شراب پی لینا جائز ہے لیکن چونکہ اس بات کو غزالی کے پاک نظریات اور مسکرات کے خلاف متواتر وپیہم جنگ سے کوئی جوڑ میل نہیں لہذا بعید نہیں کہ کسی نے "ہمیشہ" کا لفظ اپنی طرف سے بعد میں اضافہ

کردیا ہو یا التبر المسبوک میں بجوو غزالی سے سہواً درج ہو گیا ہو، غزالی کی رائے میں بادشاہ کو ہمیشہ مندرجہ ذیل اصول کا پاس ولحاظ رکھنا چاہیئے۔

(۱) حکومت واقتدار کی اہمیت ونزاکت سے واقف ہو اور جانتا ہو کہ سعادت و شقاوت کا سارا معیار نیک عملی اور بدکرداری ہے۔

(۲) صرف اپنا ہی ہاتھ ظلم سے کھینچنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنے خدام مصاحبین اور عمال کو بھی ظلم سے باز رکھے کیونکہ وہ تنہا اپنے اعمال کے لئے مسئول نہیں بلکہ ان کے اعمال کے لئے بھی جواب دہ ہے۔

(۳) تکبر نہ کرے کیونکہ اس سے غضب وانتقام کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

(۴) اپنے آپ کو بھی پبلک کا ایک فرد سمجھے اور جو بات اپنے لئے پسند نہ کرتا ہو وہ عامۃ المسلمین کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

(۵) جب دروازے پر حاجتمندوں کا ہجوم ہو تو نوافلِ عبادت ترک کرکے ان کی حاجت روائی اور کاربراری کرے۔

(۶) عمدہ خوراک، پوشاک اور ایسی ہی دوسری بے ہودہ خواہشات کی تکمیل کا اپنے آپ کو عادی وخوگر نہ بنائے بلکہ تمام امور میں قناعت کو ملحوظ رکھے کیونکہ جذبہ قناعت کے بغیر عدل وانصاف متصوّر ہی نہیں۔

(۷) جب تک رفق وملائمت سے کام چل سکتا ہو جبر وتشدد سے پرہیز کرے۔

(۸) شرعی احکام کا اتباع اور پیروی کرکے رعیّت کو اپنے سے خوش رکھنے کی کوشش کرے

(۹) نامشروع طرق سے کسی کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

(۱۰) جب رعیت کسی مصیبت اور تنگی کا شکار ہو تو اس کی امداد واعانت میں کوتاہی نہ کرے جب قحط وگرانی ملک میں پھیل جائے تو خزائن وذخائر کے منہ کھول دے اس سے رعیت کے دلوں میں اس کی اطاعت وفرماں برداری کا جذبہ مستحکم ہوگا اور ذخیرہ اندوزوں کی امیدوں پر پانی پھر جائے گا اور وہ آئندہ ایسی ناشائستہ حرکات سے باز رہیں گے۔

جب رعیت بے ہودہ اور لایعنی حرکتوں پر اُتر آئے تو غزالی ایسے وقت میں بادشاہ کے جبر و تشدّد اور دار و گیر کے مخالف نہیں بلکہ بادشاہ کو اس امر کی نصیحت و تلقین کرتے ہیں کہ وہ پبلک کے دلوں میں ایسا خوف اور ایسا دبدبہ ڈالے کہ اُس کا نام سنتے ہی وہ لرزہ براندام ہو جائیں ایک مقام میں کہتے ہیں :-

"ہمارے زمانے کا بادشاہ سیاست داں اور پر ہیبت ہونا چاہیئے کیونکہ اس زمانے کے لوگ پرانے لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔ بے حیائی، سفاہت، سنگ دلی اور بغض و عداوت اس زمانے کے لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر خدا نخواستہ بادشاہ بھی کمزور اور بے سیاست ہوا تو ملک تباہ و تاراج ہو جائے گا۔ اور اس سے دین اور دنیا دونوں میں نقص اور خلل واقع ہوگا۔

مذکورۃ الصدر کلام کی روشنی میں سیاست کا مفہوم یہ ہوا کہ بادشاہ میں حکمت و دانائی کے ساتھ شدت و سختی کا ملکہ بھی ضرور ہونا چاہیئے تاکہ تخریب پسند عناصر کا قلع قمع کر سکے

(۱۴)
وزراء کے حقوق

بادشاہ کا فرض ہے کہ وزیر کے ساتھ تین امور کا سلوک کرے۔

(اول) جب اُس سے کوئی غلطی یا لغزش ہو تو سزا میں عجلت نہ برتے

(دوم) جب اُس کی خدمت و چاکری میں وزیر، مالدار اور غنی ہو جائے تو اُس کی دولت و ثروت پر للچائی ہوئی نگاہ نہ ڈالے۔

(سوم) جب وہ کوئی مطالبہ کرے تو اُس کے پورا کرنے میں توقف اور تاخیر نہ کرے۔

مندرجہ ذیل تین باتوں کا اُسے حق دے

(اول) جب وہ چاہے بلا روک ٹوک باریاب ہو سکے

(دوم) اُس کے بارے میں کسی مفسدہ پرداز کی بات نہ سُنے۔

(سوم) راز کی کوئی بات اُس سے نہ چھپائے کیونکہ آمدنی کا نگراں اور انچارج وہی ہے اور

خزائن کے ساتھ ممالک و صوبجات کی آبادی و مرفہ الحالی بھی اسی کی ذات پر موقوف ہے
وزیر کا فرض ہے کہ

(اول) وہ خیر کا دل و جان سے عاشق اور شر کا بہمہ وجوہ دشمن ہو۔

(دوم) جب بادشاہ میں رعیت پر شفقت کا جذبہ پائے تو اس کی امداد اور حوصلہ افزائی کرے

(سوم) جب بادشاہ میں ظلم و جور کے رجحانات محسوس کرے تو نہایت رفق و ملاطفت کے ساتھ اُسے عدل و انصاف کی راہ پر لائے۔

جس بادشاہ کی خدمت میں غزالی نے اپنی تالیف پیش کی ہے اُسے نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"آپ کو جاننا چاہیئے کہ حکومت و ملک کے بقاء و دوام کے لئے بادشاہ اور وزیر دونوں کا وجود ناگزیر ہے لہذا آپ کو وزیر پر اس امر میں بھروسہ اور اعتماد کرنا چاہیئے کہ جو بات بھلائی اور بہبودی کی ہوگی وہ صرف اُسی کو عمل میں لائے گا۔"

رعیت کے ساتھ معاملہ اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات و روابط کی استواری و استحکام کے لئے جن آداب و قواعد کی ضرورت ہے ان کے مقابلے میں وزراء و سلاطین کے یہ بیان کردہ فرائض یقیناً نہایت مجمل اور بہت مختصر ہیں لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غزالی نے ان آداب کے وضع کرنے میں شریعت ہی کو سرچشمہ و ماخذ قرار دیا ہے اور متقدمین فقہاء نے خلفاء و وُلات کے لئے جو مخصوص احکام استنباط کئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں غزالی بھی ان کی خلاف ورزی کرنا پسند نہیں کرتے۔

۱۵

ظالم بادشاہوں کے ساتھ برتاؤ

ظالم امراء و سلاطین کے ساتھ معاملے اور برتاؤ میں غزالی نے جس رائے کا اظہار کیا ہے اس سے اخلاق کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً جو شخص ان سے

ہدیہ و بخشش قبول کرے۔ غزالی اُس پر لازم گردانتے ہیں کہ وہ اس امر میں غور کرے کہ یہ مال و ثروت اُن تک کن کن ذرائع اور کن کن طرق و وسائل سے پہنچی ہے؟ وہ کیا وجوہ و اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ امراء و سلاطین اُس کو عطا و بخشش خسروانہ کے ساتھ نواز رہے ہیں؟ اُسے عطیہ قبول بھی کرنا چاہئے تو کتنی مقدار میں؟ کیا جب اُس کے اور اُس کے دوسرے شریک حال لوگوں کے استحقاق کے مابین مقابلہ و موازنہ کیا جائے تو بھی وہ اس داد و دہش اور صلہ و انعام کا مستحق قرار پاتا ہے یا نہیں؟ آگے چل کر کہتے ہیں اگر اس بات کا کلی یقین ہو کہ بادشاہ کی ساری آمدنی حرام ہے تو اس کے ہاتھ سے کچھ قبول کرنا بھی حرام ہے۔ تقویٰ و ورع کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی ظالم کے ہاتھ سے مطلقاً کچھ قبول نہ کیا جائے۔ اگر وہ اس کی قدرت و استطاعت نہ رکھتا ہو تو صرف اتنا لے لینے پر اکتفا کرے جس کے متعلق اسے کامل یقین ہو کہ یہ حلال ہے

ظالم و قاہر بادشاہوں کے ہاں آمد و رفت اور نشست و برخاست رکھنا قطعاً ممنوع ہے صرف دو عذر ایسے ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر اس امر کی اجازت و رخصت دی جا سکتی ہے اول بادشاہ کی طرف سے حاضر ہونے کی شدید پابندی ہو اور یہ شخص جانتا ہو کہ اگر میں نے حاضر ہونے میں تساہل یا کوتاہی کی تو خود مجھے اذیت پہنچے گی یا عام رعیت کی طاعت اور وفاداری میں کوئی انتشار یا فرق رونما ہو گا سو اس حالت میں اُس کے لئے حاضر ہونا ضروری ہے مگر اس لئے نہیں کہ اس میں بادشاہ کے حکم کی بجا آوری مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں خلقِ خدا اور عامۃ الناس کا مفاد اور انہیں کی مصلحت ملحوظ ہے اور اس کی غیر حاضری سے پورے ملک کا امن اور نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔ دوم اُن کے یہاں جانے سے اپنے علاوہ کسی دوسرے مسلمان کی طرف سے ظلم کا دفاع یا بطریق تظلم و داد خواہی خود اپنی ہی ذات کی طرف سے کوئی مدافعت مقصود ہو۔

جب کوئی ستم پیشہ بادشاہ آپ کی زیارت و ملاقات کے لئے آئے تو آپ کا فرض ہے کہ اس کے سلام کا جواب دیں، اس کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا بھی گو حرام نہیں لیکن اولی والنسب

یہی ہے کہ اگر وہ تنہا ہو تو اُس کی تعظیم کے لئے نہ اٹھا جائے۔ اثنائے گفتگو میں ضروری ہے کہ جن جن باتوں سے وہ نا واقف ہے اُن کے بارے میں آپ اُسے بصیرت دلائیں جن جن مظالم کا وہ ارتکاب کرتا ہے اُن کے نتائج بد سے آپ اُسے آگاہ کریں، جن جن امور میں وہ غفلت اور کوتاہی برتتا ہے اُن پر اُسے مطلع کریں۔

غزالی کی رائے میں افضل و بہتر یہی ہے کہ انسان سلاطین و امراء سے دوری اور کنارہ کشی اختیار کرے نہ وہ اُسے دیکھیں نہ یہ انھیں دیکھے۔ شاہی قاضیوں، شاہی کارندوں اور شاہی حشم و خدم کے ساتھ بھی بعینہ اسی برتاؤ کی تلقین کرتے ہیں۔ سلاطین و امراء کے تعمیر کردہ پلوں سڑکوں، مسجدوں، تالابوں، بازاروں کے باب میں بھی غزالی نے عجیب و غریب تفاصیل قلمبند کی ہیں۔ جو بات قدم قدم پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ غزالی اس بات کے پر زور داعی ہیں کہ انسان کو فتنہ و اضطراب کی مسموم فضا سے دور رہ کر خود اپنے ہی حال میں گم رہنا چاہئے۔

(۱۶)
اُخوت کے حقوق

اخوت سے مراد محبت و صداقت یا دوسرے وہ امور ہیں جن سے باہم الفت اور پیار پیدا ہوتا ہے۔ الفت غزالی کی رائے میں حسنِ خلق کا ثمرہ و نتیجہ ہے جس طرح سوءِ خلق سے باہم دشمنی، حسد و غیبت کے جذبات نشو و نما اور پرورش پاتے ہیں اسی طرح حسن خلق کی بدولت باہم محبت، تعلق و یگانگت کے رشتے مضبوط اور استوار ہوتے ہیں۔

غزالی کی رائے میں انسان کے لئے ناگزیر ہے کہ جہاں اللہ کی خاطر کچھ لوگوں سے محبت اور پیار کرے وہاں کچھ لوگوں سے صرف اُسی کی خاطر دشمنی اور بیر بھی رکھے۔

چونکہ محبت فی اللہ اور بغض فی اللہ کا مسئلہ نہایت دقیق اور مشکل تھا لہذا مزید وضاحت و تفصیل کے لئے انھوں نے محبت کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ اول جو اتفاقاً وجود و ظہور میں آئے

مثلاً ہمسائیگی، ہم مکتبی، ہم سفری یا ایک ہی بازار میں کاروبار یا ایک ہی بادشاہ کی مصاحبت و ہم نشینی، دوم جو قصد و اختیار سے وجود میں آئے اور قابل اعتبار قسم بھی یہی ہے کیوں کہ غیر ارادی اور غیر اختیاری افعال و اعمال پر ثواب و عقاب کا ترتّب نہیں ہوتا محبت سے مراد ہم نشینی، باہم اختلاط اور میل جول ہے، ظاہر ہے کہ انسان میل جول اسی سے بڑھائے گا جسے عزیز اور محبوب رکھے گا۔ کسی کو محبوب رکھنے کے بھی دو سبب ہیں یا تو محبوب کی ذات میں کوئی خوبی اور کشش موجود ہے یا اس کے واسطے سے کسی اور مقصد تک پہنچنا منظور ہے پھر یہ مقصد بھی تین حالتوں سے خالی نہیں یا تو خالصتاً دنیوی حظوظ و لذائذ پر مقصود و محصور ہے یا اس کا تعلق آخرت سے ہے یا تنہا اللہ کی ذات سے۔

کسی سے اُس کی ذات اور خوبصورتی کی وجہ سے تعلقِ خاطر

غزالی کہتے ہیں بعض اوقات کسی کی ذات سے یونہی محبت ہو جاتی ہے اس میں کسی موجودہ یا متوقع غرض اور فائدے کی آمیزش و آلائش نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ دونوں کے باطنی اور مخفی اخلاق و طبائع میں ایک گونہ ہم آہنگی اور مجانست ہوتی ہے۔ اُن کی رائے میں کسی سے اُس کے حسن و جمال کی وجہ سے عشق و شیفتگی رکھنا بھی اسی قبیل سے ہے غرضکہ عاشق و محب کی غرض پاک اور نیک ہو کیونکہ اگر فرض کر لیا جائے کہ شہوت و خواہش سرے سے ہی ناپید اور مفقود ہے اور دنیا میں کہیں اس کا وجود نہیں تو بھی حسن و جمال اپنے اندر ایک کشش اور جاذبیت رکھتا ہے اور سرتاپا عشق و محبت کا داعی[1] و منادی ہے۔ غزالی کہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے

---

[1] سبحان اللہ شعرا نے اس باب میں کیا کیا عجب طبع آزمائیاں کی ہیں مثلاً

منادی می کنند امروز زنار سر زلفش | کہ اے ایمان بیرو ہر کہ ایمان را نگہ دارد
مردماں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی
تا کے ملامت مژۂ اشکبارِ من | یک بار ہم نصیحتِ چشم سیاہ خویش
زلف است چشم و ابرو و رخسار نیستی | این چند فتنہ اند کہ در یک زمانہ اند

جذب و انجذاب کے مسئلے کو اُردو کے شاعر نے کس عمدگی اور خوبی سے بیان کیا ہے۔

عشق فولاد مرا حسن ترا مقناطیس | چھوڑے گا اُس کی کشش کا نہ یہ آہن دامن

جیسے پھلوں، پھولوں، سبزہ زاروں، سُرخی مائل سیبوں اور آبِ رواں کو دیکھ کر جی خوش کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے میں تنہا ان کی ذات ہی مقصود ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا مذموم یا ناشائستہ جذبہ دل میں موجود نہیں ہوتا چونکہ اس کا باعث صرف طبیعت فطرت اور ذاتی خواہش ہوتی ہے اس لئے یہ مباح ہے اور کسی مذمت اور تعریف کے لائق نہیں لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ کی محبت اس قسم کے تحت داخل نہیں ہے۔

دنیوی منافع کی خاطر محبت

بعض اوقات کسی سے محبت اس خاطر ہوتی ہے کہ اس کے واسطے سے کسی اور ذات تک دسترس اور رسائی ہو، مثلاً کوئی شخص بادشاہ یا اس کے مصاحبین و خواصِ بارگاہ سے اس لئے محبت کرتا ہو کہ ان کی بدولت مال و ثروت یا جاہ و منصب تک پہنچے۔

غزالی کہتے ہیں متوسّل الیہ یا مقصد کا فائدہ اگر صرف دنیا تک ہی محدود ہو تو ایسے شخص کی محبت، محبت فی اللہ کے قبیل سے نہیں ہو سکتی اگر دنیا تک محدود نہ ہو لیکن لوگ اس سے عموماً دنیوی فائدہ ہی مقصود قرار دیتے ہوں تو یہ بھی محبت فی اللہ سے خارج ہے۔ مثلاً شاگرد کی محبت اُستاد سے۔ ظاہر ہے کہ اُس کا محبوب اُستاذ نہیں بلکہ علم ہے، کیونکہ اُستاذ کی محبت سے مقصد یہی ہے۔

غزالی کی رائے میں اس محبت کی دو قسمیں ہیں مذموم اور مباح۔ اگر اس سے مقصود مذموم اغراض تک رسائی ہو، مثلاً معاصرین کو نیچا دکھانا، یتیموں کے مال پر ہاتھ صاف کرنا، عہدۂ قضا حاصل کر کے جمہور و عامۃ الناس پر ظلم کے کوڑے برسانا تو یہ محبت مذموم ہے اگر اس سے مقصود امر مباح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۳) غرضیکہ

کہتے ہیں جسے عشق سو وہ چیز ہے سودا ۔۔۔ جوں ذات خدا جس کی حسب ہے نہ نسب ہے

وللہ دَرّ مَن قال

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوی ۔۔۔ فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

جمالک فی عینی وحبک فی قلبی ۔۔۔ وذکرک فی فمی فاین تغیب (مترجم)

تک پہنچنا ہو تو یہ محبت بھی مباح ہے۔

اخروی منافع کی خاطر محبت

بعض اوقات انسان سے محبت اس کی ذات کے لئے نہیں بلکہ غیر کے لئے ہوتی ہے اور غیر کا فائدہ دنیوی نہیں بلکہ اخروی ہوتا ہے مثلاً شاگرد کی محبت استاذ سے اس خاطر کہ اس سے علم حاصل کرے اور اس سے اپنے اخلاق و اعمال کی درستی اور اصلاح کرے تو اس صورت میں گویا علم اور عمل دونوں سے اس کی غرض و غایت آخرت کی فوز و فلاح ہے تو ایسی محبت بھی محبت فی اللہ کے تحت داخل ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بیوی سے اس لئے محبت و پیار کرے کہ یہ دینی مقاصد (مثلاً طہارتِ اخلاق اور ولدِ صالح وغیرہ) تک پہنچنے کا واسطہ و ذریعہ ہے۔

دنیوی اور اخروی منافع کے لئے محبت

غزالی کہتے ہیں محبت الٰہی کے لئے ہرگز یہ شرط نہیں ہے کہ انسان دنیا کی کسی چیز سے کوئی محبت اور کوئی لگاؤ ہی نہ رکھے بلکہ اس کے برعکس جب کسی قلب میں محبت الٰہی اور محبت دنیا دونوں جمع ہو جائیں تو گویا ایک ہی شخص میں دو خوبیاں جمع ہو گئیں اور اس میں اس امر کی صلاحیت و استعداد پیدا ہو گئی کہ اللہ اور دنیا دونوں تک رسائی حاصل کر سکے۔ پس ایسا شخص جب کسی ذات سے ان دونوں باتوں کی خاطر محبت کرے گا تو وہ بھی محبت فی اللہ کرنے والوں کے زمرہ و جماعت میں شریک ہو جائے گا مثلاً کوئی شاگرد اس استاذ سے محبت کرے جس سے وہ علم دین پڑھتا ہے اور وہ استاذ ضرورت و حاجت کے وقت اس کی کچھ مالی امداد و اعانت بھی کر دیتا ہے۔

دنیا کو محبوب رکھنے میں بھی کوئی باک نہیں

ہم یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ غزالی ایک موقعہ پر کہتے ہیں۔

"جب آخرت کی سعادت و کامرانی محبت الٰہی کے منافی نہیں ہے تو صحت و عافیت، مالی

آسودگی و خوش حالی اور دنیوی عزت و وقار کی محبت و طلب محبت الٰہی کے منافی کیسے ہوسکتی ہے ؟ دنیا اور آخرت عبارت ہیں دو ایسی حالتوں سے جن میں سے ایک قریب اور دوسری ہم سے کچھ دور ہے، لہٰذا یہ بات کیسے معقول و متصور ہوسکتی ہے کہ انسان کل کا تو خیال رکھے لیکن آج کی فکر اور پروا نہ کرے حالانکہ کل کا خیال رکھنا بھی اس لئے ضروری ہے کہ وہ کل آج میں تبدیل ہونے والا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کل کے ساتھ آج کا خیال رکھنا بھی بدیہی اور ضروری ہے لیکن اتنی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیوی فوائد و منافع کی دو قسمیں ہیں۔ اول جو آخرت کے منافی اور اس کی راہ سے مانع ہیں اور یہی وہ منافع ہیں جن سے انبیاء نے ہمیشہ کنارہ کشی کی اور دوسروں کو ان سے ہمیشہ کنارہ کش رہنے کی تلقین کی۔ دوم وہ فوائد جو آخرت کی راہ میں روڑا نہیں بنتے مثلاً شرعی نکاح اور اکل حلال وغیرہ تو ایسے امور کے تمتع سے نہ تو انبیاء نے اجتناب و احتراز کیا اور نہ دوسروں کے لئے ان سے بہرہ ور ہونے میں کوئی مضائقہ اور کوئی باک ہے"۔

"اس میں کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں کہ ایک ہی ذات سے آپ کئی اغراض سے محبت کریں کیونکہ دنیوی اور اخروی اغراض کی یکجائی و اجتماع بہرحال مستبعد اور محال نہیں ہے۔ لہٰذا یہ محبت بھی منجملہ اقسام محبت الٰہی ہے"۔

ہم نے اس اقتباس کا درج کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ یہ نظریہ اپنی صحت و خوبی کے باوجود غزالی کے ان بقیہ نظریات کے متناقض ہے جن کے رُو سے وہ دنیا کو کوستے اور آخرت کو سراہتے ہیں اور جن کے پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ان کی نگاہ میں ایسی ہیچ پوچ اور ایسی ذلیل و حقیر ہے کہ اس سے کسی شریف آدمی کی کسی غرض اور کسی مقصد کی وابستگی متصور ہی نہیں۔

محبت للہ

بعض اوقات بغیر کسی فائدے کی چشم داشت اور توقع کے صرف للہ فی اللہ کسی کی

ذات سے محبت ہو جاتی ہے۔ محبت کے جملہ اقسام و درجات میں اسی کا درجہ بہت بلند ہے لیکن اس کی شناخت اور پہچان کٹھن اور مشکل ہے۔

محبت کا ترازو

غزالی بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات کسی سے محبت اُس کی ذات کی خاطر، بعض اوقات کسی دنیوی یا اخروی مقصد کی خاطر اور بعض اوقات بغیر کسی موجودہ یا متوقع فائدے کے صرف اللہ کی خاطر ہوتی ہے لیکن محبت کے مذموم و محمود اقسام سے قطع نظر خود نفس محبت کی علامات کیا ہیں؟ کونسا ایسا ترازو ہے جس سے ہم اس کا وزن کریں؟ کون سی ایسی کسوٹی ہے جس پر اسے پرکھیں! تاکہ محبت کرنے والوں کے درجات متعین کرنے میں ہمیں آسانی اور سہولت ہو۔

غزالی نے اس کے لئے ایک ایسا ترازو وضع کیا ہے جس سے نازک اور سبک تر ترازو شاید دنیا میں اور کوئی موجود نہ ہو۔ وہ کیا؟ زر و سیم۔ غور فرمائیے کہتے ہیں:۔

"جس کو کسی بادشاہ یا کسی حسین و جمیل سے محبت و گرویدگی ہوگی وہ لامحالہ ان کے مقربین اور خواص، حشم و خدم اور ان لوگوں کو بھی عزیز و محبوب رکھے گا جو انہیں عزیز و محبوب رکھتے ہیں لیکن محبت کا امتحان نفس کی بہرہ مندیوں اور لطف اندوزیوں سے ہوگا بعض اوقات محبت اس قدر غالب آجاتی ہے کہ اپنی ذات کی بہرہ مندی اور تسکین کا سوال ہی درمیان سے اُٹھ جاتا ہے اور عاشق و محب کی خواہش و آرزو محبوب ہی کی خواہش و آرزو کے تابع اور اسی میں گم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس مفہوم کو یوں تعبیر کیا ہے۔

ارید وصاله ویرید هجری
فاترك ما ارید لما یرید[1]

---

[1] میں اس کے وصال کا پیاسا ہوں اور وہ میرے ہجر و فراق کا، سو میں اپنی اس خواہش کو بھی اس کی خواہش پر قربان کرتا ہوں۔ اسی مفہوم کو ایک فارسی شاعر نے یوں تعبیر کیا ہے۔

میل من سوئے وصال و قصد او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست
مترجم

دوسرے نے کہا ہے؎

فما لجرح اذا ارضاکم الم[1]

بعض اوقات محبت کی خاطر پوری نہیں صرف جزوی قربانی کی جاسکتی ہے مثلاً محبوب کے ذمے مال میں سے نصف یا ثلث یا عشر لے لیا جائے اور باقی چھوڑ دیا جائے۔ تو گویا آخر میں یہی قرار پایا کہ سیم و زر اور مال و دولت ہی محبت کا ترازو ہے۔ عاشق کی نظر میں معشوق کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ عشق کی راہ میں کیا کچھ کھو سکتا اور کیا کچھ لٹا سکتا ہے جب عاشق کے دل کی پوری سطح پر محبت و عشق حاوی و محیط ہو جائے اس کی نگاہ میں محبوب کے علاوہ اور کوئی چیز بچتی ہی نہیں چہ جائیکہ اس کی کوئی قیمت اور کوئی وقعت ہو"

اس دنیائے وجود میں محبت کے منجملہ ترازوؤں کے مال و دولت کا ترازو سب سے نازک اور سبک تر ہے۔ گو غزالی نے بھی اسے بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن ان سے پہلے عرب کا مشہور شاعر جمیل کہہ چکا تھا۔

سلینی مالی یا بثین فانما ؎ یبین عند المال کل ضنین[2]

ایک بھائی کا حق دوسرے بھائی پر

غزالی کے وضع کردہ میزان محبت کے بیان کے بعد غزالی کے بیان کردہ حقوق اخوت کے ذکر و تفصیل کی کوئی ضرورت و حاجت باقی نہیں رہتی لہٰذا ہم صرف اسی بات کی طرف اشارے پر اکتفا کرتے ہیں کہ غزالی ایک بھائی کے دوسرے بھائی پر جان، مال، قلب اور زبان سبھی چیزوں میں حقوق قرار دیتے ہیں اور چونکہ محبت کبھی قوی اور کبھی ضعیف ہوتی ہے

---

[1] جب تم اس سے خوش ہو تو مجھے اس زخم کا کوئی بھی دکھ اور درد نہیں
فارسی کے شاعر نے کہا ہے۔

پیکان ترا بجان خریدار ؎ من مرہم دیگران نخواہم

[2] اے بثینہ مجھ سے مال و دولت مانگ کر مجھے آزما اس لئے کہ سخی اور بخیل کو پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے۔

لہٰذا اسی کے مطابق ان حقوق میں سے ہر حق کے درجات بھی مختلف اور متفاوت ہوتے رہیں گے۔

گنہ گار بھائی کے حقوق

اس مقام پر ایک عاصی، اور گنہ گار بھائی کے حقوق کے بارے میں بھی غزالی کی رائے کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ میرے خیال میں جہاں یہ رائے نہایت عمدہ اور قرین صواب ہے وہاں غزالی کے عہد و دور کے عام احوال و کوائف کی بھی ترجمان ہے کیونکہ ہم اس امر سے بخوبی واقف و آشنا ہیں کہ اُس زمانے کے لوگ عفو و درگذر کے جذبات سے عموماً عاری اور ایک دوسرے کے خلاف شکوک و شبہات اور طرح طرح کی بدگمانیوں کا عام شکار تھے۔

غزالی کی رائے ہے کہ دوستی اور صداقت کا رشتہ بھی نسبتی رشتے کی طرح قوی ہے اور یہ ہرگز زیبا نہیں کہ معصیت کی وجہ سے کسی رشتہ دار سے قطع علائق کر لیا جائے چنانچہ غور کیجئے حق قرابت اور تعلق نسبی کی رعایت کرتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ داروں کے باب میں کہا "فان عصوک فقل انی بری مما تعملون" اور یہ نہیں کہا کہ "انی بری منکم" غزالی کہتے ہیں:۔

چونکہ قرابت کی طرح اخوت بھی ایک بندھن ہے لہٰذا جب اخوت وجود میں آئے گی تو اپنے تمام حقوق اور تمام تقاضے اپنے ساتھ لائے گی جن کا ایفا ہر حال میں واجب اور ضروری ہوگا۔ ایفا کا بڑا مظہر یہ ہے کہ دوست کی ضرورت و حاجت کے وقت انسان اُس کے کام آئے اور چونکہ دینی ضرورت و حاجت مالی حاجت و ضرورت کی نسبت زیادہ شدید اور زیادہ قوی ہے اس لئے اگر دوست کی تنگ دستی اور تنگ حالی میں اُس کی دستگیری ضروری ہے تو دینی فقر و افلاس کے وقت اُس کی اعانت و امداد اور ضروری ہوئی لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اس حالت میں اُس سے قطع تعلق نہ کیا جائے بلکہ نہایت تلطف اور مروت کے ساتھ اُسے اس دلدل سے باہر نکلنے میں امداد دی جائے کیونکہ اخوت و صداقت کا مفہوم و معنی ہی یہی ہے کہ مصائب و حوادث میں ایک دوسرے کے کام آیا جائے

اور ظاہر ہے کہ دین میں خلل اور نقص سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا حادثہ ہے۔"

غزالی نے محسوس کیا کہ ممکن ہے کوئی شخص کہے

"کہ چونکہ معصیت پیشہ آدمی سے دوستی و مواخات کا رشتہ قائم کرنا ابتدا میں جائز نہیں، لہذا اگر کوئی شخص دوستی کے بعد معصیت کی راہ اختیار کرے تو اس کا مقاطعہ ضروری ہے کیونکہ جب کوئی حکم کسی علت کی وجہ سے وجود و ظہور میں آئے تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس علت کے زوال وارتفاع کے ساتھ حکم بھی زائل و ساقط ہو جائے۔"

چنانچہ اس کے جواب میں غزالی کہتے ہیں:۔

"شروع میں فاسق کے ساتھ مواخات سے معصیت اس لئے مانع ہے کہ ابھی فاسق کا کوئی حق ہی ثابت نہیں ہوا لیکن ایک عاصی و مذنب دوست کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف اور جدا ہے کیونکہ اس کی اخوت، معصیت پر زماناً مقدم ہے لہذا معصیت کی حالت میں بھی قرابت کی طرح اخوت کا رشتہ بھی باقی و استوار رہے گا اور معصیت کا وجود موجب و مستلزم قطع اخوت نہ ہوگا اور جب رشتہ باقی رہا تو لامحالہ اس کے جمیع حقوق و تقاضے بھی باقی رہیں گے۔"

غزالی اس پر اور اضافہ کر کے کہتے ہیں

"فاسق سے قطع تعلق کی نسبت اس کے ساتھ ربط و تعلق رکھنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ بے تعلقی سے جہاں باطل پر اصرار اور حق سے عناد زیادہ بڑھتا ہے وہاں باہمی ربط و ضبط اور صحبت و رفاقت سے حق کی جانب رجوع اور باطل کی راہ سے یکسوئی کے جذبات زیادہ قوی ہوتے ہیں۔"

حقیقت میں یہ باتیں اُن لوگوں کی پشتِ غفلت پر تازیانے کا حکم رکھتی ہیں جو اپنے اوپر دین کا رنگ غالب ظاہر کر کے باطل کوشوں سے بھاگتے اور کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، کاش وہ غور کرتے کہ ان کا یہ فرار ایک بہت بڑے فرض سے فرار کے مرادف ہے۔

(۱۷)

بغض فی اللہ

غزالی کہتے ہیں

"جو شخص محبت فی اللہ کرے گا وہ لامحالہ بغض فی اللہ بھی رکھے گا کیونکہ آپ اگر کسی سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کا مطیع و محبوب ہے تو ضروری ہے کہ جب وہ معصیت کی راہ اختیار کرے تو آپ اسے اچھا نہ سمجھیں کیوں کہ اب وہ اللہ کا مطیع و منقاد نہیں رہا۔ بلکہ عاصی اور مبغوض ہو گیا۔ منطق کا قاعدہ ہے کہ جب کسی سبب کی وجہ سے کوئی چیز محبوب ہو تو اس کی ضد کی وجہ سے وہی چیز مبغوض ہو جائے گی لیکن یہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ کسی سے بغض کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اُس سے بُعد و دُوری اختیار کی جائے"

عصیانِ اعتقادی

اللہ کے حکم کی مخالفت یا اعتقاد میں ہوگی یا عمل میں، پھر اعتقاد میں مخالف یا مبتدع ہوگا یا کافر، پھر مبتدع یا بدعت کی طرف داعی ہوگا یا اپنے عجز و قصور کی وجہ سے یا ارادہ و اختیار سے ساکت و خاموش، تو گویا فساد فی الاعتقاد کی تین قسمیں ہوئیں۔

اوّل ۔ کفر۔ کافر اگر محارب ہے تو اس کی سزا یا قتل ہے یا غلام بنا لینا۔ اگر ذمی ہے تو اس کا ایذا، بجز اس صورت کے جائز نہیں کہ اس سے اعراض کیا جائے اور اُسے حقیر و ذلیل سمجھا جائے۔

دوم ۔ مبتدع جو بدعت کی طرف داعی ہے ۔ اگر بدعت اس درجے کی ہے کہ اس کا ارتکاب کفر کا موجب ہے تو ایسے مبتدع کا معاملہ ذمی کی نسبت بھی زیادہ شدید ہے کیونکہ یہ نہ تو جزیہ ادا کرتا ہے اور نہ ہی ذمیوں کی طرح اس کے ساتھ کوئی معاہدہ ہے ۔ اگر بدعت کفر کے درجہ کی نہیں ہے تو اس کا معاملہ اللہ اور مبتدع کے مابین ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ایسے شخص کے ساتھ کافر کی نسبت زیادہ بدتر سلوک کیا جائے کیونکہ کافر کا شر غیر متعدی

اور اس کا شر متعدی ہے وہ بزعم خویش اپنے آپ کو حق کا علمبردار سمجھتا ہے اور واقع میں خلق خدا کی ضلالت اور گمراہی کا باعث بنتا ہے لہذا اس کی تعزیر میں بغض و عداوت، کنارہ کشی و یکسوئی، تحقیر و تذلیل اور طعن و تشنیع سے جس قدر بھی کام لیا جائے کم ہے اور لوگوں کو اس سے جتنا بھی برگشتہ اور متنفر کیا جائے اتنا ہی جائز اور درست ہے۔

سوم۔ عام مبتدع۔ جو بدعت کی طرف داعی نہیں ہے اور اس امر کا کوئی خوف اور کھٹکا نہیں کہ لوگ اس کی متابعت اور پیروی کریں گے سو اس کے ساتھ بہتر یہ ہے کہ درشتی اور سختی کا برتاؤ نہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو پند و نصیحت سے کام لیا جائے کیونکہ عوام کے دل بہت جلدی اثر قبول کرتے اور بہت جلدی پلٹ جاتے ہیں۔

عصیانِ عملی

عصیان عملی کی بھی تین قسمیں ہیں۔

(اول) جس سے لوگوں کو دنیا میں نقصان پہنچے اور یہی قسم سب سے شدید اور سب سے خطرناک ہے، مثلاً ظلم، غصب، شہادتِ کاذبہ، غیبت، نمامی یا معاصی خطرناک اس لئے ہیں کہ ان سے بنی نوع انسان کو ضرر اور نقصان پہنچتا ہے۔ ایسے گنہ گاروں کی بھی تین قسمیں ہیں اول جو کسی کو قتل کرتا ہے، دوم جو کسی کو مالی نقصان پہنچاتا ہے، سوم جو کسی کی عزت اور آبرو کو ٹھیس لگاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ تینوں قسم خطرناکی کے اعتبار سے باہم متفاوت ہیں لیکن ان کے مرتکب کی مذمت و نکوہش ہر حال میں مستحسن اور اس سے اعراض اور روگردانی ہر حال میں لازم ہے۔

(دوم) جس سے لوگوں کو دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں نقصان کا سامنا کرنا پڑے مثلاً ان چکلہ داروں اور بھڑوؤں کی بدعملی جس سے وہ شر و فساد کی زمین ہموار کرتے اور خلق خدا کو بے حیائی اور بے غیرتی کے قعر مذلت میں دھکیلتے ہیں۔ یہ قسم بھی خطرناکی کے اعتبار سے پہلی قسم کے قریب ہے لیکن درجے میں اس سے کچھ کمتر ہے

میں حیران ہوں کہ غزالی اس بدعملی کی دنیوی مضرتوں کے کیوں قائل نہیں[1]۔

[1] غزالی کے زمانے میں آج کی طرح آتشک اور سوزاک جیسے مہلک امراض کا وجود نہ تھا اس لئے انھوں نے زنا کی مضرت کو صرف آخرت کے ساتھ مخصوص رکھا اور ان کی نگاہ سے اس کی دنیوی مضرتیں اوجھل رہیں۔ عبدالوہاب نجار

سوم اُس شخص کی بدعملی جو شراب پی کر یا ترک واجب کر کے یا اپنی کسی اور مخصوص بدعملی کا شکار ہو کر اپنی ہی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ قسم پہلی دونوں قسموں کی نسبت کم خطرناک ہے لیکن اگر ایسے شخص کو بدعملی کا ارتکاب کرتے ہوئے کوئی پائے تو اس کا فرض ہے کہ اُسے باز رکھے چاہے زدوکوب اور اہانت و تذلیل ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو۔

نتیجہ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ محبت فی اللہ اور بغض فی اللہ کو غزالی کے قرار دادہ وجوبِ احتساب کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھیں اس لئے کہ ان مختلف ابواب کے تقابل سے ہم غزالی کے مردِ مؤمن کی نہایت واضح اور دیدہ زیب تصویر تیار کر لے سکتے ہیں۔

جو شخص احتساب، محبت فی اللہ اور بغض فی اللہ کے دواعی و مقتضیات سے بخوبی واقف ہو گا تنہا وہی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس معاشرے اور اس سوسائٹی میں اس کے فرائض کیا ہیں جس کی اصلاح و تطہیر کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ہر فرد مہذب اور تربیت یافتہ ہو تاکہ پہلے وہ اپنے حقوق و واجبات کو سمجھے پھر دوسروں کو حفظ جان و مال کی طرف دعوت دے اور ان اعمال و اخلاق سے باز رہنے کی تلقین کرے جو عام مسلمانوں کی اذیت کا باعث بنتے ہیں اور آخر میں اپنے قلب و جوارح سے اُس شخص کو حقیر اور ذلیل سمجھے جو بدعقیدہ یا ظالم ہے، ان تمام امور کو غزالی نے کمالِ دل نشیں اور کمالِ موثر پیرایہ و اسلوب میں بیان کیا ہے اور جا بجا آیات اور احادیث و اخبار سے اپنے نظریات و معتقدات کو قوی بناتے چلے گئے ہیں۔

(۱۸)

شادی بیاہ کے آداب

شادی بیاہ کے آداب کو غزالی آدابِ نکاح سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقتاً یہ تعبیر بھی درست ہے کیونکہ کتبِ تشریع میں نکاح سے مراد جماع نہیں بلکہ مطلق عقد ہے لیکن اصطلاحِ عام کی رعایت کرتے ہوئے ہم نے اسے آدابِ زواج ہی سے تعبیر کیا ہے۔

غزالی نے کئی ایسے آداب وضع کئے ہیں جو واقع میں نکاح کی طرف ترغیب دیتے ہیں لیکن ان میں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں وہی عام آداب ہیں جنھیں تقریباً ہر شخص جانتا ہے، صرف ایک ادب ایسا ہے جسے میں یہاں درج کرنا چاہتا ہوں اور تائید کرتا ہوں کہ واقعی وہ بڑا مہتم بالشان ہے اور وہ ہے نکاح کر کے اپنے آپ کو زندگی کے بارگراں کے تحمل کا عادی و خوگر بنانا چنانچہ نکاح کے فوائد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"پانچواں فائدہ یہ ہے کہ بیویوں کی رعایت اور پاس ولحاظ اُن کے حقوق کی حفاظت و بجا آوری، ان کی بے اعتدالیوں پر صبر، اُن کی طرف سے تکلیف کا تحمل، ان کی اصلاح کے لئے سعی و کوشش، دین کی طرف اُن کی رہنمائی، اُن کی خاطر کسب حلال کے لئے جد و جہد، اولاد کی تہذیب و تربیت غرضیکہ ان تمام امور میں ایک گونہ ریاضت و مجاہدۂ نفس ہے اور ان میں سے ہر امر بجائے خود نہایت اہم اور عظیم ہے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک چھوٹی سی سلطنت ہے جہاں صاحب خانہ حکمراں اور بیوی بچے رعیت ہیں اور یہ مسلّم ہے کہ حکومت کسی درجہ کی کیوں نہ ہو اپنے اندر یقیناً ایک فضیلت و خوبی رکھتی ہے اس سے وہی شخص فرار کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو ان ذمہ داریوں کے متحمل ہونے کے لائق اور اہل نہ سمجھتا ہو ورنہ غور فرمایئے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہو "عادل حکمراں کا ایک دن ستر برس کی عبادت پر بھاری ہے"۔ پھر فرمایا "دیکھو تم میں سے ہر شخص صاحب رعیت اور تم میں سے ہر فرد اس رعیت کے باب میں مسئول ہے"۔ ظاہر ہے کہ جو شخص تنہا اپنے ہی نفس کی اصلاح کے درپے ہے اُس کا مقام و مرتبہ اُس شخص سے فروتر ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کی اصلاح کا بھی بیڑا اٹھاتا ہے۔ جو شخص آرام و راحت کے بچھونے پر کروٹیں بدلتا ہے وہ اُس شخص کے مقابلے میں یقیناً حقیر اور ہیچ ہے جو دوسروں کی خاطر کانٹوں پر چلتا اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے پس معلوم ہوا کہ اہل و عیال کی کڑی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا حقیقت میں جہاد فی سبیل اللہ کے قائم مقام ہے چنانچہ

اسی لئے حضرت بشر نے کہا تھا "احمد بن حنبل جن تین باتوں کی وجہ سے مجھ پر بازی لے گئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے اور دوسروں کے لئے رزق حلال کو ڈھونڈتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ "انسان جو کچھ اپنی بیوی پر صرف کرتا ہے وہ صدقہ شمار ہوتا ہے اور وہ لقمہ جو شوہر بیوی کے منہ میں رکھتا ہے اس میں بھی شوہر کو اجر و ثواب ملتا ہے"

اس کے بعد غزالی کہتے ہیں

"بیوی کی تلخ و ترش باتوں پر صبر اور برداشت سے کام لینے میں نفس کی ریاضت، غیظ و غضب کی شکست اور عمدہ عمدہ اخلاق کی تعمیر مضمر ہے"

یہاں مجھے حضرت استاذ ڈاکٹر منصور فہمی کا وہ فقرہ رہ رہ کر یاد آتا ہے جسے وہ مختلف رسائل میں عموماً دہراتے ہیں "زندگی کا گرم و سرد" اور اس سے ان کی مراد زندگی کی وہ مشقتیں اور سخت کوشیاں ہیں جن سے گذر کر ہی کوئی شخص زندگی کی راحتوں اور آسائشوں تک پہنچ سکتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اہل و عیال کی ذمہ داریوں کا قبول کرنا واقعی میں ایک بہت بڑے معرکے کو سر کرنے کے لئے کمربستہ ہونا ہے۔ وہ راحت پسند اور عافیت کوش نوجوان جو ازدواجی زندگی سے بھاگتے اور اس کے نام سے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں حقیقت میں بزدل اور ڈرپوک ہیں اور کشمکش حیات میں قدم رکھنے کی ہمت و صلاحیت سے بالکل عاری اور یکسر کورے ہیں۔

(۱۹)
مظالم سے توبہ و براءت

ہم یہاں اس شخص کے بارے میں غزالی کی رائے بیان کرنا چاہتے ہیں جو اپنے گذشتہ مظالم سے نادم و شرمندہ ہے لیکن نہیں جانتا کہ "تلافی مافات" کے لئے اسے اب کیا کرنا چاہیئے؟ اسی سے آپ کو اس امر کا اندازہ ہو جائے گا کہ ایک انسان کو مختلف حقوق میں

کن کن امور کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کا آغاز غزالی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے کیا ہے (جس شخص نے اپنے کسی بھائی کی عزت و آبرو یا مال و دولت کو کوئی نقصان پہنچایا ہو اُس کا فرض ہے کہ اُس دن سے پہلے جس دن دینار و درہم کچھ بھی نہ ہوگا اُسے اپنا حق لے لینے کا پورا اختیار دیدے۔

آبروریزی

اگر ظلم کا تعلق عزت سے ہے تو غیبت کرنے والے کا فرض ہے کہ نادم و تائب ہو اور اپنے کیے پر افسوس کرے تاکہ اللہ کے حق سے بری ہو جائے پھر جس شخص کی غیبت کی ہے اُس سے معذرت خواہ ہو تاکہ اُس کے حق سے بھی سبک دوش ہو جائے۔ معذرت خواہی کے وقت ضروری ہے کہ وہ اپنی بدعملی پر سچے دل سے متاسف و محزون ہو تاکہ ریاکاری کی وجہ سے کسی نئی معصیت کا شکار نہ ہو جائے۔

مال میں خیانت

اگر ظلم کا تعلق مال سے ہے تو اُس کا فرض ہے کہ حرام کو الگ کر کے اُس کے مصرف پر غور کرے۔ اگر حرام معلوم العین ہے اور غصب یا امانت میں خیانت کے رستے سے آیا ہے تو اس کا معاملہ سہل ہے اگر معلوم العین نہیں تو پھر اُس کی دو صورتیں ہیں یا متماثلات میں سے ہوگا جیسے غلہ، نقود، تیل، عطریات اور دوسری مائعات یا متمائزات میں سے ہے جیسے، غلام، گھر اور کپڑے وغیرہ۔ اگر متماثلات میں سے ہو یا پورے مال میں خلط ملط ہو گیا ہو جیسے کسی شخص نے تجارت اور بیوپار سے دولت کمائی اور وہ جانتا ہے کہ نفع حاصل کرنے کے لئے میں نے سچ اور جھوٹ دونوں سے کام لیا ہے یا کسی نے تیل یا غلہ یا روپیہ کہیں سے غصب کیا ہے اور پھر ان کو اسی قسم کی ذاتی چیزوں میں گڈمڈ کر دیا ہے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں یا تو اسے مغصوب اشیا کی مقدار معلوم ہے یا نہیں ہے اگر معلوم ہے مثلاً جانتا ہے کہ تمام مال میں نصف حرام ہے تو اُس کا فرض ہے کہ یہ نصف الگ کر دے اگر نہیں جانتا تو اس میں علماء کے دو قول ہیں

اول جتنے کا یقین ہے اُسے علیحدہ کرے دوم جتنے کے متعلق غالب گمان ہے اُسے ذاتی مال سے خارج کر دے۔ رہے اعیان متمائزہ مثلاً گھرا اور غلام وغیرہ تو ان کے متعلق قاضی کا فرض ہے کہ بقدر حصہ و نسبت سب میں قیمت تقسیم کرے اگر یہ چیزیں باہم قیمتاً متفاوت ہیں تو ان حصہ داروں میں سے مثلاً طالب بیع سے قیمتی سے قیمتی گھر کی قیمت وصول کر کے اُس حصہ دار کو جو اپنا حصہ بیع نہیں کرنا چاہتا معمولی سے معمولی گھر کی قیمت کی مقدار دیدے اور فرق و تفاوت کا اندازہ عادت و عرف سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

مال حرام کا مصرف

جب مال حرام کو کسی نے الگ کر دیا تو وہ تین حالتوں سے خالی نہیں۔

(ا) اگر اس کا مالک متعین ہے تو اس صورت میں یہ مال اُس کے یا اُس کے ورثہ کے حوالے کیا جائے۔ اگر صاحب مال کہیں سفر میں ہے تو اُس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے اگر اس مال پر کچھ نفع ہو رہا ہے تو مالک کی واپسی تک ان منافع کو بھی الگ جمع کرتے رہنا چاہیے۔

(ب) اگر مالک غیر معین ہے اور معلوم نہیں کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے معلوم نہیں اُس کا کوئی وارث ہے یا نہیں غرضیکہ اُس کے یا اُس کے وارث کے متعین کرنے میں کامل مایوسی ہے تو اس حالت میں ظاہر ہے کہ مالک تک اس مال کا پہنچانا ناممکن اور محال ہے لیکن پھر بھی انتظار اور توقف سے کام لینا چاہیے تاکہ معاملہ بالکل واضح اور صاف ہو جائے اگر توقف اور انتظار کے باوجود بھی معین نہیں ہو سکا تو ایسا مال صدقہ اور خیرات کر دینا چاہیے یا خود فقیر اور صاحب حاجت ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنی ذات یا اپنے بیوی بچوں پر صرف کرے اگر اس حرام کے کئی مالک ہیں اور ہر فرد تک اس کا حصہ پہنچانا متعذر رہے مثلاً مال غنیمت میں خیانت تو اس کا بھی بعینہٖ یہی حل ہے کیونکہ مجاہدین کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کے بعد اُن سب کو پھر یکجا جمع کرنا بہت مشکل ہے یا فرض کیجیے کہ کوئی ایسا

کر بھی سکتا ہے تو ایک دینار کو ہزار یا دو ہزار پر تقسیم کیسے کرے گا؟

(ج) اگر خیانت مالِ فَی یا اُن اموال میں ہے جن کو عموماً عام مسلمانوں کی مختلف مصالح کے لیے جمع رکھا جاتا ہے تو ایسے مال کو پلوں مسجدوں اور سڑکوں کی تعمیر و مرمت میں صرف کر دینا چاہیئے۔

قتل نفس

اگر ظلم کا تعلق کسی ذات سے ہے مثلاً قتل و خون ریزی تو اول اس کی نوعیت پر غور کیا جائے اگر بھول چوک سے ہوا ہے تو خون بہا ادا کرنا چاہیئے اگر جان بوجھ کر کیا ہے اور موجب قصاص ہے تو قصاص ادا کرنا چاہیئے۔ قاتل کا فرض ہے کہ مقتول کے وارث پر سارا معاملہ کھول دے اور اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دے اب اُس کی مرضی ہے کہ درگذر کرے یا قتل کے بدلے قتل کرے غزالی اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ بعض جرائم ایسے ہیں جنھیں کسی حال میں بھی ظاہر نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے اظہار میں ایک جدید جرم کے رونما ہونے کا احتمال ہے۔ لہذا کہتے ہیں کہ مجرم کو ایسے جرم کے اعتراف کی اجازت نہیں ہے۔ رہی ایسے جرائم سے توبہ و برأت کی صورت، سو وہ یہ ہے کہ جس شخص کے باب میں جرم سرزد ہوا ہے اُس سے انتہائی مروت اور ہمدردی کا سلوک کیا جائے اور اپنے طور پر ریاضت و مجاہدہ نفس میں مشغول رہ کر توبہ و انابت سے کام لینا چاہیئے۔

(۲۰)

فرض احتساب

مسلمانوں کے عرف میں حسبتہ اور احتساب عبارت ہے نیکی کے ترک یا بدی کے ارتکاب کے وقت نیکی کی تلقین اور بدی کے روکنے سے، کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ احتساب ہر مسلمان پر جو اس کی قدرت رکھتا ہو واجب ہے چونکہ یہ فرض کفایہ ہے اس لیے

اگر تمام مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی اس کو انجام دیدیا تو تمام سے اس کا فرض ساقط ہو جائے گا، اگر کسی نے بھی انجام نہ دیا تو ہر اُس شخص پر فرض عین ہو جائے گا جو اس کی قدرت وطاقت رکھتا ہو، جب احتساب کے لئے قدرت شرط ہے تو ظاہر ہے کہ دوسروں کی نسبت ارباب اقتدار پر یہ فرض بطریق اولیٰ عائد ہوگا کیونکہ .. عام لوگوں کی نسبت اس کی بجا آوری کی ہمت واستعداد زیادہ رکھتے ہیں جب کوئی حکومت احتساب کا فرض کسی کے ذمے کیے تو محتسب کا فرض ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ کون سی بدی عام ہے تاکہ اُس کا سدباب کر سکے کون سی نیکی متروک ہے تاکہ دوبارہ اُس کے احیاء پر قادر ہو، ہر مسلمان کو اس امر کا حق پہنچتا ہے کہ وہ محتسب کے پاس جاکر اُن منکرات کی شکایت کرے جن کے باب میں تشدید و تنکیر لازمی اور ضروری ہے

احتساب اور قضا میں فرق یہ ہے کہ محتسب کے لئے جائز ہے کہ وہ شکایت کنندہ کی غیر حاضری میں بھی معروف و منکر کی تفتیش کرے لیکن قاضی بغیر مدعی یا شکایت کنندہ کی موجودگی کے اپنے طور پر دعویٰ کی تحقیق نہیں کر سکتا نیز محتسب کے لئے جائز ہے کہ وہ منکرات کی سرکوبی اور مقابلے کے لئے اپنی قوت کو استعمال کرے لیکن قاضی کا فرض فقط یہ ہے کہ وہ نہایت سنجیدگی اور سکون واطمینان کے ساتھ دعویٰ کا سماع کرے۔

اگر ہم اسلامی حکومتوں کے مختلف امور مثلاً احتساب، احکام قضا اور احکام مظالم وغیرہ کے باہمی فرق واختلاف کو بیان کرنا چاہیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی لہٰذا شرط احتساب کے بارے میں غزالی کی رائے سمجھنے کے لئے فقط اتنی سی مختصر تمہید پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

شروطِ محتسب

کسی شخص کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق نہیں ہے جب تک کہ اس میں مندرجہ ذیل شرط موجود نہ ہوں۔

(۱) وہ بالغ اور مکلّف ہو۔ تو گویا بچے پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض عائد نہیں ہوتا ہاں اگر وہ اپنے طور پر انجام دینا شروع کر دے تو جائز ہے کسی کو حق نہیں کہ اُسے روکے۔

(۲) مؤمن ہو۔ اور یہ بات صاف ظاہر ہے کیونکہ غزالی غیر مومن کا معمولی اور ادنیٰ سا بھی حق تسلیم نہیں کرتے چہ جائیکہ اُسے اصلاح وارشاد جیسے اہم فرض کی اجازت دیں۔

(۳) ہر معنی میں نیک اور صالح ہو۔ غزالی اس شرط کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں چونکہ انبیاء کی عصمت بھی مختلف فیہ مسئلہ ہے اور قرآن حکیم میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی معصیت کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور انبیاء کی ایک دوسری جماعت کی طرف بھی اسی قسم کی نسبتیں موجود ہیں۔ لہذا اگر ہم احتساب کے لئے معصومیت کو شرط قرار دیں تو اصلاح وارشاد کا دروازہ ہی ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا

(۴) وہ امام یا والی کی طرف سے ماذون ومجاز ہو۔ غزالی اس شرط کے بھی مخالف ہیں کہتے ہیں کہ کتاب وسنت میں احتساب کے لئے کہیں بھی یہ شرط اور قید موجود نہیں لہذا اس کی تخصیص وتقیید سراسر بے اصل ہے آخر میں فیصلہ یہ دیتے ہیں کہ مجرم وعاصی کو جہاں بھی اور جس حال میں بھی پایا جائے اس کا زجر اور اس پر تنکیر ضروری ہے۔

(۵) وہ احتساب کی قدرت وطاقت رکھتا ہو۔ لہذا عاجز و کوتاہ دست پر بجز قلبی احتساب کے عملی احتساب کا فرض عائد نہیں ہوتا اور اس باب میں صرف حسی عجز ہی مانع نہیں بلکہ معنوی عجز بھی مانع ہے۔ مثلاً کوئی شخص سمجھتا ہے اگر میں کسی سے کچھ باز پرس یا احتساب کروں گا تو اس کی طرف سے مجھے دکھ یا تکلیف پہنچے گی یا میری بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا تو ان امور کی وجہ سے بھی اُس سے احتساب کا فرض ساقط ہو جائے گا افسوس ہے کہ اس باب میں غزالی کی آراء ہم آہنگ نہیں ہیں۔ احیاء ج ۲ ص ۳۲۲ میں کہتے ہیں کہ جب احتساب مفید نہ ہو تو اس کا فرض ساقط ہو جاتا ہے لیکن ج ۱ ص ۱۵۳ میں حمام میں کشفِ عورت کے بیان کے ضمن میں کہتے ہیں:۔

کسی کی یہ معذرت کہ مجھے اس کا علم ہے کہ میری بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا حقیقت میں کوئی

معذرت نہیں کیونکہ برے آدمی کو برائی پر جب بھی ٹوکو گے اُس پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا وہ یقیناً محسوس کرے گا کہ مجھے معاصی کی آلودگیوں سے دامن بچانا چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جس برائی میں مبتلا ہے وہ اُس کی نگاہ میں نہایت حقیر اور قبیح صورت اختیار کر لے گی اور آخرکار وہ رفتہ رفتہ اُس سے ضرور دامن چھڑائے گا لہٰذا احتساب کا فرض ہر حالت میں انجام دیتے رہنا چاہیئے۔"

غزالی نے محسوس کیا کہ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انسان کی مختلف حالتیں ہیں کبھی اُسے ایک کلمہ ہی دکھ پہنچاتا ہے کبھی وہ زدوکوب کو دکھ کی بات سمجھتا ہے۔ کبھی اُسے اس کا خوف اور کھٹکا ہوتا ہے کہ جس شخص سے میں محاسبہ کر رہا ہوں وہ لوگوں میں مجھے بدنام کر دے گا۔ غرضیکہ جس شخص کو بھی نیکی کی تلقین کی جائے گی اُس سے کسی نہ کسی ضرر کی توقع ضروری ہے مثلاً بادشاہ کے پاس جا کر شکایت کر دے گا یا کچھ ایسے لوگوں میں بیٹھ کر اُس پر طعن و تشنیع کرے گا جن کی نگاہ میں بے وقعت ہو جانے سے صاحبِ احتساب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو بتائیے کہ آخر اُس دکھ کی تعریف کیا ہے جس کے خوف سے احتساب کا فرض ساقط و زائل ہو جاتا ہے غزالی جواب دیتے ہیں کہ دکھ سے مراد عام تکلیف نہیں بلکہ بہت بڑی تکلیف ہے مثلاً اُسے خوف ہو کہ وہ اُسے شدید طور پر زدوکوب کرے گا یا اُس کا گھر لٹوا کر ویران کر دے گا[1]

وہ منکرات جن سے دوسروں کو روکا جائے

غزالی کی رائے میں صرف مندرجہ ذیل شروط کے مطابق دوسروں کو کسی بات سے روکنے کی اجازت ہے۔

(اول) وہ عمل منکر ہو یعنی شرع نے اُس کے ارتکاب سے روکا ہو غزالی کہتے ہیں:-

"ہم نے بجائے معصیت کے منکر کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ منکر معصیت کی نسبت عام ہے کیونکہ اگر کوئی شخص کسی بچے یا پاگل کو شراب پیتے ہوئے دیکھے تو اُس کا فرض ہے

---

[1] احیاء، ج ۲ ص ۲۲۳

کہ شراب کو گرا دے اور انھیں اس عمل بد سے روکے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دیوانے کو کسی دیوانی عورت سے یا کسی جانور کے ساتھ زنا کرتے ہوئے پائے تو اس کا فرض ہے کہ اُسے اس امر سے باز رکھے۔"

آگے چل کر کہتے ہیں :۔

"احتساب صرف کبائر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ حمام میں کشفِ عورت، اجنبیہ کے ساتھ تنہائی، پرائی عورتوں کو گھور گھور کر دیکھنا یہ سب صغائر ہیں لیکن ان سے بھی منع ونہی ضروری ہے۔"

(دوم) اس امر منکر کا ارتکاب بالفعل ہو رہا ہو۔ لہٰذا جو شخص شراب پی کر فارغ ہو چکا ہو یا جس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی شب میں شراب پینے کا عزم رکھتا ہے اس سے احتساب نہ کیا جائے۔

(سوم) وہ امر منکر جو برملا اور سرِ بازار انجام دیا جا رہا ہو۔ لہٰذا جو شخص گھر میں چوری چھپے کوئی گناہ کر رہا ہو اس کا تجسس نہ کیا جائے کیونکہ جس بات پر اللہ پردہ ڈالیں اس پر پردہ ڈالنے کے ہم بھی مامور ہیں ہمیں اعتراض اور نکیر کا حق صرف اس بات پر ہے جو خود بخود ہمارے سامنے آئے۔

(چہارم) وہ امر منکر جو بغیر کسی تحقیق وجستجو کی کدوکاوش کے خود بخود ہمارے سامنے آئے لہٰذا جس برائی کے تفحص کے لئے ہمیں جدوجہد کرنی پڑے اس کے بارے میں احتساب نہیں ہے۔ یہ آخری شرط غزالی کی حریت رائے وفکر کی بہت بڑی دلیل ہے، کاش موجودہ عصر کے علماء ومصلحین کو بھی اس پر غور کرنے اور اس کے مطابق عمل پیرا ہونے کی ہمت وتوفیق ہوتی۔

ریفارمر کی خصوصیتیں

کسی ریفارمر یا مصلح کا، علم، تقویٰ اور حسن خلق کے زیور سے آراستہ ہونا ضروری ہے علم اس لئے تاکہ احتساب کے مواقع وحدود، اس کا طریق اور اس کے موانع کو پہچان سکے

کیے ہیں۔ اس باب میں ان کی تعلیمات و آراء کا سارا خلاصہ و محور انسانوں کی دینی اور معاشی زندگی کی سلامتی و بہبودی اور عام تعلقات کی درستی و اصلاح ہے مثلاً بعض جگہوں میں کہتے ہیں ایسی حرکات و اعمال سے مجتنب رہا جائے جن سے گلی کوچے تنگ ہوتے ہوں، راہ گیروں کو تکلیف نہ پہنچائی جائے، جانوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادا جائے۔ (ظاہر ہے کہ یہ جانوروں کے ساتھ نرمی کی تعلیم ہے) کھانے پینے اور عمارتیں تعمیر کرنے میں اسراف سے کام نہ لیا جائے۔ غزالی کے بیان کردہ جملہ منکرات کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کے دلوں میں نرمی شرافت اور حسن خلق کا بیج بونے کے کس قدر والا و شیدا تھے۔

احتساب کے مختلف درجے

احتساب کے مندرجہ ذیل مختلف درجے ہیں:

(۱) تعریف[1] (۲) نہی[2] (۳) وعظ (۴) نصح (۵) سب[3] و تعنیف (۶) تغییر[4] بالید (۷) تہدید[5] بالضرب (۸) ایقاع[6] الضرب (۹) شہر[7] السلاح (۱۰) استظہار[8] بالاعوان وجمع الجنود۔

آخری درجے کے متعلق غزالی کہتے ہیں۔

"بعض اوقات ایک فاسق بھی مقابلے کے لئے اپنے اعوان و انصار سے استمداد کرے گا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں فریق باہم جدال و قتال کے لئے صف آرا ہو جائیں گے لہٰذا ایسے موقع پر امام کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے بعض علما کی رائے ہے کہ پبلک کو اس امر کی اجازت نہیں ہے ورنہ فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوگا اور ملک کا پورا ملک تباہ و تاراج ہو جائے گا۔ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ امام کے اذن و اجازت[9] حاصل کرنے کی ضرورت نہیں اور یہی رائے قرین قیاس ہے کیونکہ عوام کو بھی امر بالمعروف

---

[1] بتلانا [2] منع کرنا (۳) برا بھلا کہنا اور سختی برتنا [4] ہاتھ سے بدلنا اور روکنا [5] مارنے کی دھمکی دینا۔ [6] مارنا [7] ہتھیار نکالنا [8] اعوان و انصار سے استمداد اور لشکر جمع کرنا۔

کا حق و اختیار حاصل ہے بعض حالتوں میں احتساب کے ابتدائی درجے ہی بعد کے درجوں تک منجر ہوتے ہیں اور آخر کار حرب و ضرب تک نوبت پہنچتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ امر تعاون و تناصر کا محتاج ہے لہذا ضروری ہے کہ امر بالمعروف کے لوازم و نتائج سے آنکھ یکسر بند کر لی جائے اور ایسے موقع پر اللہ کی رضا جوئی اور معاصی کے دفع و مقابلے کے لئے جتھے اور گروہ تیار اور جمع کرنے شروع کر دیئے جائیں" (ج ۳ ص ۳۳۶)

سلاطین و امراء کی اصلاح

غزالی کی رائے میں امراء و سلاطین کی اصلاح و ارشاد کے لئے احتساب کے صرف پہلے دو درجوں (یعنی تعریف اور وعظ[1]) پر اکتفا کیا جائے۔ رعیت کو اس بات کی اجازت ہرگز نہیں کہ بادشاہ کو جبر و قہر کے ساتھ کسی بات پر ٹوکے ورنہ اس سے کئی اور طرح طرح کے فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا اور جس بدی سے روکا جا رہا ہے اس سے کہیں بڑی بدی اور مصیبت و آفت رونما ہوگی۔ رہا گفتگو میں سختی اور خشونت برتنا، مثلاً کہنا اے ظالم، اے وہ جو اللہ سے نہیں ڈرتا وغیرہ تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ اگر اسے اس امر کا خوف ہے کہ اس گفتگو کے بدلے بادشاہ کی طرف سے جو بدسلوکی میرے ساتھ ہوگی اس کا شکار میرے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا تو اس حالت میں اجازت نہیں۔ اگر وہ مطمئن ہے کہ اس کا نقصان تنہا اس کی ذات کو پہنچے گا تو اس صورت میں سخت کلامی سے کام لینے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ مستحب ہے اور اگر وہ اس سلسلے میں قتل کر دیا گیا تو شہید ہوگا۔

---

[1] وعظ تیسرا درجہ ہے دوسرا درجہ نہی ہے۔ مترجم

گیارھواں باب

اپنے زمانہ و دورِ اور بعد میں غزالی کی شخصیت کا اثر

اپنے زمانہ و دور کے لوگوں پر غزالی کی شخصیت کا اثر یہ ہوا کہ کیا علماء اور کیا حکام سبھی دو الگ الگ گروہوں میں بٹ گئے اگر ایک گروہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے تو دوسرا ان کی دشمنی اور مخالفت پر کمر بستہ ہے۔ ان دونوں گروہوں کی باہمی آویزش اور چپقلش کا کوئی اور حاصل و نتیجہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اتنا ضرور ہوا کہ غزالی کا نام شہرت کے پروں سے اُڑ کر پوری متمدن دنیا کا چکر کاٹنے لگا

غزالی نے اپنی زندگی ہی میں جہاں ایسے ایسے ارادت مندوں اور ایسے ایسے پرستاروں کو موجود پایا جو انھیں ایک مقدس اور مافوق الفطرت شخصیت سمجھتے تھے اور تمام علمائے دہر پر انھیں فوقیت اور ترجیح دیتے تھے وہاں زندگی ہی میں انھیں دل پر یہ داغ بھی سہنا پڑا کہ مختلف اسلامی ممالک سے اُن کے کفر و الحاد کے فتوے صادر ہوئے اور اُن کی احیاء العلوم اور دوسری کتابوں کے نسخے سربازار جلائے گئے۔

---

(۱)

پانچویں صدی کی تجدید

گذشتہ زمانے میں جمہور مسلمین کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر صدی کے آخر میں ایک مجدد مبعوث فرماتے ہیں جو دین کی تجدید و اصلاح کرتا اور ناپاکیوں اور آلودگیوں سے اُسے پاک اور دور کرتا ہے اس عقیدے کے باب میں ان لوگوں نے نہایت طویل و مفصل مباحث لکھے ہیں۔ چنانچہ اسی کے بارے میں جلال سیوطی اپنے ایک ارجوزہ میں کہتے ہیں۔

وَالشرطُ فِي ذَالِكَ ان تمضي المائة ۔۔۔ وَهُوَ عَلَى حَيَاتِهِ بَيْنَ الْفِئَة

يُشَارُ بِالعلم الى مقامه ۔۔۔ وينصرُ السنة فِي كلامه

وَانِ يكونَ جامعاً لكلِّ فن ۔۔۔ وَان يعم علمه اهلَ الزمن

وان يكون فی حديث قد روی ۔۔۔ من اهل بيت المصطفی وقد قوی

وَكونه فرداً هُوَ المشهور ۔۔۔ قد نطق الحديثُ والجمهور

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر و بن عبدالعزیز دوسری کے حضرت امام شافعی تیسری کے اشعری یا ابن سریج چوتھی کے اسفرائینی یا صعلوکی یا باقلانی لیکن پانچویں صدی کے بارے میں سب متفق ہیں کہ اس کے مجدد غزالی تھے چنانچہ سیوطی کہتے ہیں۔

والخامس الحبر هو الغزالی ۔۔۔ وعدّه ما فيه من جدال[1]

میں اس وقت نظریۂ تجدید کی تحقیق و تفتیش یا اس پختہ یا کمزور بنیاد سے بحث نہیں کرنا چاہتا جس پر اس فکر و تخیل کی ساری عمارت قائم ہے کیونکہ یہ نظریہ فی نفسہ نہایت خام، اور سیوطی کے اس بارے میں اشعار خام تر ہیں۔ یہاں اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ غزالی اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے اور ان پر ہمیشہ کے لئے گمنامی اور خمول کی ایک لمبی چوڑی چادر تان دی تھی کہ متاخرین نے ان کو پانچویں صدی کا مجدد قرار دیا لیکن کیا۔

---

[1] پانچویں مجدد بلا نزاع امام غزالی ہیں۔ مترجم

ضروری ہے کہ ان کی یہ رائے درست بھی ہو۔

(۲)

غزالی کے بارے میں لوگوں کے خواب

غزالی کے بارے میں ایک ہی طرح کے جو متعدد خواب لوگوں سے منقول ہیں اُن سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی عظمت و شخصیت لوگوں کے دل و دماغ پر کس قدر حاوی و محیط تھی اور ان خوابوں کی بدولت کس طرح اُن کی شہرت اور ان کے علم و فضل کو چار چاند لگ گئے۔ مثلاً علامہ سبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ اُن کے زمانے میں مصر میں ایک شخص غزالی کی مذمت و توہین کیا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی معیت میں تشریف رکھتے ہیں اور غزالی آپ کے سامنے بیٹھے عرض کر رہے ہیں "یا رسول اللہ یہ شخص مجھے برا کہتا ہے اس پر آپ نے دُرّے منگوا کر اُسے سزا دی، جب نیند سے بیدار ہوا تو اُس کی پشت پر دُرّوں کے نشان موجود تھے جو طویل عرصے تک باقی رہے۔ یہ بے چارہ رو رو کر لوگوں کے سامنے سارا ماجرا بیان کرتا۔

سبکی ہی کہتے ہیں کہ ابو الحسن بن حرزہم نے جب احیاء کا مطالعہ کیا تو کہا یہ بدعت ہے، مخالف سنت ہے۔ بلاد مغرب میں چونکہ اس کا بڑا وقار اور بڑا اثر تھا لہٰذا حکم دیا کہ احیاء کے تمام نسخے جمع کئے جائیں ساتھ ہی بادشاہ سے بھی استمداد و استعانت کی، بادشاہ نے بھی ملک کے مختلف اطراف میں بنہایت شدت و سختی کے ساتھ یہی حکم جاری کیا اور کہا کہ جس شخص کے پاس احیاء کا کوئی نسخہ موجود ہوا اور اُس نے پیش کرنے میں لیت و لعل کی تو اُسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی چنانچہ لوگوں نے ایک ایک کر کے تمام نسخے جمع کر دئے جمعہ کے دن فقہا کا ایک عظیم اجتماع ہوا اور اس میں احیاء کے مندرجات پر غور کیا گیا۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ کل جمعہ کے دن اس کے تمام نسخوں کو نذر آتش کر دیا جائے۔ شب کو ابن حر

نے خواب دیکھا کہ میں جامع مسجد کے اس دروازے سے اندر داخل ہو رہا ہوں جس سے پہلے عموماً داخل ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کے ایک حصے میں کچھ روشنی سی ہے پاس گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب تشریف فرما ہیں اور امام ابو حامد غزالی) احیاء العلوم ہاتھ میں لے کر آپ کے سامنے کھڑے کہہ رہے ہیں یا رسول اللہ یہ شخص میرا دشمن ہے۔ پھر جہاں کھڑے تھے وہیں دو زانو بیٹھ گئے اور سرکتے سرکتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے اور عرض کی حضرت آپ خود اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں۔ جس طرح یہ شخص کہتا ہے، اگر واقعی سچ ہے کہ یہ بدعت اور آپ کی سنت کے خلاف ہے تو میں اللہ سے تائب ہوں گا اور اگر آپ اسے پسند فرماتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی اچھی چیز ہے، جو آپ ہی کی برکت و طفیل سے مجھے میسر آئی ہے تو اس دشمن کے سلسلے میں میری دادرسی فرمایئے۔ چنانچہ آپ نے احیاء کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے فرمایا یہ اچھی چیز ہے، یہ کہہ کر آپ نے یہ کتاب حضرت ابوبکر صدیق کو دیدی، انھوں نے اُسے پڑھ کر کہا یا رسول اللہ میں اُس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے آپ کو حق و صداقت کا پیغام دے کر بھیجا کہ یہ واقعی بڑی عمدہ کتاب ہے پھر انھوں نے یہ کتاب حضرت عمرؓ کو دیدی انھوں نے بھی پڑھ کر وہی کہا جو حضرت ابوبکرؓ نے کہا تھا، اس پر آپ نے حکم دیا کہ ابو الحسن کے کپڑے اتار کر اسے مفتری کی سزا دی جائے چنانچہ آپ کے حکم و ارشاد کی تعمیل کی گئی۔ پانچ دُرّوں کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اُس کی سفارش کی اور کہا اے رسولِ خدا، ابن حرزھم نے جو کچھ کیا ہے وہ آپ کی سنت میں اجتہاد اور اس کی تعظیم و تکریم کے لئے کیا ہے۔ اس پر ابو حامد (غزالی) نے خود ہی اُس کو معاف کر دیا۔ ابن حرزھم نے صبح جاگ کر اپنے تمام رفقاء کو یہ خواب سنایا اور تقریباً ایک مہینے تک اس سزا کی وجہ سے اس کا بدن ہلکان رہا۔ کچھ عرصہ بعد درد تو جاتا رہا لیکن مرتے دم تک کوڑوں کے نشان جسم پر باقی رہے۔

سبکی نے طبقات میں ابوالفتح ساوی کا بھی ایک طویل خواب نقل کیا ہے جس میں انھوں نے

غزالی کی تصنیف "قواعد العقائد" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پڑھ کر سنائی۔ میں نے ابتدا میں اس قسم کے خوابوں کی ایک فہرست بھی مرتب کر لی تھی لیکن پھر خیال آیا کہ ان تمام کا درج کرنا کتاب کے ایجاز و اختصار کے منافی ہوگا۔

ان خوابوں کے ذکر سے حاشا وکلا میرا مقصود یہ نہیں کہ میں غزالی کے سوانح نگاروں کی طرح ان کو کوئی ولی یا صاحبِ کرامات سمجھتا ہوں بلکہ مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ غزالی کی محبت مسلمانوں کے دلوں میں کس طرح رس بس گئی تھی، کیونکہ آدمی جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے اس کا بیداری کی مشغولیتوں سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو غزالی کی مخالفت کی وجہ سے خواب میں سزائیں ملی ہیں، بعید نہیں کہ وہ بیداری کے عالم میں غزالی کا کوئی خوف اور ڈر محسوس کرتے ہوں بالخصوص جب کہ ہم جانتے ہیں کہ قدیم زمانے میں لوگوں کے دماغوں پر اولیاء کا بڑا شدید قابو اور تسلط تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ اولیاء اللہ زندہ و موجودات کے عالم میں جس طرح کا تصرف چاہیں کر سکتے ہیں وسبحان من جلّ عن الشریک

(۳)

تلامذہ و مؤیدین

کسی عالم کا اس کے زمانہ و دور پر اثر و رنگ معلوم کرنے کے لئے ہمیں اس کے تلامذہ و مؤیدین کے علم و فضل اور ان کی شہرت و شخصیت کا جائزہ لینا چاہئے کیونکہ ہمارے پاس یہی ایک تنہا طریق ہے جس سے ہم کسی ذات کی مقبولیت و ہردل عزیزی کا اندازہ کر سکتے ہیں شاگرد پر استاذ کی شخصیت کا اثر ایک ایسا مسلمہ مسئلہ ہے جس سے کسی کو بھی وسعت انکار نہیں۔ اس کلیے کے تحت ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ غزالی کی عظیم شخصیت نے اپنے تلامذہ و مؤیدین پر نہایت عمیق اور گہرا اثر چھوڑا ہے۔ زبیدی نے ایسے حضرات کی جو فہرست لکھی ہے ان میں مشہور لوگ یہ ہیں۔

(۱) قاضی ابو نصر احمد بن عبد اللہ خمقری (خمس قری پنج دہ کی طرف نسبت ہے جسے عام طور پر پنج دہ

کہتے ہیں ۴۶۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۴۲ھ میں وفات پائی۔

(۲) امام ابوالفتح احمد بن علی بن محمد بن برہان۔ ابن الفتح الباز ۴۷۶ھ - ۵۱۸ھ

(۳) ابو منصور محمد بن اسمٰعیل بن قاسم طوسی متوفی ۴۸۶ھ

(۴) ابو سعید محمد بن اسعد بن محمد نوقانی ۵۴۸ھ میں مشہد علی بن موسیٰ میں واقعۂ غز میں شہید ہوئے۔

(۵) ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن تومرت مصمودی ملقب بالمہدی صاحب دعوۃ سلطان المسلمین عبدالمومن بن علی ملک المغرب ـــ مشرق میں آئے اور غزالی سے علم کی تحصیل کی۔

(۶) ابو حامد محمد بن عبدالملک بن محمد جوزقانی، اسفرائینی۔

(۷) ابو سعید محمد بن علی جاوان کروہی ـــ انھوں نے غزالی کی تصنیف الجام العوام کی اُن سے روایت کی۔

(۸) ابو سعید محمد بن یحییٰ بن منصور ـــ غزالی کے اشہر تلامذہ میں سے ہیں۔ ان سے تحصیلِ علم کرنے کے بعد ان کی تصنیف البسیط کی شرح لکھی۔

میں اس باب میں طوالت و اطناب سے کام لینا نہیں چاہتا۔ صرف مقصود اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ غزالی کے تلامذہ نے اسلامی زندگی کے صفحہ پر ایک نہایت پائیدار اور دوامی اثر چھوڑا ہے۔ ان میں سے اکثر تو شہید ہی ہوئے اور آپ جانتے ہیں کہ علماء کا عام تحریکوں میں حصہ لینا جہاں اُن کی معنوی قوت کا اثر و نتیجہ ہوتا ہے وہاں اس بات کی بھی گہری غمازی کرتا ہے کہ وہ اپنے نصب العین پر کس قدر مضبوط اور قوی ایمان رکھتے ہیں۔

یہاں میں اس بات کو بھی صراحتاً بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ غزالی سے ان کے شاگردوں اور پیروؤں کی وابستگی و تعلق اس لئے نہیں کہ انھوں نے فقہ یا منطق یا علم اصول میں کئی کتابیں تصنیف کیں بلکہ اس وابستگی کا سارا راز اس بات میں مضمر ہے کہ غزالی احیاء العلوم جیسی بے نظیر و عظیم الشان کتاب کے مصنف، داعی الی اللہ، اور مکارمِ اخلاق کے پُر زور منادی و مبلغ تھے۔

(۴)

تالیفات وفتاویٰ

غزالی کی تالیفات وفتاویٰ کی جمع وحفاظت اور شرح وتحشیہ میں لوگوں نے جس کمال اہتمام اور کمال دلچسپی سے کام لیا وہ اس امر کی واضح اور بین دلیل ہے کہ غزالی کی عظمت و شخصیت نے اسلامی طرز زندگی پر کس قدر گہرا اور پائیدار اثر جمایا تھا۔ زبیدی کی روایت کے مطابق صرف الوجیز کی تقریباً ستر شرحیں لکھی گئیں اور لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر غزالی نہ ہوتے تو ان کا معجزہ الوجیز ہوتی۔ جن اعاظم رجال نے اس کتاب کی شروح لکھیں اُن میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امام فخر الدین رازی، ابو الثناء محمود بن ابی بکر ارموی، عماد الدین ابو حامد محمد بن یونس اربلی، ابو الفتوح العجلی، ابو القاسم عبد الکریم بن محمد قزوینی رافعی وغیرہ، نووی نے روضہ کے نام سے شرح رافعی کا خلاصہ لکھا، ابن ملقن نے سات ضخیم جلدوں میں وجیز کی احادیث کی تخریج کی اور اس کا نام بدر منیر رکھا، پھر خلاصہ کے نام سے چار جلدوں میں اس کا اختصار کیا آخر اس کو بھی ایک جلد میں مختصر کر کے المنتقی نام رکھا حافظ ابن حجر نے بھی اس کا خلاصہ لکھا۔ بدر زرکشی، بدر بن جماعہ، شہاب بوصیری اور جلال سیوطی نے بھی وجیز کی شروح لکھیں۔

جن لوگوں نے الوسیط کی شروح لکھیں اُن میں مشہور حضرات یہ ہیں۔

(۱) محمد بن یحییٰ نیشاپوری ـــ غزالی کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے سولہ جلدوں میں الوسیط کی شرح المحیط لکھی۔

(۲) نجم الدین احمد بن علی بن رفعہ ـــ انھوں نے ساٹھ جلدوں میں شرح لکھی جس کا نام مطلب رکھا

(۳) النجم القمولی ـــ انھوں نے البحر المحیط کے نام سے شرح لکھی۔

ان حضرات کے علاوہ اور بھی کئی علماء نے شروح لکھیں (ملاحظہ ہو شرح زبیدی ص ۴۳ ج ۱)

غزالی کی چاروں فقہی تصنیفات کی تعریف میں عمر بن عبد العزیز بن یوسف طرابلسی کہتے ہیں۔

هذب المذهب حبرٌ احسن اللہ خلاصہ
ببسیطٍ ووسیطٍ ووجیزٍ وخلاصہ[1]

اصول فقہ میں ان کی تصنیف المستصفیٰ بھی طویل عرصے تک علماء کی توجہ وعنایت کا مرکز رہی۔ ابوالعباس احمد بن محمد اشبیلی (المتوفی ۶۵۱ھ) نے اس کا خلاصہ لکھا۔ ابوعلی حسن بن عبدالعزیز فہری (المتوفی ۶۶۷ھ) نے اس کی شرح لکھی سلیمان بن داؤد غرناطی (المتوفی ۸۳۲ھ) نے اس کے حواشی وتعلیقات مرتب کئے۔

ہمیں علم ہے کہ غزالی کی معرکۃ الآرا تالیف تہافت الفلاسفہ نے مسلم فلاسفہ میں ایک تہلکہ مچادیا تھا۔ چنانچہ ابن رشد (المتوفی ۵۹۵ھ) نے اس پر نقد وجرح کے لئے تہافت التہافت مرتب کیا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ دنیائے فلسفہ میں ابن رشد کو کتنا اہم اور غیر معمولی مقام حاصل ہے۔ سلطان محمد فاتح عثمانی کے حکم وایماء سے خوجہ زادہ (المتوفی ۸۹۳ھ) نے غزالی اور ابن رشد کے مابین محاکمے پر ایک کتاب لکھی، علاءالدین بن علی طوسی نے غزالی اور ابن رشد کے مابین محاکمے کے لئے ذخیرہ لکھا جس کا ایک نسخہ نمبر ۱۷۴، دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہے۔

رکن الدین استراباذی اور محمد امین بن صدرالدین شروانی نے قواعدالعقائد کی شرحیں لکھیں مضنون بہ علی غیر اہلہ کی غزالی کی طرف نسبت کی تحقیق کے لئے سبکی اور صاحب تحفۃ الارشاد نے مستقل اور جامع ابحاث لکھیں۔ ابوبکر محمد بن عبداللہ مالکی (المتوفی ۵۴۳ھ) نے اس کے رد میں ایک کتاب تصنیف کی۔ ان باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں نے غزالی کی شخصیت کو غلط قسم کی نسبتوں کے غبار سے کس قدر دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی تصنیفات کی طرح ان کے فتاویٰ کے بارے میں بھی لوگوں نے بعینہ ایسی ہی سرگرمی اور اہتمام سے کام لیا۔ متعدد حضرات نے ان کی جمع وترتیب میں محنت وکاوش اٹھائی۔ بلکہ

---

[1] ایک امام نے (جسے اللہ حسن مغفرت سے نوازے) بسیط، وسیط، وجیز اور خلاصہ نامی کتابیں لکھ کر مذہب کو منقح کر دیا۔

یہاں تک کہ ان کے بغداد کے مواعظ اور متفرق قصائد کو جو ان سے منقول ہیں ان سب کو محفوظ کر لیا گیا (دیکھئے فہرست دار الکتب المصریہ نمبر ۲۴۳، ۱۲۸، ۵۶۲، ۲۷۶۲)

میرے مکرم و محترم دوست جناب عبد التقوی آفندی حلبی کہتے ہیں کہ ممالک اسلامیہ میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جس میں کوئی نئی لائبریری قائم ہوا اور اس کی فہرست غزالی کی فقہی اور اخلاقی تالیفات سے خالی ہو۔

(۵)

فقہ اور اخلاق کا باہم ربط و علاقہ

غزالی کی فقہی تالیفات کے بارے میں علماء کا اہتمام اور ان کی اخلاقی تالیفات سے علماء کا تاثر۔ بظاہر دو الگ اور بے جوڑسی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر ہم ذرا سے غور و تامل سے کام لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ زمانے میں فقہ اور تصوف دونوں توأم اور لازم و ملزوم چیزیں سمجھی جاتی تھیں غزالی کی تالیفات کی لاتعداد شرحیں لکھنے کے پیچھے بھی صرف یہی بات کار فرما تھی، چونکہ شارحین و محشیین کو ان کے صلاح و تقویٰ پر کامل ایمان اور بھروسہ تھا اس لئے انھوں نے جی بھر کر ان کی تالیفات کے حواشی و شروح لکھے۔ اس زمانے میں فقہا کا یہ عقیدہ تھا اور اسی زمانے پر کیا موقوف ہے آج بھی ان کا یہی عقیدہ ہے کہ صالح و متقی مصنف چاہے علم حساب و نجوم میں ہی کیوں نہ کتب تصنیف کرے اُن کا نظر و مطالعہ برکت و فائدہ سے خالی نہیں ہوتا۔ مزید برآں غزالی خود بھی اخلاقی تالیفات میں فقہ اور توحید کے مسائل سے اس کثرت سے بحث کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ بھی ان دونوں کو علم اخلاق کا مقدمہ و تمہید یا سنگِ بنیاد سمجھتے ہیں۔

جن لوگوں نے ان کی مصنّفات پر نقد و جرح کی انھوں نے بھی ان کے اخلاقی نقطۂ نگاہ ہی کو موضوع بحث قرار دیا۔ قضاۃ ان سے اس لئے ناراض ہیں کہ ان کا فلسفۂ اخلاق شریعت کے مزاج کے لئے زہر قاتل اور جادۂ شرع سے دور و مہجور رہتا ہے، حالانکہ قضاۃ کی نگاہ میں اخلاق

کا سارا منبع و سرچشمہ شریعت ہے۔ فلاسفہ اس لئے ان سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ فلسفے کے
کچھ بچے تلے قواعد ہیں جو ان کے اسلاف و معلمین سے ان تک پہنچے ہیں اور ہمارے غزالی چاہتے
ہیں کہ تصوف کے ستم پرور ہاتھ سے ان سب کا تار و پود بکھیر دیں۔ مگر آہ جس بات سے فلاسفہ
کے دل دھڑکتے تھے وہ تو آخر ہو کر رہی۔

(۶)

احیاء کی اثر آفرینی اور قیامت خیزی

وجیز کی مدح و توصیف میں لوگوں نے جو آسمان زمین کے قلابے ملائے وہ آپ پڑھ چکے
اس کی جو کثیر التعداد شرحیں لکھی گئیں ان کا ذکر و بیان آپ کی نگاہ سے گذر چکا۔ فقہ، توحید اور
علم اصول میں ان کی تصنیفات کا جو خیر مقدم کیا گیا وہ بھی آپ کی نگاہ سے مخفی نہیں لیکن یاد رکھئے
غزالی کو زندگی جاوداں اور حیاتِ دوام کی سند ان تالیفات کی وجہ سے نہیں ملی، بلکہ جس
تصنیف کی بدولت ان کا نام زندہ و روشن ہوا اور جو آج بھی بلا نزاع آسمانِ علم پر مہر و ماہ
ہو کر چمک رہی ہے وہ احیاء علوم الدین ہے۔

غزالی نے فقہ میں تالیفات کیں لیکن چونکہ ان میں اپنے جدید مذہب و آراء کو ایک خاص
اور معین حد تک بیان کیا لہذا کوئی فتنہ برپا نہ ہوا منطق میں کتابیں لکھیں لیکن ان میں بھی صرف
اتنی جدت کی کہ جن مسائل کو مناطقہ اجمال اور ابہام سے بیان کرتے تھے انھوں نے ان کو
ذرا تفصیل اور ایضاح سے بیان کر دیا اصول فقہ میں کتب تصنیف کیں تو اس احتیاط کے ساتھ
کہ کسی کی دشمنی اور بیر مول نہ لیں۔ فلسفے میں کتب و رسائل لکھے تو ان میں بھی اپنے معاصرین
ہی کی لیلیٰ سے عشق کیا۔ علم توحید کی موشگافیاں بیان کیں تو اشاعرہ کے معتقدات سے بہت کم
تخلف کیا لہذا ان تمام تصنیفات کے باوجود وہ مستور الحال رہے اور گوشۂ خمول سے باہر
قدم نہ رکھ سکے لیکن آخر انھوں نے احیاء کیا لکھی کہ تمام لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن گئے اور ان کا
نام سورج کی طرح آسمانِ شہرت پر چمکنے لگا۔ تاآنکہ ان کی شخصیت تمام علماء کے لئے ایک

دلچسپ موضوع بحث بن گئی۔ جہاں کچھ لوگ ان سے خفا تھے وہاں ایسے بھی تھے جو ان پر جاں نثار کرتے تھے جہاں کچھ ایسے تھے کہ انھیں بُرا بھلا کہتے تھے وہاں ایسے بھی تھے جو ان کے نام کا وِرد کرتے تھے۔ غزالی نے اپنے خلاف اس قیامت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا سارے شور و غوغا کو اپنے کانوں سے سنا۔ انھوں نے ہر چند چاہا کہ ناقدین کو کسی صورت مطمئن کریں اور احیاء میں جو دقیق و غامض مسائل ہیں انھیں کھول کر بیان کر دیں لیکن کوئی صورت بھی کارگر نہیں ہوئی الاملاء علی مشکلات الاحیاء انھوں نے اسی غرض سے لکھی لیکن اس نے بھی ایک اشکال پر دوسرے اشکال اور ایک الجھاؤ پر دوسرے الجھاؤ کے اضافے کے سوا کچھ نہ کیا۔ اور لوگوں کی زبانیں پہلے سے زیادہ اور دراز ہو گئیں۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے منہاج تصنیف کی تاکہ کسی صورت یہ فتنہ فرو ہو اور سمجھوتے کی کوئی راہ نکلے لیکن افسوس ہے کہ اس نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ غزالی کے خلاف ابھی یہ ہنگامہ رستخیز برپا ہی تھا کہ وہ اس اثناء میں انتقال کر گئے لیکن عجیب بات ہے کہ اُن کی موت بھی اس فتنے کی آگ کو بجھا نہ سکی۔ بلکہ وہ جنگ جو ان کے اور ان کے ناقدین کے مابین تھی اب اور شدت اختیار کر کے ان کے تلامذہ اور ان کے معترضین کے درمیان منتقل ہو گئی جس کے بلند شعلے ابھی تک بھڑک رہے ہیں۔

اگر آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ غزالی کے موافقین اور مخالفین کے مابین جنگ فی التحقیقت شریعت اور تصوف کے مابین جنگ تھی کیونکہ جہاں ان کے موافقین صوفی منش یا صوفی نما لوگ ہیں وہاں ان کے مخالفین سب کے سب علمائے شریعت ہیں پھر ان علماء میں سے بھی ان کا سب سے بڑا حریفِ مقابل گروہ وہ ہے جس کے ہاتھ میں فتویٰ اور قضا کی باگ ڈور ہے۔

اگر ہم ایک طرف دیکھتے ہیں کہ ابنِ قیم جوزی غزالی کو خلل دماغ اور بے ہودہ سرائی کا طعن دیتے ہیں تو عین اسی وقت ہماری نگاہ ابوالحسن شاذلی پر پڑتی ہے جو کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزالی کی شخصیت پر فخر کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے کہہ رہے ہیں کہ کیا تمہاری امتوں میں بھی کوئی ایسا شخص گذرا ہے

چنانچہ دونوں اعتراف کرتے ہیں کہ نہیں۔ شاذلی ہی کے پہلو میں کھڑے ابوالعباس مرسی کہہ رہے ہیں کہ میں غزالی کی صدیقیت عظمیٰ کی شہادت دیتا ہوں معلوم نہیں کہ یہ صدیقیت عظمیٰ کیا چیز ہے؟

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو شخص خلل دماغ اور بے ہودہ سرائی کا طعن دیتا ہے اُس کے نظریے میں اور اُس شخص کے نظریے میں کتنا بڑا فرق ہے جو خواب دیکھتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی امتوں میں بھی ان کی کوئی نظیر و مثال نہیں۔

غزالی کے بارے میں لوگوں کے خواب اور اُن کے وجوہ و اسباب، میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہاں مزید صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کے خوابوں کا ایک بڑا باعث و سبب احیاء العلوم بھی ہے کیوں کہ اس قسم کے خواب یا تو اس کتاب کے ناقدین نے دیکھے ہیں یا پھر غزالی کے عقیدتمندوں اور مریدین نے جن لوگوں نے احیاء کو سر بازار جلایا یا جنھوں نے اس کے رد میں طویل اور ضخیم کتابیں لکھیں۔ ان دونوں نے بھی یہ سب کچھ اس لئے نہیں کیا کہ وہ اس کتاب کو کوئی معمولی اور ادنیٰ درجے کی چیز سمجھتے تھے بلکہ یہ سب کچھ اس لئے وجود میں آیا کہ اُن کی نگاہ میں احیاء ایک خطرناک ترین کتاب تھی کسی نے کہا یہ اسلام اور مسلمانوں پر گہری چوٹ ہے کسی نے کہا یہ شر اور فتنے کی پوٹ ہے کسی نے کہا یہ زندقہ والحاد کی آدٹ ہے۔ غرضیکہ کچھ بھی ہو لیکن اتنا ضرور مسلم ہے کہ یہ کتاب انتہائی ہیبت ناک تھی اور اس کو دیکھ کر بڑے بڑے مدعیانِ علم و فن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

احیاء کے ناقدین میں سب سے زیادہ مشہور امام ابوعبداللہ مازری مالکی ہیں جنھوں نے ۵۳۶ھ میں وفات پائی۔ سبکی نے طبقات میں ان کے تمام اعتراضات کا رد لکھا ہے اگر کوئی صاحب چاہیں تو تفصیل وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی تنقید کا خلاصہ و ماحصل یہ ہے کہ غزالی فنون میں ثقہ و معتبر نہیں ہیں اور ان کی احیاء کا ایک نہیں کئی محور ہیں اس میں موحدین، فلاسفہ اور اصحاب اشارات و کرامات سب کے لئے یکساں مواد موجود ہے۔ سبکی کے رد کا خلاصہ یہ ہے کہ مازری حاسد ہیں اور حقیقت میں غزالی کی ذات میں صوفیہ کے پورے گروہ کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ ابوالولید طرطوشی

اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی احیاء پر اعتراضات کی بوچھار کی جن کا مفصل ذکر شرح احیا جلد اول میں موجود ہے جن لوگوں نے احیاء کی فضیلت و عمدگی پر کتابیں لکھیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن ان میں مشہور تر عبدالقادر العیدروس ہیں جنہوں نے تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء تصنیف کی۔ ایک اور کتاب بغیۃ القاصدین لفضائل احیاء علوم الدین بھی اس سلسلے میں موجود ہے لیکن اس کا مصنف مجہول الحال اور گمنام ہے۔

سبکی نے احیاء کی تعریف و توصیف میں بہت طوالت سے کام لیا ہے یہاں تک کہ بعض محققین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ فقہاء نے منقولات وغیرہ میں جو کچھ تصنیف و مرتب کیا ہے اگر وہ سب کچھ موجود نہ بھی ہوتا تو بھی احیاء تنہا اُن سب کی جگہ کافی تھی۔ آگے چل کر کہتے ہیں مسلمانوں کو اس کتاب سے خاص شغف رکھنا چاہیئے اور اسے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ رواج دینا چاہیئے تاکہ ان کو ہدایت و بصیرت ہو۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت اور خوبی یہ ہے کہ اس میں بلا استثنا ہر شخص کے لئے عبرت و موعظت کا سامان موجود ہے۔

احیاء العلوم کے ساتھ علماء کے شغف اور اعتنا کا آپ اس امر سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ حافظ عراقی نے اس کی تخریج احادیث کے لئے یکے بعد دیگرے دو کتابیں لکھیں پہلی دو ضخیم جلدوں میں اور دوسری اس کو مختصر کر کے ایک ہی جلد میں اور اُس کا نام المغنی عن حمل الاسفار رکھا۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید شہاب الدین بن حجر عسقلانی نے ایک جلد میں اُن احادیث کی تخریج کی جن کی مغنی میں کمی رہ گئی تھی۔ شیخ قاسم بن قطلوبغا حنفی نے تحفۃ الاحیاء فیما فات من تخریج احادیث الاحیاء تصنیف کی سبکی کی منقولہ ضعیف احادیث کا تذکرہ ہم چونکہ پہلے کر چکے ہیں اس لئے اعادے کی ضرورت نہیں۔ جن حضرات نے احیاء کے خلاصے لکھے اُن میں سے مشاہیر کے نام یہ ہیں۔

(۱) ابوالفتوح احمد بن محمد غزالی المتوفی ۵۲۰ھ یہ غزالی کے بھائی ہیں اور ان کی کتاب کا نام لباب الاحیاء ہے۔

(۲) احمد بن موسیٰ موصلی المتوفی ۶۲۲ھ

(۳) محمد بن سعید یمنی

(۴) یحییٰ بن ابی الخیر یمنی

(۵) محمد بن عمر بن عثمان بلخی۔ ان کی کتاب کا نام "عین العلم وزین الحلم" ہے دیکھئے فہرست دار الکتب المصریہ نمبر ۱۰۹

(۶) عبدالوہاب بن علی الخطیب المراغی۔ ان کی کتاب کا نام بھی لباب الاحیاء ہے۔

(۷) الشمس محمد بن علی بن جعفر عجلونی المعروف بالبلالی شیخ خانقاہ سعید السعداء (مصر) المتوفی ۸۲۰

(۸) ابن جوزی۔ ان کی کتاب کا نام منہاج القاصدین ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ دار الکتب المصریہ میں نمبر ۱۶۷ کے تحت موجود ہے۔

زبیدی نے دس جلدوں میں احیاء کی ایک طویل اور مفصل شرح لکھی۔ اختلافی مسائل و مقامات میں ہم نے اکثر و بیشتر اسی پر اعتماد کیا ہے۔

لوگوں نے صرف احیاء کی شرح، تخریج احادیث اور تلخیص و اختصار پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے صرف ایک جملے لیس فی الامکان ابدع مما کان[1] کی شرح میں مندرجہ ذیل علماء نے مفصل اور مبسوط ابحاث لکھیں

(۱) عبدالوہاب شعرانی
(۲) عبدالکریم جیلی
(۳) جلال سیوطی کے شیخ محمد المغربی
(۴) احمد بن مبارک سجلماسی
(۵) ابوبکر بن عربی۔

ناصر الدین ابن المنیر اسکندری نے الضیاء المتلالی فی تعقب الاحیاء للغزالی کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ سید سمہودی نے اس کے رد میں ایک مبسوط رسالہ تصنیف کیا۔ تہدیم الارکان کے نام سے بقاعی نے ایک رسالہ لکھا جس کے رد میں جلال سیوطی نے تشیید الارکان تصنیف کی۔

---

[1] موجودہ عالم سے بہتر پیدا کرنا ممکن نہیں۔

(۷)

غزالی کی تالیفات سے استفادہ

غزالی سے بعد کے تمام ادوار کے مطالعہ و تتبع سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ علمائے دین علمائے تصوف اور علمائے اخلاق سب نے بقدر امکان ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی بعض نے تو ان کی احیاء کو نوک زبان یاد کرنا چاہا۔ بعض نے محض تقرب الی اللہ کی خاطر کئی نسخے اپنے ہاتھ سے لکھ کر لوگوں میں تقسیم کئے۔ بعض قرآن حکیم کی طرح بالالتزام ہر روز اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم اس قسم کی بیسیوں مثالیں آپ کے سامنے گنوا سکتے تھے۔

موجودہ عصر میں الازہر اور دوسرے دینی مدارس میں احیاء داخل نصاب ہے ایک زمانے میں شیخ محمد عبدہ نے اس کے ساتھ تہذیب الاخلاق (ابن مسکویہ) کا درس بھی ضروری قرار دیا تھا لیکن علماء نے اس خوف سے کہ اس کی فلسفیانہ آراء سے متاثر ہو کر طلبہ کے دماغ بگڑ نہ جائیں کچھ عرصہ بعد اسے نصاب سے خارج کر دیا۔

استاذ محترم شیخ یوسف دجوی ہمیشہ طلبہ کو احیاء سے استفادہ و انتفاع کی تلقین کیا کرتے ہیں۔ مجھے بھی اس کی خاص طور پر انھوں نے ہدایت کی تھی لیکن اللہ کو منظور نہ تھا کہ میں ان کی نصیحت پر عمل کر سکوں چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے غزالی کو غیر معصوم ثابت کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ اگر وہ کبھی حق و صواب پر ہیں تو کبھی اُن سے خطا اور سہو بھی ہو سکتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اتنی سی بات ثابت کر دکھانا بھی میرے لئے بہت ہے۔

شیخ دجوی کی تالیفات میں غزالی کا رنگ نمایاں ہے اور بعید نہیں کہ ان کی تالیفات کے ضعیف اور غیر مقبول ہونے کا بڑا باعث بھی یہی ہو۔ سبیل السعادت جو آج سے کئی برس قبل انھوں نے لکھی ہے وہ اس کے علاوہ کیا ہے کہ اصول اخلاق کے سمجھنے کے لئے کچھ جدید آراء کا ایک بدنما اور مسخ شدہ خلاصہ و مجموعہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ حضرت استاذ اس

سلسلے میں معذور بھی ہیں کیونکہ کسی بھی اجنبی زبان سے واقف نہ ہونے کے علاوہ وہ جدید تہذیب وتمدن کے سخت دشمن ہیں وہ ایک دقیقہ اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس امر کا تصور نہیں کرسکتے کہ جدید فلاسفہ کے آرار ومذاہب سے بھی کبھی کوئی شخص ہدایت وبصیرت حاصل کرسکتا ہے۔

میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ازہری ذہن کے بگاڑنے میں سب سے بڑا ہاتھ احیار العلوم کا ہے۔ محض اسی کی تدریس پر قناعت واکتفار کرنا اور ان مفکرین و مبصرین کے آرار سے یکسر آنکھ بند کرلینا جنھوں نے احیار پر تنقید کی ہے۔ ہرگز قرین صواب نہیں۔ احیاء کے درس ومطالعہ سے طبیعتیں بجھ جاتی ہیں دماغ سرد پڑجاتے ہیں۔ وہ کبھی اس لائق نہیں رہتے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ، اس کے رسول اور مؤمنین کی عزت کو راسخ وجاگزیں بنا سکیں۔

بعید نہیں کہ میری یہ آواز ازہر اور دوسرے دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کے کانوں تک پہنچے اور وہ علم الاخلاق کی پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نصاب میں صالح اور خوشگوار قسم کے اضافے اور تبدیلیاں قبول کرنے پر آمادہ ہوجائیں کیوں کہ ازہر اور دوسرے مدارس میں تقریباً بیس ہزار طلبہ پرانے اور فرسودہ مذاہب وآرار کی عمیق تہوں میں پڑے رینگ رہے ہیں جن تک اس کھلی دنیا کی ہوا کا کوئی جھونکا بھی شاید نہیں پہنچ سکتا۔ سبحان مَن لَو شَاءَ لَجَعَلنَا وَاِیَّاھُم سَوَاءَ السَّبِیل۔

(۸)

غزالی کے ساتھ غیر مسلموں کا اعتنار

علمی زندگی پر غزالی کے اثر کی بڑی شہادت ودلیل یہ ہے کہ ان کے باب میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی میں کئی مبسوط کتابیں لکھی گئیں بلکہ یہاں تک کہ بعض مغربی علمار مسلمانوں سے بھی زیادہ ان کے پرستار ومداح ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر زویمر نے جن چار شخصیتوں کو اسلام کی

اہم ترین شخصیتیں قرار دیا ہے اُن میں سے ایک غزالی بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے ہیں:

"جو شخص تاریخ اسلام کا مطالعہ کرے گا اس کی چار اہم ترین شخصیتوں سے ملاقات ناگزیر ہے

مسلمانوں کے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (امام) بخاری (امام) اشعری اور (امام) غزالی۔"

ڈاکٹر زویمر اُن انگریز مستشرقین میں سے ہیں جنھوں نے مشرقی ذہن و فکر کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ غزالی کے بارے میں ان کی تصنیف واقعی گل سرسبد کا حکم رکھتی ہے۔ غزالی سے ان کی محبت وشغف اور عقیدت وارادت کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ ڈونالڈسن نے غزالی کی قبر کو دیکھنے کے بعد ۷ جنوری ۱۹۱۷ء کو جو خط انھیں لکھا ہے اُسے کتنے اہتمام اور شوق سے انھوں نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ ڈونالڈسن نے وہاں ایک گوشے میں غزالی اور بوحا کے الفاظ بھی لکھے دیکھے ہیں (بوحا یقیناً ابوحامد ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے) خط کے ساتھ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو غزالی کی قبر کی یہ تصویر بھی بھیجی تھی۔

فرانسیسی میں غزالی کے متعلق سب سے عمدہ کتاب CARRA DE VAUX کی ہے موسیو کارادی وو اسلامی زندگی پر بڑی غائر اور وسیع نگاہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے ابن سینا پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ جو حضرات مسلمانوں کے ہاں فلسفے کے مختلف مکاتب کا سراغ لگانا چاہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ یقیناً بہت مفید ہوگا۔ بلاشبہ اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے میں افسوس اور دکھ محسوس کر رہا ہوں کہ معتزلہ وغیرہ کے مذاہب کو مستشرقین، ان علمائے ازہر کی نسبت بہتر سمجھتے ہیں جن کی محفل میں اگر کبھی اتفاقاً ان مذاہب کا ذکر آجائے تو یہ صرف تبخھم اللہ، کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اُستاذ محترم ڈاکٹر طٰہٰ حسین صاحب فرماتے ہیں کہ موسیو کارا کو وو نے بھی غزالی پر ایک کتاب لکھی ہے"۔ میں اس سے غفلت برتنے میں واقعی قابلِ ملامت ہوں۔ موسیو موصوف نے "محمد و نہایۃ العالم" جس عمدہ انداز و اسلوب میں لکھی ہے اُس کا تقاضا واقعی یہی تھا کہ ایسے بالغ النظر اور دقیقہ پرور شخصیت کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف نگاہ سے گذرنا چاہیئے مجھے اس بات کا بھی رنج و افسوس ہے کہ عدم گنجائش کی وجہ سے میں ان کے نظریات کا کچھ ترجمہ و اقتباس بھی شریک نہ کرسکا۔ البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جو حضرات اس دقیق النظر اور ژرف نگاہ عالم کے علم و فضل سے استفادہ و تمتع کرنا چاہیں وہ MOHAMET ET LA FIN DE MONDE - کا مطالعہ ضرور کریں۔ کیونکہ اس میں عقل اور دماغ کی تسکین و جلا کا بڑا سامان ہے۔

موسیو (MOHER) کی کتاب جس کا موضوع ہے- ETUDES SUR LA PHILOSPHIE D'AVERNOËS CONCERNANT SON RAPPORT AVEC CELLE D' AVIC-ENNE ET GAZALI - اس کا بھی نگاہ سے گذر جانا ضروری ہے۔ موسیو (LUC EN GAUTIER) نے جب دُرّۃ فاخرہ کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا تو اس سے پہلے جو مقدمہ TRAITE D' ESCHATOLO-GIE MUSULEMANE) - لکھا اُس کا مطالعہ بھی فائدے سے خالی نہیں (JOURNAL ASIATIQUE مجموعہ ہفتم جزء نہم سے بھی اس باب میں استفادہ ضروری ہے۔ جو حضرات یہ معلوم کرنا چاہیں کہ غزالی

کے متعلق فرانسیسی، انگریزی اور جرمن میں کیا کچھ لکھا گیا ہے وہ ENCYCLOPEDIA DE L'ISLAM
20 LIVREI کی طرف رجوع کریں۔ استاذ محترم شیخ مصطفےٰ عبدالرزاق صاحب فرماتے ہیں کہ غزالی
کے متعلق ترکی میں بھی کئی کتب موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان سے بھی اس باب میں بآسانی استفادہ
کیا جا سکتا ہے۔

غزالی اور اُن کے متصوفانہ مذاہب و آراء کے متعلق مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے
تفصیلی ذکر و بیان سے آپ غالباً مجھے معذور رکھیں گے کیوں کہ میں یہاں صرف اشارہ و اطلاع
پر ہی اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔

زندگی کی فتح

باوجودیکہ غزالی سے مشرق و مغرب یکساں متاثر ہوئے اور اُن کی شخصیت و عظمت
آج بھی علمی زندگی کی گہرائیوں پر چھائی ہوئی لیکن پھر بھی آخر کار فتح و کامرانی غزالی کی اخلاقی آراء
کو نہیں بلکہ نفس زندگی ہی کو ہوگی یاد رکھئے اخلاق کا معاملہ بھی بالکل شرائع کی طرح ہے جس طرح
زندگی کے مقابلے میں مختلف شرائع وقتاً فوقتاً شکست کھاتی رہی ہیں اور جس طرح قوانین
فطرت کے خلاف برد آزما ہونے کی وجہ سے آج مسیحیت شکست کھا چکی ہے بعینہ اسی طرح
جب اخلاق بھی زندگی کے اصول و عناصر سے برسرِ پیکار رہوں تو اُن کا بھی سپر انداز اور
پسپا ہو جانا ایک لابدی اور ضروری امر ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب غزالی نے بھی زندگی
کو چیلنج کیا تو انھیں بھی شدید شکست کھانا پڑی۔ انھوں نے نقش و تصویر کو حرام قرار دیا لیکن
بشری امیال و عواطف نے اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہ کی اور پوری قوت و شوکت سے اپنی
راہ پر گامزن رہے اور انسان کی انگلیوں نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی نقش گری سے غفلت نہ برتی
انھوں نے موسیقی و غنا کو حرام قرار دیا لیکن خوش ذوقی جو انسان کی فطرت اور خمیر میں تھی وہ
پوری قوت اور پورے طمطراق کے ساتھ اپنا کام برابر کرتی رہی اور جس طرح روزِ ازل میں
سریلی آوازوں کی پیاسی تھی ویسی ہی پیاسی آج بھی ہے۔

غزالی نے جب نقش و تصویر کو حرام کہا تھا تو کاش ساتھ ہی اس کی حرمت کے کچھ معقول علل و اسباب بھی بیان کئے ہوتے۔ ایسے موقع پر صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ جانا ہرگز کافی نہیں ہے کہ یہ امور وثنیت اور صنم پرستی کی طرف داعی ہیں کیونکہ یہ دلیل تو حقیقت و واقعہ کی عین تکذیب کے مرادف ہے معلوم نہیں زندگی میں ہمیں کتنی ہی تصویریں پسند آئی ہوں گی لیکن ساری زندگی میں کبھی ایک مرتبہ بھی ہمارے دماغ میں بت پرستی کا تصور نہیں گذرا۔ گانا ان کے ہاں اس لئے حرام ہے کہ مے نوشی کا مقدمہ و پیش خیمہ ہے لیکن یہ بات بھی درست نہیں ہم مدت مدید سے عبداللطیف آفندی البنا، ابراہیم آفندی القبانی، اور عبدالسمیع عیسیٰ وغیرہ کے گانوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن مے یا بزم مے کا ہمیں کبھی وہم اور خیال تک بھی نہیں گذرا۔

اخلاق کیا ہیں؟ زندگی کے اسالیب و طرق کے مختلف عناوین ہیں مگر تواضع، توکل اور خمول جیسے اخلاق جن پر غزالی زندگی کی بنیاد و اساس رکھنا چاہتے ہیں یقیناً ان اخلاق سے عبارت نہیں ہو سکتے جن پر اقوام و ملل کی تعمیر کا مضمر ہے۔ یاد رکھئے کہ اخلاق، قوانین زندگی کے سمجھنے کا نام ہے، صرف اور تنہا قوانین زندگی کے سمجھنے کا، میں چاہتا ہوں کہ زندگی کے لفظ کو بار بار دُہراتا رہوں اس لئے کہ میرے نزدیک اخلاق کی غرض و غایت زندگی ہی ہے، تنہا زندگی ہی۔

صبر، زہد اور قناعت جیسے سلبی فضائل اُس وقت فضائل کہلانے کے مستحق نہیں ہیں جب تک کہ یہ زندگی کی راہ میں تیغ و آہن کا کام نہ دیں، اور یہ میں نے اس لئے کہا کہ واقعہ یہی ہے جس طرح کبھی شہرت، گمنامی کا باعث ہوتی ہے، اسی طرح کبھی گمنامی بھی شہرت و ناموری کا علم ہاتھ میں لئے ہوئے نکلتی ہے۔

آخر میں، میں بآواز بلند کہتا ہوں کہ وہ زندگی بے وقعت ہے، بے قیمت ہے۔ انسانیت کے دوش پر بوجھ اور وبال ہے جس کا دامن قوت اور طاقت کے سرمائے سے خالی و تہی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس حدیث (اللهم احيني مسكيناً واحشرني في زمرة المساكين) کی صحت و قوت میں ہمیشہ شک اور شبہ رہا ہے۔

بارھواں باب

غزالی کے موافقین اور مخالفین

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ غزالی اور اُن کے مخالفین کے مابین جنگ حقیقت میں فقہ اور تصوف کی جنگ تھی اور جہاں غزالی کے اعوان و انصار صوفیہ و ارباب طریقت تھے وہاں ان کے مخالفین سب کے سب فقہاء و اصحاب شریعت تھے۔ اب ہم ان کے موافقین اور مخالفین اور اُن کے کچھ اوصاف و خصائص کا مختصر سا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ آپ آسانی سے اندازہ کر سکیں کہ غزالی کی تالیفات علمی اور فکری زندگی پر کس قدر شدید اثر انداز ہوئیں لیکن چونکہ مقام تفصیل و اطناب کا نہیں اس لئے ہم صرف ایجاز و اختصار پر ہی اکتفا کریں گے۔

ابن رشد

ابن رشد ۵۲۰ھ یا ۱۱۲۶ء کو قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں فقہ، توحید اور علم اصول کی درس و تحصیل سے فراغت کے بعد طب اور فلسفہ کی طرف توجہ کی۔ چونکہ معاصرین پر علم و فضل میں ایک خاص فوقیت و امتیاز رکھتے تھے اس لئے معاندین نے جی بھر کر ان کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ چنانچہ آخر قدیم فلسفہ کی شرح کی پاداش میں قید و بند اور جلا وطنی و غربت کے

کے صبر آزما اور جانکاہ مصائب برداشت کرنے کے بعد ۵۹۵ھ میں انھوں نے مراکش میں انتقال کیا۔

ابن رشد کے عہد و دور کے مطالعہ و تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت عربی تہذیب و تمدن کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور عربوں کی حکومت و سلطنت آہستہ آہستہ فنا کی طرف قدم بڑھا رہی تھی کیونکہ فطرت کا یہ غیر مبدل اور ناقابلِ تغیر قانون ہے کہ جب کوئی قوم حریت فکر اور روشن خیالی کی دشمن ہو جاتی ہے اور آزاد خیال علما، و مفکرین کی دشمنی و مخالفت پر کمربستہ ہو جاتی ہے تو زمانہ اُس کا دشمن ہو جاتا ہے اور اُس قوم کو زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے اور پنپنے کا موقع و فرصت نہیں دیتا چنانچہ یہی حسرت ناک اور عبرت آموز انجام آخر عربوں اور ان کی حکومت و سلطنت کا ہوا۔

غزالی سے ابن رشد کی خصومت و عناد تقریباً فلسفیانہ ہے۔ غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" لکھی جس کا مقصدِ تصنیف نام سے ظاہر ہے۔ ابن رشد نے اس کے مقابلہ میں "تہافت التہافت" مرتب کی، چونکہ غزالی، ابن سینا اور فارابی کو کافر و ملحد سمجھتے تھے لہذا ابن رشد نے ان دونوں کی طرف سے کمال جرأت و شجاعت سے غزالی کا مقابلہ و دفاع کیا۔

ابن رشد کے دفاع کا خلاصہ و ماحصل یہ ہے کہ قدم عالم اور حدوثِ عالم کا مسئلہ جو متکلمین اشاعرہ اور حکماء متقدمین کے مابین طویل عرصے سے مابہ النزاع چلا آرہا ہے حقیقت میں کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں صرف تسمیہ و تعبیر اور عنوان و اظہار کا فرق و اختلاف ہے۔ کیونکہ تمام موجودات کی تین قسمیں ہیں طرفین اور واسطہ بین الطرفین۔ طرفین کے معاملے میں سب متفق[1] ہیں۔ اختلاف صرف واسطہ میں ہے۔ طرفِ اول موجود ہے اور سببِ فاعل کی وجہ سے مادہ سے وجود میں آئی ہے اور اس کے وجود پر زمانے کا وجود یقیناً مقدم ہے۔ پانی، ہوا، زمین، حیوانات، نباتات وغیرہ وہ چیزیں جن کے تکوّن کو ہم حسّاً مشاہدہ کر سکتے ہیں وہ اسی قبیل سے ہیں اور اس قسم موجودات

---

[1] یعنی تسمیہ طرفین میں (مترجم)

کے حدوث پر سب کا اتفاق ہے۔ اب اس کی طرفِ مقابل کو لیجئے وہ بھی موجود ہے اور کسی سببِ فاعل کی وجہ سے مادہ سے وجود میں نہیں آئی اور زمانے کو بھی اس پر تقدم حاصل نہیں ہے، چنانچہ اس صنفِ موجودات پر بھی سب متفق ہیں کہ یہ قدیم ہے یعنی باری سبحانہ وتعالے۔ رہی موجودات کی تیسری قسم سو وہ بھی موجود ہے اور کسی مادّے سے وجود میں نہیں آئی اور زمانے کا وجود بھی اس پر مقدم نہیں ہے لیکن سببِ فاعل کی بدولت وجود میں آئی ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے عالم کہتے ہیں اور اس کے ان سہ گونہ صفات[1] پر سب متفق ہیں کیوں کہ متکلمین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس صنفِ موجودات پر زمانہ مقدم نہیں کیونکہ ان کے نزدیک زمانہ حرکات و اجسام کے لازم و مقارن[2] ہے۔ ساتھ ہی یہ سب لوگ اس بات میں بھی متحد ہیں کہ زمانۂ مستقبل اور وجودِ مستقبل غیر متناہی ہے۔ اختلاف صرف زمانۂ ماضی اور وجودِ ماضی میں ہے متکلمین کی رائے میں یہ متناہی ہے اور افلاطون اور اس کے متبعین کا بھی یہی مذہب ہے۔ ارسطو اور اس کے ہمنوا علما کے نزدیک ماضی و وجودِ ماضی بھی مستقبل کی طرح غیر متناہی ہے۔ چنانچہ ابن رشد کہتے ہیں۔

"موجودِ آخیر کا مسئلہ بھی واضح ہے۔ چونکہ اسے وجودِ کائن حقیقی اور وجودِ قدیم سے ایک گونہ مشابہت ہے لہذا جس نے اس پر قدیم کا ظل و عکس، محدث کی نسبت غالب قرار دیا اس نے کہا یہ قدیم ہے، جس نے اس پر حادث کا ظل و پرتو غالب قرار دیا اس نے کہا حادث ہے واقع میں نہ یہ حادث حقیقی[3] ہے نہ قدیم حقیقی[4] تو گویا عالم کے بارے میں جمیع مذاہب باہم اس قدر دور نہیں ہیں کہ اس اختلاف کی بنا پر کسی کی تکفیر یا عدم تکفیر کا فتوی دیا جائے کیونکہ جن آرا کی حالت و کیفیت یہ ہو ضروری ہے کہ وہ باہم متقابل ہوں جیسی کہ اس مسئلے کے متعلق متکلمین کی

---

[1] یعنی عدم تکوّن من شی، عدم تقدم زمان اور وجود عن سببِ فاعل — مترجم

[2] تو گویا زمانے کے لئے حرکت اور بالحرکت کا وجود پہلے ضروری ہوا — مترجم

[3] کیونکہ یہ بدیہی امر ہے کہ حادث حقیقی لا محالہ فاسد ہے۔ بعض لوگوں نے اسے محدث ازلی کا نام بھی دیا ہے — مترجم

[4] کیونکہ قدیم حقیقی کی کوئی علت نہیں ہونی چاہئے اور اس کی علت موجود ہے۔ — مترجم

راستے ہے۔"

ابن رشد نے تنہا اسی پر قناعت و اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے بعد ان لوگوں کو نہایت شدت اور سختی کے ساتھ ڈانٹا ہے جو قدم و حدوث عالم کے مسئلے کو طلاق کے مسائل کی طرح سہل اور آسان سمجھ کر فتاویٰ صادر کرتے پھرتے ہیں۔ غور فرمایئے کہتے ہیں :-

"ساتھ ہی یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ عالم کے باب میں تمام آراء ظاہر شرع کے مطابق نہیں ہیں کیوں کہ جب اُن آیات میں غور کیا جائے جن میں ایجاد عالم کا ذکر ہے تو انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ صورتِ عالم فی الواقع محدَث ہے اور نفس وجود اور زمانہ، طرفین سے دائم و مستمر اور غیر منقطع و سیال ہے۔ مثلاً (وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ) کا ظاہر مفہوم اس امر کا مقتضی ہے کہ اس وجود سے قبل بھی کوئی وجود[1] تھا (یعنی عرش اور پانی کا) اور اس زمانے سے قبل بھی کوئی زمانہ موجود[2] تھا۔ (يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ) بظاہر اس آیت کا مقتضی یہ ہے کہ اس وجود کے بعد پھر دوبارہ بھی ان چیزوں کا وجود ہوگا (یعنی ارض و سموات کا) (ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ) کا مقتضی یہ ہے کہ آسمان بھی ضرور کسی مادہ سے پیدا کیے گئے ہیں۔"

اس کے بعد ابن رشد نے علمائے توحید کو بھی بہت آڑے ہاتھوں لیا ہے کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی کل کائنات کچھ خود ساختہ اسالیب و اصطلاحات ہیں جنھیں انھوں نے شرعی حدود کا نام دے رکھا ہے اور جو شخص ان حدود سے تجاوز کرے اُسے بزعم خویش کافر و ملحد سمجھتے ہیں فَمَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا۔

لیجیے غور فرمایئے ابن رشد کیا کہتے ہیں :-

---

[1] کیوں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینوں اور آسمانوں کی تخلیق سے پہلے عرش اور پانی موجود تھا۔

[2] کیوں کہ دن زمانے کا ایک جزء ہے اور زمانہ نام ہے حرکات فلکیہ کا تو جب افلاک ہی وجود میں نہیں آئے تھے تو ظاہر ہے کہ یہ زمانہ موجود نہ تھا۔ پھر ستہ ایام میں ایام کس زمانے کے اجزا ہیں؟ معلوم ہوا کہ اس زمانے سے پہلے بھی کوئی زمانہ تھا۔ (مترجم)

"متکلمین کی مختلف آرا بھی ظاہر شرع سے ماخوذ یا اُس کے موافق نہیں ہیں۔ انھیں بھی آیات کی کچھ نہ کچھ تاویل ضرور کرنا پڑتی ہے۔ مثلاً شرع میں یہ بات کہیں نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالےٰ عدم محض کے ساتھ بھی موجود تھے چاہے متکلمین لاکھ جتن اور لاکھ کوشش کریں اس بات کو شرع سے ثابت نہیں کر سکتے۔ پھر آپ ہی بتایئے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ اس رائے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہاں تک درست اور صحیح ہے۔"

آگے چل کر کہتے ہیں:۔

"وجود عالم کے باب میں ظاہر شرع کے جو احکام ہم نے بیان کئے ہیں بعض علما نے ان ہی کو اپنا مسلک ومشرب قرار دیا ہے عقل وقیاس کا تقاضا و فیصلہ یہ ہے کہ ان مشکل مسائل تک اگر اُن کی رسائی اور رونہج ہو گئی ہو تو وہ اللہ کے ہاں ماجور و مثاب ہیں اگر نہیں ہو سکی تو ہر حال میں معذور ہیں کیونکہ جب کسی بات پر حجت و دلیل قائم ہو جائے تو اس کا تسلیم کرنا اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہو جاتا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ ایسی بات کی تصدیق یا عدم تصدیق اس طرح ہمارے بس میں نہیں رہتی جس طرح ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہمارے اختیار اور ہمارے بس میں ہے جب شرع نے مکلف ہونے کے لئے اختیار کو شرط اول قرار دیا ہے۔ تو جس شخص نے برہان و دلیل کے سامنے سپر ڈال کر اپنی شکست کا اعتراف کر لیا ہے اُسے معذور و مجبور تصور کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اذا اجتهد الحاکم فاصاب فلهٗ اجران وان اخطأ فلهٗ اجرٌ۔[1]"

ابن رشد کے کلام کی مناسبت سے ہم بھی اتنا ضرور عرض کریں گے کہ علمائے توحید نے بعض نہایت کمزور اور ضعیف وجوہ و اسباب کی بنا پر فلاسفہ کو اور فلاسفہ کو کیا خود آپس میں ایک دوسرے کو کافر کہنے میں بڑی بے احتیاطی اور نا عاقبت اندیشی سے کام لیا ہے۔

---

[1] جب کوئی عالم کسی مسئلے کے استنباط اور استخراج میں اجتہاد سے کام لے کر حق وصواب کے دامن تک پہنچ گیا تو اُسے دو اجر ملیں گے اگر نہ پہنچ سکا تو تنہا ایک اجر۔

اور یہی بے احتیاطی آج تک ان کا شیوہ و شعار ہے حتیٰ کہ عام لوگوں نے بھی علماء کی خودساختہ و وضع کردہ محکِ کفر و ایمان کو ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق شروع کر دی۔ اگر آپ اُن غلط آراء و مذاہب کا جائزہ لینا چاہیں جنھیں گذشتہ زمانوں کے لوگ حقائق و واقعات سمجھتے تھے اور درواقع میں وہ اباطیل و خرافات کا بدترین مجموعہ تھے تو آپ غزالی کی فیصل التفرقۃ کا مطالعہ فرمائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کا بغیر کسی وقیع دلیل و برہان کے عالم کو حادث مان لینا، اللہ کو چند معین و مخصوص صفات سے متصف کرنا اور موجودہ عالم کے ایک دوسری خاص شکل میں مبدل ہونے کو متعین کر دینا یہ سب ایسی باتیں ہیں جو ان کی سادگی، تنگ نظری اور علمی بے مائگی پر دلالت کرتی ہیں۔ بعید نہیں کہ ایک زمانہ و وقت ایسا آئے جب کہ ان کی کتب و آراء کو طاقِ نسیاں کی زیب و زینت بنا دیا جائے اور یہ لوگ بھی زمانہ قبل تاریخ کے غبار میں ایسے ہی گم ہو جائیں جیسا کہ ان سے پہلے لاکھوں اور کروڑوں اصحاب قوانین و شرائع ازمنۂ مظلمہ کی تاریکی میں گم ہو چکے ہیں۔

ابنِ تیمیہ

ابنِ تیمیہ دوشنبہ ۱۰ ربیع ۶۶۱ھ میں حران میں پیدا ہوئے جب تاتاریوں نے حران پر قبضہ کر لیا تو ان کے والد انھیں ساتھ لے کر دمشق تشریف لے آئے۔ فقہ اور اصول کی تحصیل والد ہی سے کی۔ اس کے بعد حساب، الجبرا اور فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابھی ان کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی کہ مسندِ تدریس پر بیٹھ گئے۔ تقریباً تین سو کتب کے مصنف ہیں جن میں سے تعارض العقل والنقل نصاریٰ کے رد میں "الجواب الصحیح"، اثبات المعاد والرد علی ابن سینا، اثبات المعنی اور الرد علی الامامیۃ خاص طور پر قابلِ ذکر اور مشہور ہیں۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں :-

"امام ابنِ تیمیہ کے زمانے میں عوام الناس ایک پتھر کو متبرک مانتے اس پر نذرانے چڑھاتے

اور اُس سے مرادیں مانگتے تھے۔ ماہ رجب سنہ ۷۰۴ھ کا ذکر ہے کہ حضرتِ امام مسجد فارغ میں تشریف لے گئے اور اپنے احباب و تلامذہ کو حکم دیا کہ اس پتھر کو توڑ پھوڑ دیں جس کی اُنھوں نے فوراً تعمیل کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ حضرت امام کی بدولت جہاں اس شرک و بدعتِ خبیثہ کا یہ بت پاش پاش ہوگیا وہاں مسلمانوں کو ایک بہت بڑے شبہے اور بہت بڑی مصیبت و آفت سے نجات مل گئی۔ کچھ تو اس طرح کی باتوں سے لوگ اُن کے دشمن ہو گئے اور کچھ اس وجہ سے کہ اُنھوں نے ابن عربی اور ان کے متبعین کو اپنی تصنیفات میں بُرا بھلا کہا تھا۔ لیکن اس مردِ مجاہد نے اس تمام ضد و عناد اور شر و فساد کی کچھ بھی پروا نہ کی اور ایک لمحہ کے لئے بھی دشمنوں کو خاطر میں نہ لائے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے معاندین اپنی تمام شر انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کے باوجود ان کا ایک بال تک بھی بیکا نہ کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ ایذا جو اُنھوں نے پہنچائی تو صرف یہی کہ امام موصوف کو جیل بھجوا دیا۔ لیکن جو مردانِ حق، زمین کی وسعتوں اور پہنائیوں میں سورج کی روشنی میں جو کام انجام دے سکتے ہیں وہ قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بھی انجام دے سکتے ہیں۔ زمان و مکان کی مصلحتیں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے دامن کو آلودہ نہیں کر سکتیں۔ انھیں جہاں کہیں زمین کا کوئی ٹکڑا میسّر آجاتا ہے، وہیں حق و صداقت کی تخم ریزی اور نہالِ توحید کی آبیاری و پرورش شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ امام موصوف کے بارے میں بھی یہی بات پیش آئی اور ان کے بداندیشوں اور بدخواہوں کی کوئی تدبیر، کوئی حربہ اور کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا، اور حضرت امام سب کے علی الرغم اُس فریضے کو ساری زندگی انجام دیتے رہے جس کی انجام دہی سے خدا کے بنائے ہوئے انسان عموماً ناخوش ہوتے، سزائیں دیتے اور قید خانوں میں ڈلتے رہیں اور جس سے انسانوں کا خدا ہمیشہ خوش ہوتا، جنت الفردوس اور اعلیٰ علیین کا اہل و مستحق ٹھہراتا اور انعام و اکرام اور اجر و ثواب کے پھول برساتا ہے، چنانچہ وہ مصر میں گئے تو وہاں یہی کیا، شام میں گئے تو وہاں یہی۔"

حضرت امام عموماً یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

ولم تکن لی فی القلوب مھابۃ   لم یطعن الاعداء فیّ ویقدحوا

کاللیث لما ھیب خط لہ الزبی   دعوت لھیبتہ الکلاب النبح

یرموننی شزر العیون لاننی   غلست فی طلب العلاء وصبحوا[۵۱]

۱۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ بروز دوشنبہ قید خانے ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا جب آپ کا جنازہ جامع مسجد میں لایا گیا تو اس قدر بے شمار اور لاتعداد لوگوں نے اس میں شرکت کی کہ دمشق کی آنکھ ایسے اجتماع عظیم سے آج تک آشنا نہ ہوئی تھی۔ آپ کی میت کے گرد ایک انبوہ عظیم جمع ہو گیا اور لوگ ان کے غسل کے پانی سے تبرک حاصل کرنے لگے۔ کثرتِ ہجوم کی وجہ سے نمازِ جنازہ کئی مرتبہ پڑھی گئی اور بالآخر صوفیہ کے قبرستان میں اس زرِ خالص اور گنج گرانمایہ کو زمین کے آغوش میں رکھ دیا گیا۔ جنازے میں شریک ہونے والوں کا بیان ہے کہ تقریباً دو لاکھ مردوں اور پندرہ ہزار کے قریب عورتوں نے نماز میں شرکت کی ہو گی۔ جن علماء نے آپ کے مرثیے لکھے ان میں ابن الوردی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

امام ابن تیمیہ کے مختلف تراجم و سوانح حیات کے مطالعہ سے بخوبی یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی ذہن و فکر کیا تھا؟ ہم یہاں آپ کی نگاہ صرف اس ایک بات کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ امام موصوف "صوفیہ کے قبرستان میں دفن ہوئے" اللہ اکبر! غور کیجئے تنہا اس ایک فقرے اور ایک جملے میں صاحب ذوق سلیم کے لئے کتنی بڑی عبرت و موعظت کے دفتر کھلے ہیں جس میں اس سے زیادہ اس سلسلے میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

باوجودیکہ ابن تیمیہ، اسلام کے بلند پایہ اور کبار مفکرین میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی

---

[۵۱] اگر دشمنوں کے دلوں میں میری کوئی وقعت و ہیبت نہ ہوتی تو وہ ہرگز میری عزت میں رخنے نہ نکالتے۔ میری مثال شیر کی ہے۔ چونکہ لوگ اس سے ڈرتے ہیں اس لئے اس کے شکار کے لئے گڑھے کھودتے ہیں اور اس کے خوف سے کتے بھونکتے ہیں۔ معاندین صرف اسی وجہ سے مجھے گھور گھور کر دیکھتے ہیں کہ جن مراتب عالیہ کی طلب میں وہ صبح کی روشنی میں نکلے، میں ان مراتب تک منہ اندھیرے ہی پہنچ چکا تھا۔ (مترجم)

غفلت اور بے احتیاطی کی جھلک واضح اور نمایاں نظر آتی ہے۔ اگر ایک وقت میں آپ انھیں مدرکاتِ معقولہ کے بام رفعت پر جلوہ گر پائیں گے تو دوسرے وقت اوہام کے گڑھوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا دیکھیں گے۔ مثلاً ایک مقام میں کہتے ہیں

"علما ہی انبیا کے وارث و جانشین ہیں۔ اللہ نے ان کو ستاروں کی طرح لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے پیدا کیا ہے۔ سارے مسلمانوں کا یہی عقیدہ اور اسی پر اجماع واتفاق ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت سے قبل کی تمام امم واقوام کے علما شریر تھے یہ خوبی اور خصوصیت صرف مسلمانوں ہی کے حصے میں آئی ہے کہ ان کے علما نیک ہیں۔"[لہ]

یقیناً یہ ایک ایسا بے سروپا دعویٰ ہے جس پر عقلی یا نقلی کوئی سند و دلیل نہیں لائی جاسکتی۔

ابن تیمیہ غزالی کے مخالفین میں اس لئے شمار ہوتے ہیں کہ انھوں نے غزالی کے رد و ابطال میں کئی فصول لکھے، ان کا قول ہے کہ غزالی نے آخری ایام عمر میں صوفیہ کا مسلک و مشرب بالکل ترک کر دیا تھا۔ ایک جگہ کہتے ہیں :-

"غزالی پر آخری عمر میں یہ راز منکشف ہوا کہ تصوف کی راہ سے منزل مقصود تک رسائی ناممکن اور محال ہے لہذا انھوں نے اس راہ کو چھوڑ کر احادیث و آثار نبویہ کی طرف رجوع کیا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مطالعہ کو اپنا آئین و شعار بنایا اور اسی خوشگوار حالت و کیفیت کی اثنا میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی کتابوں میں جن جن باتوں پر لوگوں نے جرح و تنقید کی تھی ان پر بھی وہ بہت نادم تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاش میں ایسی باتیں اپنی تصنیفات میں درج نہ کرتا۔"

ممکن ہے ابن تیمیہ کی یہ اطلاع درست ہو کیوں کہ غزالی واقعی بڑے متلون مزاج اور ہرجائی قسم کے بزرگ تھے۔ انھیں ساری زندگی کبھی ایک حالت پر قرار و ثبات نہیں رہا کبھی وہ فقہ کا جامہ پہنے ہوئے ہیں کبھی تصوف کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور کبھی ان

لہ مقدمہ رفع اسلام

سب کو اتار کر فلسفے کا طیلساں زیب تن کئے ہوئے[1]۔

فلاسفہ اور متصوفین سے ابن تیمیہ کی برہمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ اول الذکر گروہ میں سے کچھ لوگ فیلسوف کو نبی پر اور ثانی الذکر جماعت میں سے کچھ افراد ولی کو نبی پر فوقیت و ترجیح دیتے ہیں۔ ابن سینا سے وہ اس لئے خوش ہیں کہ وہ نبی کو فیلسوف سے برتر قرار دیتے ہیں اور ان کے مشرب کا ابن تیمیہ "دانشمندوں کا مشرب" نام رکھتے ہیں فارابی کے اس لئے دشمن ہیں کہ وہ فیلسوف کو نبی سے بلند تر سمجھتے ہیں اور ان کے مسلک کو "غلو پسندوں" کا مسلک کہتے ہیں۔ محی الدین ابن عربی کو اس لئے برا کہتے ہیں کہ اُن کا دعویٰ ہے کہ میں اور وہ ملک جو نبی کی طرف وحی ہوتا ہے۔ ایک ہی چشمے سے سیراب ہوتے ہیں چونکہ ملک اہلِ تصوف کے ہاں عبارت ہے نبی کے نفس کی کیفیتِ خاصہ سے اس لئے ان کے نزدیک نبی اس کیفیتِ خاصہ سے اور یہ کیفیتِ خاصہ عقل سے مستفیض ہوتی ہے تو اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ محی الدین ابن عربی نبی سے افضل واشرف ہیں کیونکہ انھیں نبی کی طرح کسی واسطے کی حاجت و ضرورت نہیں[2]۔

میں یہاں اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا کام صرف اسلامی افکار و نظریات میں سے کسی فکر و نظریہ کو بلاکم وکاست آپ کے سامنے پیش کر دینا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ایک مورخ کا فرض فقط یہی ہے کہ وہ حقائق و واقعات کو چھانٹ کر کمال دیانت و امانت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دے۔

ابن قیم

ابن قیم، ابن تیمیہ کے شاگرد ہیں ۶۹۱ھ میں پیدا ہوئے بعض آزاد اور جرأت مندانہ

---

[1] ابن رشد غزالی کے متعلق عموماً یہ شعر پڑھا کرتے تھے

یوماً یمان اذا لقیت ذا یمن   وان لقیت معدیاً فعدنان

[2] ترتیب استفاضہ یوں ہوگی۔

عقل
محی الدین ابن عربی ــــــ ملک یا کیفیتِ خاصہ
نبی

نظریات کی وجہ سے انھیں زندگی میں بہت کچھ شدائد و محن کا سامنا کرنا پڑا۔ جب انھوں نے فتویٰ دیا کہ ابراہیم خلیل اللہ کی قبر کی زیارت کے لئے سفر کرنا جائز نہیں تو ایک عرصہ تک کیلئے قید و بند میں ڈال دیا گیا۔ ابن تیمیہ کو جب قید کیا گیا تو یہ بھی اُن کے ساتھ تھے اور استاذ کی وفات کے بعد جیل سے رہائی پائی۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے مدارج السالکین، شرح اسماء الکتاب العزیز، نقد المنقول، المحک الممیز بین المردو و المقبول اور اعلام الموقعین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابن قیم غزالی کے شدید ترین مخالفین میں شمار ہوتے ہیں چونکہ ان کے آراء و نظریات کا ایک معتد بہ حصہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس لئے اعادہ و تکرار میں کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہم نے اس باب میں ایجاز و اختصار کا التزام نہ کیا ہوتا تو ان حضرات کے آراء و افکار کو پورے بسط و تفصیل سے قلمبند کرتے کیوں کہ ان میں جو وقت نگاہ اور جراءت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس کا تقاضا یہی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض مقامات میں یہ لوگ بھی گول مول باتیں کرتے اور کمال احتیاط کے ساتھ بعض راہوں سے بچ بچ کر نکلتے ہیں کیونکہ اس دور میں پورا عالم اسلامی فلاسفہ و مفکرین کے خون کا پیاسا تھا۔ اگر زمانہ ہمیں فلاسفہ اسلام پر کوئی کتاب لکھنے کی مہلت و فرصت دیتا تو ہم ان اعاظم رجال اور نوادر روزگار شخصیتوں پر سے گمنامی کے پردے ایک ایک کر کے چاک کر ڈالتے۔

سبکی

تاج الدین ابو نصر عبدالوہاب بن التقی الدین سبکی المتوفی ۷۷۱ھ بڑے مصنفین میں سے ہیں علم اصول میں ان کی تصنیف جمع الجوامع مغلق اور گنجلک ہونے کے باوجود اس امر کی شاہد ہے کہ انھوں نے علم کی خدمت و چاکری میں کتنی بڑی محنتیں اٹھائی ہیں۔ ان کی تصنیف طبقات الشافعیۃ الکبریٰ فقہی مسائل اور حسن ترتیب کے اعتبار سے معرکۃ الآراء اور چوٹی کی کتاب ہے اس میں عیب اور نقص صرف یہ ہے کہ نقد و تمیز کے پہلو پر اس میں خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اگر سبکی

اپنی تصنیفات میں قوتِ حافظہ ہی پر تنہا اعتماد نہ کرتے تو بعید نہیں کہ دنیا کے علم میں ان کی تصنیفات بے نظیر و بے مثال ہوتیں۔

سبکی غزالی کے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ انھوں نے طبقات میں غزالی کے متعلق تقریباً اسی صفحات لکھے ہیں اور جس جرات و ہمت سے ان کی طرف سے مخالفین کا مقابلہ و دفاع کیا ہے وہ واقعی لائق داد اور قابل صد تحسین و آفرین ہے لیکن حیرت ہے کہ اس علو شان اور علو مرتبہ کے باوجود بعض جگہ سادگی کا شکار نظر آتے ہیں، ایک جگہ کہتے ہیں:

"اگر اسلامی لٹریچر میں احیاء العلوم کے علاوہ اور کوئی کتاب بھی موجود نہ ہوتی تو یہ سب کا بدل ہو سکتی تھی"

چونکہ ہم پہلے کئی جگہ ان کا ذکر کر چکے ہیں لہذا یہاں مزید ذکر و تفصیل کی ضرورت نہیں۔

زبیدی

محمد بن محمد حسینی زبیدی بارہویں صدی کے علما میں سے ہیں۔ انھوں نے دس ضخیم جلدوں میں احیاء کی بسوط شرح لکھی۔ جس کی پہلی جلد بروز جمعہ ۲۵ محرم ۱۱۹۳ھ کو ختم ہوئی اسی جلد میں انھوں نے غزالی کے مخالفین کے اعتراضات کا رد و جواب لکھا ہے

یہ غزالی کے انتہائی عقیدت مند و پرستار بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کے قتیل ہیں لیکن غزالی کی طرف سے جو دفاع انھوں نے کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی وزن اور کوئی جان نظر نہیں آتی، نہ شرعی اعتبار سے اور نہ عقلی اعتبار سے مثلاً ایک جگہ ان کے اس قول کی شرح میں کہ "شادی کرنا دنیا کی طرف میلان کا غماز ہے" کہتے ہیں:

"یہ بات واضح و ظاہر ہے کیونکہ شادی و نکاح سے مقصود عموماً استمتاع ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد بجز اس امر کے حاصل نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنے آپ کو ان خطرات میں ڈال دے جس سے تجرد کے زمانے میں محفوظ و مصئون تھا۔ بالخصوص جب کہ اس کی آمدنی کے ذرائع وسائل بھی مفقود ہوں کیونکہ اس حالت میں وہ لامحالہ دیار و نائش کا شکار ہو جائے گا۔

جو شخص روٹی کا ایک ٹکڑا یا کوئی پرانا چیتھڑا بھی اُس کو دے گا وہ ہر وقت اُس کی خوشامد اور اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا پھرے گا۔ اگر اُس کے سامنے اُس کے محسن کی کوئی مذمت کرے گا تو وہ اس خیال سے اُس کی طرف سے مدافعت کرنے کے لئے مجبور ہوگا کہ مبادا اُس کی مذمت سن کر خاموش رہنے کا حال محسن تک پہنچے اور وہ ناراض ہوکر اُس کو روٹی کپڑے سے محروم کردے۔ لہٰذا اس کی تمام عبادت اور تمام نیکیوں کا مرکز محور اُسی مربی و محسن کی ذات ہو جائے گی۔"

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ استدلال کسی غلط بات کی طرف سے دفاع تو کیا خود فی نفسہٖ بھی کچھ بھی جان اور کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

تیرھواں باب

غزالی اور جدید فلاسفہ کے مابین موازنہ

اس باب کو میں جتنا طول دینا چاہوں دے سکتا ہوں۔ کیونکہ غزالی کے نظریوں سے ملتے جلتے نظریوں کی جدید فلسفے میں کمی نہیں لیکن اختصار کے پیش نظر میں غزالی اور جدید فلاسفہ کے مابین صرف اہم پہلوؤں کے تقابل و موازنہ پر ہی اکتفا کروں گا، میرے لئے تنہا یہی کافی ہے کہ آپ کو اس کوچے کی رسم وراہ سے واقف و آشنا کردوں۔

(۱)

غزالی اور ڈیکارٹ DESCARTES

فلاسفہ میں غزالی سے سب سے زیادہ مشابہ اور ملتی جلتی شخصیت ڈیکارٹ کی ہے کیونکہ اُسے بھی غزالی کی طرح حیرت وشک کے خارزار سے گذرنا پڑا اور طویل عرصے تک تردد و اضطراب نے اُس کے پاؤں کو یقین کی منزل کی طرف اُٹھنے سے روکے رکھا۔

غزالی کے تقریباً ۵۳۰ برس بعد ڈیکارٹ لاہای میں سنہ ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا۔ اپنے ہم عصر دوسرے بچوں کی طرح اس کی تعلیم بھی ایک مسیحی سکول میں ہوئی۔ اپنی خدا داد استعداد و قابلیت

اور ذہن کی بدولت اُس نے جہاں کئی قدیم زبانیں سیکھ پڑھ لیں۔ وہاں قصص، تاریخ، بلاغت شعر، ریاضیات، اخلاق اور الہٰیات میں بھی خاصی دسترس اور مہارت بہم پہنچالی اور جیسا کہ اُس نے خود بیان کیا ہے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جو نادر اور عمدہ کتاب کہیں سے ہاتھ آگئی اُس کا از اول تا آخر مکمل مطالعہ کر ڈالا۔ سولہ برس کی عمر میں پیرس گیا اور وہاں فوج میں ملازم ہو گیا۔ جرمنی، سویڈن اور ڈنمارک کی کئی دفعہ سیاحت کی۔ بالآخر اپنے فلسفیانہ آرا و افکار کے آزادانہ نشر و اشاعت کے لئے اُس کی نگاہ ہالینڈ پر پڑی کیوں کہ اُس زمانے میں فرانس کی جابر و مستبد فضا اس امر کے لئے کسی صورت بھی مساعد و سازگار نہ تھی۔ چنانچہ اسی غرض کے پیش نظر وہ ہالینڈ ہی میں مقیم ہو گیا۔

کامل دس برس تک یہاں اپنے نظریات کی تدوین و ترتیب میں مصروف رہا۔ کرسٹین ملکۂ سویڈن نے اُس سے علم کی تحصیل و استفادے کی خاطر اُسے اپنے پاس بلایا لیکن ڈیکارٹ اس ملک کی شدید سردی کو برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ ایک برس تک سٹوکہلم میں مقیم رہنے کے بعد ۱۶۵۰ء میں انتقال کر گیا۔ ۱۶۶۶ء میں اُس کی لاش فرانس میں لائی گئی اور کنیسہ (SAINT-ETIENNE) میں مدفون ہوا

ڈیکارٹ کی تصنیفات

فرانسیسی علوم و آداب کے مؤرخین کی رائے ہے کہ ڈیکارٹ پہلا شخص ہے جس نے فرانسیسی زبان کو فلسفی مسائل کے اظہار و تعبیر کا ذریعہ و واسطہ بنایا اور فرانسیسی کو فلسفے کی زبان کے مرتبے پر لا کھڑا کیا ورنہ اس سے قبل فلاسفہ و حکماء اپنے علم و حکمت کو لاطینی ہی میں مرتب و مدون کرتے تھے۔ ڈیکارٹ کی تالیفات میں ہمارے موضوع و مطلب کے مفید مندرجہ ذیل کتب ہیں:

(۱) REGLES POUR LA DIRECTION DE 1'ESPRT

(۲) DISCOURS DE LA MÉTHODE

(۳) MEDITATIONS MÉTAPHYSIQRES

LES PRINCIPES DE LA PHILOSOPHIE (۴)

LES PASSIONS DE l'ÂME (۵)

ان تالیفات میں ڈیکارٹ نے اپنے فلسفی نظریات کو کمال بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے چونکہ عربی زبان میں ان کے تراجم تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں اس لئے ان کے مطالعہ کے لئے اصول ہی کی طرف رجوع مناسب ہوگا۔

ڈیکارٹ کے شکوک

جس طرح غزالی کے شک و ارتیاب کا آغاز اس وقت ہوا جب انھوں نے دیکھا کہ عیسائیوں کے بچوں کی تربیت اور نشو و نما عیسائیت پر، یہودیوں کے بچوں کی یہودیت پر مسلمانوں کے بچوں کی اسلام پر ہوتی ہے اور اس میں خود ان بچوں کی رائے کو کوئی دخل نہیں ہوتا بعینہ اسی طرح جب ڈیکارٹ نے دیکھا کہ ہر طرف گمراہی اور تقلید پرستی کی حکمرانی و دور دورہ ہے اور سب انسان دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں، ایک گروہ قدیم رسم و رواج کے بندھنوں میں اس مضبوطی اور سختی سے جکڑا ہوا ہے کہ حق و باطل کو تمیز کرنے اور پرکھنے کا اس کے پاس کوئی معیار اور کوئی کسوٹی ہی نہیں۔ وہ جادۂ عام سے الگ کوئی قدم اٹھانا بھی چاہے تو بھی سر مو اس سے انحراف نہیں کر سکتا لہذا اندھا دھند اور بلا بصیرت و بلا دلیل دوسروں ہی کے نقشِ قدم کو اپنا نشانِ راہ بلکہ نشانِ منزل سمجھتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے اندر تقلید و رسم عام سے بغاوت و سرکشی کی جرأت و ہمت تو رکھتا ہے اور کمال قوت و اعتماد کے ساتھ کسی بات کی صحت و عدم صحت پر بھی حکم لگا سکتا ہے لیکن اس بات کی کیا دلیل اور کیا ثبوت ہے کہ اس کا یہ حکم اور یہ فیصلہ فی الواقع درست اور صحیح بھی ہو۔

مختلف سیاحتوں کے دوران میں ڈیکارٹ نے جب دیکھا کہ ہر ملک اور ہر قوم کے عادات و اطوار و عقائد و نظریات اور رسم و رواج دوسرے ممالک اور دوسری اقوام سے بالکل علیحدہ اور جداگانہ ہیں اور اس فرق و اختلاف کے پیچھے سب سے بڑا ہاتھ ان اقوام

[اور ا]طلاق کے انفصال اور علیحدگی کا ہے تو اُس کے دل میں شک کا جو کانٹا چبھ چکا تھا اُس کا زخم اور گہرا ہو گیا۔

سیر و سفر میں جو مسئلہ بار بار اُس کی نگاہ کے سامنے آیا وہ جمہور و سوادِ اعظم کی رائے کے سامنے سر جھکا دینے کا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ جس طرف اکثریت کی رائے ہو وہ بات حقیقت اور واقعہ میں حق اور صواب بھی ہو کیونکہ پوری کی پوری قوم نے جس بات پر اجماع و اتفاق کا اظہار کیا ہے ممکن ہے کہ نی الواقع وہ تنہا کسی ایک ہی فرد اور ایک ہی شخص کی رائے ہو لیکن مختلف طرق و اسباب سے کام لے کر اُس نے یہ نظریہ ساری کی ساری قوم کے سر تھوپ دیا ہو۔

ڈیکارٹ کے یقین کو متزلزل کر دینے کا ایک اور بڑا قوی باعث مختلف فلاسفہ کی کتب و آراء کا مطالعہ بھی ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ دنیا کا کوئی ایسا دور ازکار اور دور از واقعہ و حقیقت نظریہ نہیں جسے کسی نہ کسی فلاسفر نے اپنایا یا پسند نہ کیا ہو لیکن یہ بات ناچار تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ غزالی کی نسبت ڈیکارٹ اپنے خیالات اور نظریات کے اظہار میں زیادہ جری اور زیادہ بیباک تھا مثال کے طور پر جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ غزالی تقریباً دو ماہ تک (بحکم نطق و مقال نہیں بلکہ بحکم حال) سفسطہ اور لا ادریت کا شکار رہے اور انھوں نے اس حالت و کیفیت کا اظہار و اعتراف اُس وقت تک مطلقاً کسی کے سامنے نہیں کیا جب تک کہ لوگ اُن کو مقدس اور مافوق الفطرت ذات و شخصیت سمجھ کر اُن کے دامنِ تقدس پر سجدہ ریز نہیں ہو گئے۔ وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ڈیکارٹ اپنے شکوک و شبہات کی متاع ساتھ لے کر اُن کے اظہار کے لئے مناسب مواقع کی تلاش میں سرگرم و سرگرداں ہے اور جن نظریات کو کل تک اُس نے حق سمجھ کر اختیار کیا تھا آج برملا اُن سے براءت اور دوری کا اعلان کرتا پھرتا ہے تاکہ اُن سے یکسر پاک ہو کر ایک نئی اور مضبوط بنیاد پر عمدہ اور صالح نظریات کی دوسری دیوار چن سکے۔

محسوسات میں غزالی کے یقین کی دیوار میں یوں گریں کہ انھوں نے دیکھا کہ کسی چیز کے

سائے کو ہم ساکن و غیر متحرک سمجھ کر اس پر فوراً سکون و توقف کا حکم لگا دیتے ہیں لیکن آخر تجربہ و مشاہدہ اور مرورِ وقت اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یہ سایہ واقع میں ساکن نہ تھا بلکہ نہایت تدریج اور بطئیت کے ساتھ حرکت کی مختلف منازل سے گذر رہا تھا۔ عقلیات کی تصدیق میں انھیں شبہ اس وجہ سے ہوا کہ خواب کے عالم میں ہم بہت سے امور کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ ان کی حقیقت و وجود میں کوئی شک اور کوئی شبہ نہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان امور کے وجود و قوام کا سارے کا سارا تار و پود بکھر چکا ہے اور جس چیز کو ہم واقعہ اور حقیقت سمجھتے تھے وہ نفس الامر میں ایک فریب تھی یا موجِ سراب تھی۔ آخر غزالی اپنے آپ ہی سے سوال کرتے ہیں کہ اس بات کا کیا ثبوت اور اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ جن چیزوں کو تم بیداری کی ایک حالت کی نسبت و اضافت سے حسًّا یا عقلاً درست سمجھتے ہو وہ واقع میں بھی درست ہوں، ایسا کیوں ممکن نہیں کہ کل تم پر کوئی اور ایسی حالت طاری ہو جائے جس کو تمہاری بیداری سے بعینہ وہی نسبت ہو جو تمہاری بیداری کو تمہاری نیند سے ہے۔

یہی کیفیت ڈیکارٹ کی ہے وہ کہتا ہے جن چیزوں کے متعلق ہمیں تسلیم ہے کہ وہ دوسری چیزوں کی نسبت زیادہ صحیح اور زیادہ دیرپا ہیں اُن کی صحت و ثبات کا بھی مدار ہم نے حواس ہی پر رکھا ہے حالانکہ ہمیں متعدد مرتبہ اس امر کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ حواس اکثر و بیشتر فریب اور دھوکا دیتے ہیں اسی طرح خواب میں ہم کئی امور کو دیکھتے ہیں لیکن آنکھ کھلنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی کوئی حقیقت نہ تھی، لہذا خواب پر بیداری اور بیداری پر خواب کی فضیلت و ترجیح کا فیصلہ کون کرے اور کس طرح کرے جب کہ اس کا اعتبار ہے نہ اُس کا اعتبار۔

غزالی اور ڈیکارٹ میں فرق

غزالی اور ڈیکارٹ میں بہت بڑا فرق ہے۔ کیوں کہ غزالی کو شک کی وادی سے اُس ہاتھ نے نکالا جو شاید اُن کے علاوہ اور کسی کی بھی منزل یقین کی طرف رہنمائی نہیں کرتا

یعنی اللہ کے نور نے اس وادی ظلمات سے نکلنے میں اُن کی اعانت و دست گیری کی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ چونکہ اللہ کا نور ایک ایسی عجیب و غریب چیز ہے جس سے علم و حکمت متعارف و آشنا ہی نہیں لہذا وہ اس کے لیے منظم اصول و قواعد معین و مرتب کرنے میں بھی عاجز و قاصر اور بے بس ہیں۔ اس بات کو غزالی نے بھی شدت سے محسوس کیا چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں :۔

"جو شخص یہ سمجھے کہ کشفِ حقیقت منطقی قیاسات اور دلیل پر موقوف ہے اس نے اللہ کی رحمت بے پایاں اور وسیع ترین دامن کو محدود اور تنگ کر دیا"

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ (فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ) میں "شرح" کا کیا معنی و مفہوم ہے تو آپ نے فرمایا :۔

"اس سے مراد وہ نور ہے جس کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کسی مومن کے قلب میں القاء فرماتے ہیں اور اس سے مومن کا سینہ کھل جاتا ہے"

کسی نے پوچھا کہ حضرت اس کی علامت کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا :۔

"دارِ غرور (دنیا) سے یکسوئی اور دارِ خلود (آخرت) کی طرف رجوع و انابت"

غزالی کہتے ہیں یہی مراد ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے کہ :۔

"اللہ نے مخلوقات کو ظلمت و تاریکی میں پیدا کیا اور پھر اس پر اپنے نور کا ایک چھینٹا دیا"

لہذا مومن کا فرض ہے کہ وہ کشفِ حقیقت کا اسی نور سے طلب گار ہو۔

چونکہ غزالی اپنے قول کے مطابق شکوک و شبہات کی ناہمواریوں سے کسی نظم و ترتیب کے ساتھ نکل کر یقین کی شاہراہ پر نہیں آئے۔ لہذا عبث اور لاحاصل ہے کہ ہم شکوک کی تاریکیوں سے نکلنے کے لیے عقل اور منطق کا چراغ ہاتھ میں لیں۔ ڈیکارٹ کی حالت غزالی کے بالکل برعکس اور متناقض واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں غزالی کے ہاتھ نے مشرق میں فلسفے کی شمع گل کر دی وہاں ڈیکارٹ نے مغرب میں فلسفے کی ایک نئی شمع جلا دی۔

ڈیکارٹ کا اسلوب

ڈیکارٹ نے تدبیر و مصلحت کے خلاف سمجھا کہ اپنے ملک کے عام عادات و اطوار اور قوانین و آئین کے خلاف علم بغاوت بلند کرے بلکہ اس کے برعکس اس نے طریق کار یہ اختیار کیا کہ اپنے قدیمی اور موروثی مذہب کا ہر طرح پابند رہے تاکہ معاصرین کو اس پر تنقید اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ و گنجائش ہی نہ ملے اور اس طرح وہ کامل سکون و طمانیت کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنے آرا و افکار کو نہایت خوبی سے مرتب و مجتمع کر سکے۔

پول جانیہ (PAUL JANET) کہتا ہے کہ:۔

"جب ڈیکارٹ نے محسوس کیا کہ اس زمانے کے رائج و متداول علوم ایک محقق کی پیاس بجھانے کے لیے بالکل ناکافی ہیں تو اس نے اپنے آپ کو مونتینی (MONTUIGNE) کی طرح شک و ارتیاب کے حوالے نہیں کر دیا بلکہ اس امر کا پختہ عزم کر لیا کہ وہ خود نئی بنیادوں پر علم کا عظیم الشان قصر تعمیر کرے گا۔"

اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزالی شکوک کے حملے کی تاب نہ لا کر سپر انداز اور بے بس ہو گئے تھے لیکن انھوں نے شکست کا اعتراف نہیں کیا اور مونتینی کی طرح نہ تو شک کی حکومت و تسلط کو تسلیم کیا اور نہ ڈیکارٹ کی طرح کسی نئی بنیاد پر علم کا سر بفلک محل تعمیر کرنے کی ٹھان لی بلکہ تھک کر بیٹھ گئے اور اللہ کی ہدایت و رحمت کا انتظار کرنے لگے۔ واللّٰہ یھدی من یشاء۔

ڈیکارٹ نے سب سے پہلے اس امر کی طرف دعوت دی کہ کتب و اوراق کو یکسر ترک کر دیا جائے اور ہر معاملے میں عقل ہی کو حکم اور ثالث قرار دیا جائے کیونکہ ڈیکارٹ کی رائے میں موٹی موٹی کتابیں جو بے شمار قسم کی آراء و نظریات پر مشتمل ہیں وہ حقیقت و واقعہ سے ان عام اور سیدھے سادے تصورات کی نسبت زیادہ دور ہیں جنھیں ایک صاحب ذوق سلیم اشیاء کے قریبی معاینہ و مشاہدہ سے خود بخود اول وہلہ ہی میں جان جاتا ہے۔ ڈیکارٹ کی نگاہ میں سب سے اہم مسئلہ یہ نہیں کہ ہم اس امر پر غور و خوض اور محنت و کد و کاوش کریں کہ متقدمین کا

انداز فکر کیا تھا بلکہ اہم اور سب سے مقدم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے اندر حسن تفکیر کا ملکہ و سلیقہ کیونکر اور کس طرح پیدا کریں کیونکہ ڈیکارٹ کے نزدیک جس عمارت کی تعمیر میں کئی مہندسوں کے دماغ شریک ہوں اُس کی نسبت وہ عمارت زیادہ خوبصورت، زیادہ دلکش اور زیادہ جاذب نظر ہوگی جس میں تنہا ایک ہی انجینیر کا دماغ کام کرتا رہا ہو کیونکہ حسن و جمال کے منجملہ اسباب کے ایک بڑا سبب وحدتِ ذوق اور وحدتِ نظر بھی ہے۔

ڈیکارٹ کی رائے ہے کہ جدید فلسفے کی وضع و ترتیب کے لئے اسلوب و انداز بھی نیا ہی درکار ہے۔ چونکہ تمام اسالیب میں ریاضی کا اسلوب ہی تنہا ایسا ہے جو فکر کو ہر طرح کی لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچائے رکھنے کا واحد ضامن وکفیل ہے لہذا حقائق اشیا کا سراغ اور پتہ لگانے کے لئے ہمیں اسی اسلوب سے استعانت واستمداد اور اسی پر دوسرے اسالیب کی نسبت زیادہ بھروسہ اور زیادہ اعتماد کرنا چاہیئے۔

چنانچہ اسی اسلوب سے کام لینے کے لئے ڈیکارٹ نے مندرجہ ذیل چار قواعد وضع کئے ہیں

(اول) کسی چیز کے حق و صواب ہونے پر اس وقت تک ایمان نہ لایا جائے جب تک کہ کمال وضوح کے ساتھ ہمیں اس کی حقیقت و ماہیت کا پورا علم نہ ہو جائے۔

(دوم) کسی مشکل مسئلے کے حل کرنے کی آسان اور سہل ترکیب یہ ہے کہ جن جن اجزا پر وہ مشتمل ہے اُن کا ہر ممکن تجزیہ اور تحلیل کر دی جائے۔

(سوم) فکر کا آغاز نہایت نظم و ترتیب سے کیا جائے اور جو موضوعات سہل اور بسیط ہوں، اُن پر پہلے غور کیا جائے تاکہ موضوعاتِ مرکبہ تک پہنچنے میں آسانی اور سہولت ہو۔

(چہارم) جو موضوعات آپس میں ایک ترتیب طبعی رکھتے ہیں اُن کے لئے ایک الگ نظام فرض کیا جائے۔ پول جانیہ کہتا ہے:

"ڈیکارٹ کے ذہن میں مندرجہ صدر چاروں قواعد کا تصور و مفہوم نہایت تنگ اور محدود ہے۔ مثلاً بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ پہلا قاعدہ نہایت عام اور سیدھا سادا ہے اور اس میں کوئی

اہم نہیں لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے کیوں کہ ہر قسم کے دباؤ اور اقتدار سے غفلت و قطع نظر اور عقل کے لئے استقلال خلق کا اقرار و اعتراف ایک ایسی بات ہے جو سترھویں صدی کے اوائل میں بہت بڑی جرات اور بہت بڑی بدعت کے مرادف تھی۔ اس طرح پہلے قاعدے میں وضوح کے لفظ کو لیجیے چاہے جس چیز کو بھی ہم پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ تسلیم کریں وہ حقیقت میں واضح کبھی نہیں ہوتی کیوں کہ اس کے وضوح و سطوع کے لئے شرط اول یہ ہے کہ ہماری عقل، حواس اور خیال کے اثرات سے بالکل پاک اور دور ہو تاکہ کمال وضوح و تمیز سے افکار و تصورات کا ادراک کر سکے۔ اس لئے کہ جہاں حواس کے مدرکات نہایت گڈمڈ اور باہم مختلط اور غیر مرتب ہوتے ہیں وہاں آرائے معقولہ جو عقل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہیں وہ نہایت واضح و متمیز ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ واضح محسوس کا دنیا میں کہیں وجود اور کہیں پتہ و نشان نہیں بلکہ جو چیز واضح ہوگی اس کے متعلق ہمیں لامحالہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس نے محسوسات کے افق کو نہیں بلکہ معقولات کی سطح کو اپنے حسن کی جلوہ گاہ بنایا ہے[1]۔

جو جارحہ براہ راست حقیقت و ماہیت شئے کا ادراک کرتا ہے وہ بصیرت (INTUITION) ہے اور اس سے ڈیکارٹ کی مراد حواس و خیال کے وہ احکام نہیں ہیں جن میں تغیر ہوتا رہتا ہے بلکہ اس سے مراد عقل سلیم اور عقل بیدار کا ادراک ہے یعنی وہ سہل اور واضح ادراک جس کے دامن تک شک کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ ادراک صرف وہی ہو سکتا ہے۔ جو قلب کی قوت و روشنی سے وجود پذیر ہو۔

ڈیکارٹ کی رائے میں اس بصیرت کی بدولت دبموجب ہر انسان کے امکان و استطاعت میں ہے کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کی ذات موجود ہے اور وہ بذاتہ عقل و فکر سے کام لے رہا ہے

---

[1] ہم نے (NOUVEAUTE) کا ترجمہ بدعت کیا ہے کیوں کہ اس کے قریب ترین مفہوم و مراد کو یہی لفظ ادا کرتا ہے۔ مترجم
سے یعنی وہ چیز محسوس نہیں معقول ہے۔ مترجم

اسی طرح اس بات کا علم وادراک بھی اس کی قدرت و طاقت میں ہے کہ ایک دو کا نصف اور ۲+۲=۴ جس طرح ۳+۱=۴ ہیں کیونکہ ان احکام کا حصول وادراک نہایت بدیہی اور نہایت واضح و جلی ہے۔

ڈیکارٹ سب سے پہلے فکر کا آغاز اپنے ہی نفس و وجود سے کرتا ہے۔ وہ فرض کرتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ سب باطل اور بے حقیقت ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دنیا میں کسی بھی چیز کی کوئی حقیقت موجود ہے بلکہ اس سے تو ثابت ہوا کہ کارخانہ عالم کے تمام کھیل پرزے محض فرضی اور اعتباری ہیں لیکن ڈیکارٹ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ان تمام امور کے باوجود بھی اتنی بات باقی اور ثابت ہے کہ کوئی انسان حقائق اشیا میں شک سے کام لے رہا ہے اور بلا محالہ وہ انسان حقیقت و نفس الامر میں ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ڈیکارٹ اپنا مشہور جملہ دہراتا ہے UE PENSE, DONE JE SUIS چونکہ میں عقل و فکر سے کام لے رہا ہوں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ میں موجود ہوں۔ ڈیکارٹ اس امر میں کوئی حرج اور کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ انسانی فکر و تصور میں کبھی کبھار فریب اور دھوکا یا غلطی بھی کھا جائے (کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ اس نے ایک آدھ دفعہ کسی حقیقت کے ادراک میں خفیف سی لغزش اور ٹھوکر کھائی ہے۔ لیکن یہ بات اس کے اپنے وجود و ذات نفس الامری کے منافی نہیں ہے۔ ڈیکارٹ کی رائے میں ہم بعض اوقات ایسی چیزوں کی طرف راغب و مشتاق ہوتے ہیں۔ جن کا اعیان خارجیہ میں کہیں وجود نہیں اس حالت میں گو مرغوب فیہ اور مشتاق الیہ اشیا موہوم ہیں لیکن ان کی طرف رغبت و اشتیاق واقعی اور حقیقی ہے فرضی اور وہمی نہیں

حاصل کلام یہ کہ ڈیکارٹ کے اسلوب میں اس کے فکر سے واضح تر اور روشن تر کوئی چیز نہیں لہذا سب سے پہلے وہ اپنے ہر وجود پر ایمان لاتا ہے اور اس کے

بعد اپنے وجود سے خارج اشیا کے ادراک کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ اشیاء جس درجہ واضح ہوں اُسی درجہ اُن کے وجود کا سراغ لگانا چاہتا ہے کیوں کہ اُس کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کے متعلق یہ پورا معلوم نہ ہو کہ ماہو؟ یعنی وہ کیا ہے اُس وقت تک ہم اُسے حق سمجھ کر قبول نہیں کر سکتے۔

فلسفۂ ڈیکارٹ کے مؤیدین و مخالفین بے شمار ہیں لیکن وقت اور فرصت کی تنگی کے باعث ہم اس پر تنقید یا اُس کی طرف سے دفاع کو تفصیل سے قلمبند نہیں کر سکتے۔ بعید نہیں کہ کبھی مستقبل میں اس پر کوئی مستقل کتاب لکھنے کا کوئی موقع و فرصت میسر آئے۔

(۲)

غزالی اور پسکال (PASCAL)

پسکال ۱۸ر جون ۱۶۲۳ء کو کلیرمون میں پیدا ہوا۔ ۱۶۳۱ء میں اُس کا باپ اُسے ساتھ لے کر پیرس آگیا جہاں اُسے مشاہیر علمائے ربط واتصال پیدا کرنے کا موقعہ ملا۔ پسکال کا پہلا استاذ خود اس کا باپ ہے۔ اُسی نے سب سے پہلے اس میں قوت تفکیر اور حسن استنباط کا ملکہ و سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کی اوائل عمر میں اسے ریاضت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ عنفوانِ شباب ہی میں اس نے اس فن پر کئی کتابیں لکھیں۔ آگے چل کر اُس کا میلان و رجحان فلسفے کی طرف ہو گیا لیکن چونکہ اُس کی صحت خراب ہو گئی اور وہ عزلت و انفراد کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لہذا اُس نے بجائے عقل کی رہنمائی قبول کرنے کے اپنے آپ کو مذہبی خرافات واوہام کی تاریکیوں میں گم کر دیا۔

پسکال کو بڑی شہرت اُس کی کتاب الافکار (PENSEES) کی وجہ سے ہوئی۔ یہ اُس کے کچھ آرا و نظریات کا مجموعہ ہے جو اُس کی موت کے بعد شائع ہوا۔ اس کی دوسری کتاب LETTRES PROVINCIALES ہے جو عبّاد و زہّاد کی زندگی کے بارے میں اس کی

رائے کی ترجمانی کرتی ہے

غزالی اور پسکال میں وجہ مشابہت یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنی زندگی کا آغاز نہایت قوت وشوکت اور طمطراق سے کیا لیکن آگے چل کر چونکہ ان کی صحت نے وفا نہ کی لہذا دونوں نے زہد وعبادت کی اوٹ اور گمنامی کے گوشے میں پناہ لینے کو غنیمت سمجھا۔ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ غزالی نے کس طرح ہر علم کو کمال شوق سے حاصل کیا، ہر مذہب کا کس عمیق نظر سے مطالعہ کیا۔ تمام فرقوں کی عقائد کی گہرائیوں کو کس خوبی سے ناپا لیکن آخر میں آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ کس بری طرح صوفیہ کے وساوس واوہام کا شکار ہو گئے اور اُن کے مذہب ومشرب کے علاوہ تمام مذاہب ومشارب کو کس طرح انھوں نے ضلالت وگمراہی کا منبع وسرچشمہ قرار دیا۔

پسکال نے بھی اپنی علمی زندگی کا آغاز ڈیکارٹ کے مذہب کی تائید ونصرت عقل کی تحکیم اور قدیم اوہام کے خلاف شدید اور پیہم جنگ سے کیا حتیٰ کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ بڑی بڑی خواہشات (مثلاً محبت اور طمع) جن سے بعض اوقات نہایت عظیم اور اہم کارنامے وجود وظہور میں آتے ہیں اُن کی طرف سے پسکال نے کتنی جرأت وشجاعت سے دفاع کیا ہے[1] لیکن آگے چل کر اُس کی صحت روز بروز گرتی شروع ہو گئی اور وہ (PORT ROYAL) میں عزلت وخلوت کی زندگی اختیار کرنے کے لئے مجبور ہو گیا اور ہلال جانیہ کے قول کے مطابق وہ فلسفۂ صوفیہ جس کا اُس نے موسیو دی ساسی کے مکالمے میں خلاصہ مرتب کیا تھا اُسی پر قناعت واکتفاء کر کے بیٹھ گیا۔ آگے چل کر اسے بھی ترک کر دیا اور صرف انجیل ہی کے مطالعہ کو اپنے لئے مایۂ ہزار سعادت سمجھا۔

پسکال کو غزالی سے جو چیز قریب تر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ پسکال بھی غزالی کی طرح طبیعت و فطرتِ انسانی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اُس کی رائے ہے کہ انسان فطرت وجبلت ہی سے کچھ ایسی برائیوں کا بوجھ لئے ہوئے ہے جو بجز عنایت وفضل الٰہی کے اور کوئی اس کے کاندھوں سے گرا نہیں سکتا۔ دنیا میں کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں جس کی اگلی حقیقت وصواب اور ایمان وایقان

---

[1] ملاحظہ ہو DISCOURS SUR LES PASSIONS DE l'AMOUR

کی منزل کی طرف اشارہ کرتی ہو بلکہ یہاں کی ہر چیز انسان کو فریب اور دغا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ اور باوجودیکہ عقل اور حواس حقائق کے ادراک کے لئے بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہیں لیکن یہ بھی بجائے حقائق تک پہنچانے کے راہ ہی میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر انسان دوسرے انسان کو دھوکا دینے کے درپے ہے۔ اگر کبھی ایک پل اور ایک لمحہ کے لئے آپس میں ایک دوسرے کی تعریف بھی کرتے ہیں تو وہ بھی اس لئے کہ سچ اور حقیقت کے تلخ جام کے گھونٹ کسی کو گوارا نہیں۔ ایک آدمی جو تمہارے سامنے تمہاری تعریف کے پل باندھتا ہے۔ تمہاری غیبت اور تمہاری غیر حاضری میں ایک لفظ بھی تمہاری تعریف میں زبان سے نہیں نکالتا تو گویا پسکال کی رائے میں انسان جھوٹ، ریا اور نفاق کی ایک پیکر و تمثال ہے۔

عقل و خرد کی تحقیر و توہین میں بھی پسکال نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا چنانچہ آخر میں اس سے بیزاری اور دوری ڈھونڈتے ہوئے نہایت حسرت و افسوس کے لہجے میں کہتا ہے

"اے کاش مجھے سب کچھ وحی و شعور سے معلوم ہو جاتا اور عقل جیسی حقیر و بے مایہ چیز کا مجھے منت کش و احسان پذیر نہ ہونا پڑتا۔"

عقل سے پسکال کی مخالفت و دشمنی کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس کی رائے میں عقل، شک کے دہکتے ہوئے کوئلوں پر کروٹیں بدلواتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس نے پکار پکار کر کہا کہ

"عقل کے راستے سے کوئی شخص دین کی بارگاہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس تک پہنچنے کی صرف ایک ہی راہ ہے، دل کا شعور و وجدان اور اللہ کی ہدایت و رہنمائی۔ ممکن ہے کبھی عقل بھی کسی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے مذہب کی دیوار کے سائے میں لا کھڑا کرے لیکن اس قسم کا مذہب نجاتِ اخروی کے باب میں مفید و سود مند نہیں۔"

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عقل پر یہ حکم لگانے میں پسکال نے کتنی غیر معمولی زیادتی اور کتنی ناانصافی سے کام لیا ہے۔

---

(۳)

غزالی اور ہوبس (HOBBES)

ہوبس ۱۵۸۸ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا چالیس برس کی عمر میں پیرس آیا جہاں کچھ عرصہ
تک ریاضیات اور علوم طبیعت کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ جب دوسری مرتبہ پھر فرانس آیا
تو طویل مدت تک یہاں مقیم رہا۔ مولییر اور وولٹیر کے مربی و محسن اور مشہور و معروف فیلسوف
جندی سے اُس کے گہرے اور مضبوط روابط و تعلقات کی بنیاد یہیں پڑی۔ آخر ۱۶۷۹ء میں
انگلینڈ میں انتقال کیا۔

ہوبس کی مشہور ترین تصانیف (1A NATURE HUMAINE) (1EVIATHAN)
(JA MATIERE JA FORM ET 1'AUTORLITE DE GOUVERNEMENT) ہیں۔ موخرالذکر
کتاب میں اُس نے خود غرضی اور جبر و استبداد کی طرف سے سیر حاصل دفاع کیا ہے۔ ہوبس
نہایت غالی اور کٹر قسم کا مادہ پرست ہے۔ اُس کی رائے میں احساس عبارت ہے نخاع کی
منجملہ حرکات کے ایک حرکت سے اور جب یہ حرکت، حیوی وظائف سے ہم آہنگ و متفق ہو
تو اس میں ایک گونہ لذت پیدا ہو جاتی ہے اور اسی لذت سے رغبت اور رغبت سے ارادہ
وجود میں آتا ہے تو گویا ارادہ نام ہے رغبتِ غالبہ کا۔ ہوبس کہتا ہے کہ کوئی سا بھی عمل کیوں
نہ ہو اُس کا باعث و سبب یا تو طلب لذت ہوگی اور یا الم سے نفرت و فرار[1]۔ عواطف و جذبات
اس کے نزدیک حبِ ذات کے مختلف مظاہر و صور کا نام ہے۔

ہوبس اُن لوگوں میں سے ہے جو نظریہ عقد اجتماعی (CONTRAT SOCIAL) کے
قائل ہیں اور اسی نظریے کو بعد میں جان جاک روسو نے بڑا فروغ دیا۔ ہوبس کی رائے ہے کہ
خود غرضی اور ہوس، انسان کی فطرت و خمیر میں موجود ہے، لہذا اُس کے تمام اعمال و افعال
کا مرکز و محور یہی دو چیزیں ہیں چونکہ ایک قوی و توانا آدمی ہر وقت ایک ضعیف و کمزور آدمی کے

---

[1] اس کو قدیم فلسفے میں دفع مضرت اور جلب منفعت کہتے ہیں میری رائے میں یہ قدیم تعبیر و اصطلاح معنی و مفہوم کو زیادہ خوبی و عمدگی سے ادا کرتی ہے۔ (مترجم)

درپے آزار رہتا ہے اس لئے طبعی زندگی نہایت تلخ اور المناک ہو گئی ہے۔ ہوبس کا خیال ہے کہ ہمارے قدیم آبا وَ اجداد نے زورمندوں کی شر و مصیبت سے ہی بچنے کے لئے حکومت کے باقاعدہ نظام کو اختیار کیا تھا اور ملوکیت و بادشاہیت کا وجود و تصور بھی اسی خاطر ظہور میں آیا۔ انھوں نے تمام وہ حقوق جو سمجھوتے سے قبل افراد کو حاصل تھے سمجھوتے کے بعد پورے کے پورے بادشاہ کو مفوض کر دیئے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کا سب سے بڑا فرض حفظِ امن اور بقائے نظام قرار پایا۔

اپنے نظریہ کی تائید میں ہوبس کہتا ہے کہ دینِ حق وہی ہے جو حکومت اختیار کرلے چاہے اس کا جوہر و حقیقت اور تار و پود کچھ بھی کیوں نہ ہو، ہر فرد کا فرض اولین ہے کہ وہ حکومت کے اختیار کردہ دین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور جو اس کے ربقۂ اطاعت سے سرِ مو بھی تجاوز و انحراف کرے وہ کافر ہے باغی ہے۔

متذکرۂ صدر امور سے صاف ظاہر ہے کہ ہوبس کے نظریہ عقد اجتماعی سے ساری غرض و غایت ملوکیت کی تائید و اعانت ہے لیکن روسو کی رائے اس سے مختلف ہے چنانچہ ایک جگہ اس نظریہ کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

> "طبعی زندگی نہایت سادہ اور پر لطف تھی لیکن جب کچھ بد عمل اور شریر لوگوں نے اپنی بد عملیوں اور شرارتوں سے اسے منغص کر دیا تو معاشرۂ انسانی کو اس امر کی ضرورت و حاجت لاحق ہوئی کہ اس کا ہر ہر فرد اپنی حریت و آزادی کے ایک جزو سے دست بردار ہو جائے تاکہ اس مجموعۂ اجزاء سے ایک قوتِ مدنیہ کا ڈھانچہ تیار ہو سکے جو تمام لوگوں کی طرف سے دفاع کے قابل و اہل ہو لیکن یہ قوت جیسی کہ ہوبس کی رائے ہے بادشاہ کو مفوض نہیں کی گئی بلکہ قوم کے اس منتخب نمائندے کو سونپی گئی ہے جسے معزول کرنے اور گدی سے اتارنے کا قوم کو ہر وقت حق و اختیار حاصل ہے۔"

یہاں تک آپ دیکھیں گے کہ ہوبس اور غزالی میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مناسبت و مشابہت بھی موجود نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں میں وجہ مشترک تلاش کرنا ہے بھی مشکل۔ کیونکہ غزالی

جہاں قربانی اور ایثار کا ایک مجسم پیکر ہیں اور ان کے ہاں خیر کا سارا مرکز و محور انسانوں کی بہبودی اور نفع رسانی ہے۔ وہاں ہوبس کے نزدیک خیر کا سارا مدار نفعِ ذات اور حبِ ذات پر ہے اور قبل اس کے کہ انسان دوسروں کی نفع رسانی کی تدبیریں سوچے اس کا فرض ہے کہ سب سے پہلے اپنی ہی ذات کو نفع پہنچانے کی فکر و تدبیر کرے لیکن بہت کچھ غور و فکر اور بحث و تحقیق کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غایت و مقصد اخلاق میں گو دونوں کے نظریے مختلف ہیں لیکن عام طبیعت انسانی کا نقطۂ نگاہ متعین کرنے میں دونوں متفق ہیں کیونکہ جہاں ہوبس کی رائے ہے کہ انسان کے جمیع اعمال خود غرضی کا مظہر ہیں اور ہمسائے سے ہمدردی و مروت کا سلوک بھی حقیقت میں حبِ نفس ہی کی ایک قسم ہے اور اخلاقی قوانین کی اطاعت بھی فی الواقع نفس ہی کو نفع پہنچانے کا ایک حیلہ و بہانہ ہے وہاں غزالی بھی اکثر صلحاء پر ریاء و سمعت کی تہمت لگاتے اور حبِ ذات ہی کا انھیں طعن دیتے ہیں۔

غزالی فطرت انسانی کو بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اُن کی رائے ہے کہ تمام اعمال سے عموماً مقصود، مزد و صلہ کا حصول یا کسی تکلیف اور اذیت سے اپنے آپ کو محفوظ و مامون بنانا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ غزالی طویل عرصے تک فطرت انسانی کے مطالعہ میں مصروف رہے اور رشک دار تیاب کا پیمانہ ہاتھ میں لے کر انسانی جبلت کی گہرائیوں کو ناپتے پھرے تا آنکہ طویل بحث و تفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ریاء کے بعض اقسام چیونٹی کی رفتار سے بھی زیادہ مخفی اور پوشیدہ ہیں" ایک جگہ کہتے ہیں

"بعض انسان اپنے عمل میں نہایت مخلص ہوتے ہیں لیکن جب اُن کی نیکی و صلاح پر دوسرے لوگ مطلع و آگاہ ہوں تو ان اصحابِ عمل کو اس سے خوشی و مسرت ہوتی ہے۔ اُن کی یہ خوشی اس امر کا صاف پتہ دیتی ہے کہ ان کے دل کے کسی نہ کسی دور دراز گوشے میں ریاء کے جراثیم موجود تھے کیونکہ اگر انھیں لوگوں کی نفرت و محبت اور رد و قبول سے کوئی اعتنا نہ ہوتا تو انھیں یہ خوشی و مسرت کیوں ہوتی؟"

ہوبس اور غزالی میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر چاہتا ہے کہ فطرتِ انسانی کے نقطۂ نگاہ ہی کو اخلاق کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے تو گویا خیر وہ ہو گی جس سے خود انسان کی ذات کو فائدہ پہنچے، شر وہ ہو گی جس سے خود انسان کو نقصان اور ضرر پہنچے۔ لیکن غزالی کی رائے میں خیر تنہا وہی ہو سکتی ہے جس سے اگر اپنی ذات کو فائدہ پہنچے تو دوسرے کی ذات کو نقصان ہرگز نہ پہنچے۔ دونوں کے نقطۂ نگاہ کے فرق و اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غزالی کا نقطۂ نگاہ خالصتًا اسلامی ہے جس کی رو سے خود نقصان اٹھانا یا دوسرے کو نقصان پہنچانا دونوں مذموم ہیں[1]۔

(۴)
غزالی اور بٹلر (BUTLER)

بٹلر انگریز فلاسفر ہے ۱۶۹۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۵۲ء میں وفات پائی۔ بٹلر فطرتِ انسانی کے بارے میں غزالی کی نسبت زیادہ حسنِ ظن اور زیادہ خوش اعتمادی رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کسی عمل کی طرف اقدام سے قبل خود بخود اس امر کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا یہ عمل واقع میں صحیح و صواب ہے یا خطاء و غیر صواب۔ اس صحت و خطا کے جاننے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ کچھ اخلاقی مباحث یا کسی اخلاقی معیار کا بھی عالم ہو۔ اس کی رائے ہے کہ قانونِ اخلاق کی اطاعت و پابندی صرف اسی لئے لازمی ہے کہ اس کا سارا دار و مدار باطن پر ہے اور اس باطن اور حبِ ذات میں کوئی فرق نہیں۔ لہذا سعادتِ حقیقی تک پہنچانے کے لئے یہ دونوں برابر اور یکساں ممد و معاون ہیں۔ بٹلر کے ہاں کسی انسان کا فرض اور اس کی منفعت دونوں ایک ہی ہیں لہذا بٹلر اور غزالی اس نقطے پر تقریبًا متفق نظر آتے ہیں کیونکہ غزالی کا نظریہ خالصتًا اسلامی ہے اور اسلام کی رائے میں منفعتِ انسانی فرضِ انسانی ہی میں مضمر ہے اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں منفعت پائی جائے وہاں فرض کا وجود بھی ضروری ہو

---

[1] غالبًا اس سے مراد ظلم اور انظلام ہے اور واقعی دنیائے اخلاق میں یہ دونوں خلق مذموم ہیں۔ مترجم

ہاں الّا یہ کہ آپ انسان کے لئے نافع و مفید سے مراد نافع بالذات اور نافع فی نفس الامر لیں تو اس صورت میں فرض اور منفعت دونوں باہم لازم و ملزوم ہو جائیں گے۔ بٹلر کی رائے میں فرض اور منفعت کا کامل لزوم و اتفاق، امور اخرویہ کے ساتھ مقید و مخصوص ہے۔ لیکن دنیوی امور سوان میں کبھی یہ دونوں متلازمین کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کبھی متفارقین کی۔

بٹلر کا عمدہ ترین فیصلہ و رائے یہ ہے کہ فضائلِ اخلاق عینِ قانونِ فطرت و طبیعت ہیں۔ اس کے برعکس غزالی کہتے ہیں کہ یہ قانونِ طبیعت کے جوہر و حقیقتِ ذات میں موجود نہیں ہیں بلکہ بعد میں آکر اس کو عارض و طاری ہوئے ہیں۔

(۵)

غزالی اور کارلائل (KARLYLE)

کارلائل ۱۷۹۵ء میں سکاٹ لینڈ کے جنوب میں کل فکان نامی ایک قریہ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد معمار تھا۔ ابتدائی علوم کی تحصیل اس نے اپنے گاؤں میں کی۔ تیرہ برس کی عمر میں اڈنبرگ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ انیس برس کی عمر میں انان کے ایک سکول میں ماسٹر ہو گیا۔ تین برس بعد کرکالدی کے مدرسہ میں اسے صدر مدرس لے لیا گیا۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے تعلیم کے پیشے کو خیرباد کہدیا اور واپس اڈنبرگ آ گیا۔ اب حیران تھا کہ کیا مشغلہ اختیار کرے۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد اس نے علم معادن کی تحصیل کا ارادہ کیا جس کے لئے اُسے اول جرمن زبان سیکھنا پڑی جو آگے چل کر اس کی شہرت و ناموری کا قوی باعث و سبب ہوئی۔ ۱۸۸۱ء میں اس نے وفات پائی۔

کارلائل چوٹی کا فیلسوف ہے اور جن فلاسفہ نے ادیان و مذاہب کی طرف سے مقابلہ و دفاع کیا ہے۔ اُن سب کا سرگروہ و سرخیل ہے۔ مذاہب کی طرف سے دفاع کا جذبہ اس میں اس قدر شدید اور غالب تھا کہ اُس نے وثنیت اور بت پرستی تک کی طرف سے دفاع کر ڈالا کیوں کہ اُس کی رائے میں وثنیت کا آغاز بھی اس امر سے ہوا کہ انسان کی آنکھ بعض اشیاء کے

فرطِ حسن و جمال کے نظارے سے عاجز و خیرہ ہو گئی اور کچھ عرصہ بعد اسی تعجب و خیرگی نے تقدیس و تنزیہہ اور عبادت و پرستش کا جامہ و لباس پہن لیا۔ قدیم اقوام نے بعض چیزوں کی صرف اس بنا پر پرستش کی ہے کہ یہ چیزیں یا تو ان کی نگاہ میں خود الٰہ تھیں یا الٰہ کا مظہر و تمثال۔ کارلائل کا سب سے زندہ و جاوید کارنامہ اُس کی کتاب الابطال ہے جس کا جناب محمد سباعی نے عربی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو مفصل اور طویل باب ہے اُس نے اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے زاویۂ نظر کے بدلنے میں حیرت انگیز امداد دی ہے چنانچہ اس کتاب میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"یہ بڑے ننگ و عار اور ذلت و شرم کی بات ہے کہ عصرِ جدید کا ایک تعلیم یافتہ و مہذب فرد بھی یہ سمجھے کہ دینِ اسلام ایک جھوٹا مذہب ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (العیاذ باللہ) دھوکے باز اور فریب کار انسان تھے۔ کیونکہ وہ پیغام جو اس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انسانوں تک پہونچایا وہ تقریباً بارہ صدی سے اُن ۲۰ کروڑ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے سراجِ منیر کا کام دے رہا ہے۔ جنھیں ہماری ہی طرح ہمارے ہی خدا نے صحیح و سلیم حواس و مدرکات دے کر پیدا کیا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف گمراہ کن اور شر انگیز پروپیگنڈہ کا مقابلہ کریں۔ اے حقیقت فراموش انسانو! کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ رسالت و پیغام جس پر کروڑوں انسانوں کی زندگی اور موت کا دار و مدار ہے وہ حقیقت میں جھوٹ اور فریب کا مجموعہ ہے؟ اگر تم واقعی یہی سمجھتے ہو تو تمہیں تمہارا سمجھنا مبارک۔ لیکن یاد رکھو میں ڈنکے کی چوٹ تمہاری مخالفت کروں گا۔ میں ایسی پوچ اور گھٹیا رائے میں کبھی تمہارے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر جھوٹ اور فریب کو دنیا میں اتنا رواج و قبول اور اتنا عروج و فروغ ہو سکتا ہے اور دنیائے انسانیت اس کی اتنی ہی عاشق و دلدادہ ہے تو میں صاف کہوں گا کہ سب انسان پاگل ہیں، دیوانے ہیں اور زندگی و حیات لغو ہے۔ عبث ہے، بے حاصل و بے نتیجہ ہے مجموعۂ صد ضلالت و ہزار گمراہی ہے۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ اس کرۂ ارضی پر کسی متنفس کو زندگی و

وجود کی خلعت شرافت وکرامت پہنائی ہی نہ جائی آہ اتم کتنی گمراہی اور کتنی گھٹاٹوپ تاریکی میں ہو۔ تمہاری حالت و کیفیت واقعی بڑی دردناک اور واقعی بڑی قابل رحم و ہمدردی ہے۔

اسلام کی طرف سے کارلائل نے جو دفاع کیا ہے وہ واقعی قابل داد و لائق صد تحسین و آفرین ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں اسلام بزور شمشیر پھیلا اور اس کی بنیاد قساوت و ظلم اور سنگدلی و بے رحمی پر ہے ان کا بھی کارلائل نے نہایت مسکت اور دندان شکن جواب دیا ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ جب مسیحیت کا کام بھی صلح و آشتی اور نرمی و رواداری سے نہ نکل سکا تو اسے بھی مجبوراً کئی مرتبہ تلوار ہاتھ میں لینا پڑی۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن ایک معمہ و چیستان ہے اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ نقص قرآن کا نہیں بلکہ ان مترجمین کا ہے جو قرآن کی بلاغت و حلاوت کو اپنی اپنی زبانوں کے سانچوں میں صحت و عمدگی کے ساتھ ڈھالنے میں کامیاب نہ ہوئے جن لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کچھ بے سرو پا لغزشوں کا انتساب کیا ہے۔ ان کے رد و ابطال میں کہتا ہے کہ کسی انسان سے عصمت کا طلبگار ہونا بجائے خود اول درجے کی دیوانگی اور حماقت ہے کیوں کہ عصمت و تنزہ صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ کارلائل کی رائے میں۔ انسان کی بڑی لغزش یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو لغزشوں سے پاک اور بری قرار دے

کفر اور ایمان

غزالی اور کارلائل میں وجہ مشترک یہ ہے کہ دونوں نہایت سچے اور راسخ العقیدہ مومن ہیں لیکن فطرت انسانی کے مطالعہ اور نتیجۂ تفکیر میں دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں غزالی کی رائے میں ضمیر مطلقاً اس امر کی صلاحیت و استعداد نہیں رکھتا کہ وہ کسی چیز کے حسن و قبح کا حکم و فیصلہ صادر کر سکے بلکہ اس امر کی ساری باگ ڈور شرع کے ہاتھ میں ہے لہذا جس بات کو شرع اچھا کہے گی وہ اچھی، جس کو برا کہے گی وہ بری لیکن کارلائل کہتا ہے کہ چونکہ فرض کا احساس و شعور ایک مستقل اور قائم بالذات امر ہے اور فطرت انسانی کا ایک لازم اور معتد بہ جزو ہونے کے علاوہ وہ ہر انسان کی سرشت و خمیر میں موجود ہے۔ لہذا ہم اس کے کسب و تحصیل کے لئے شرائع اور قوانین

کے مطالعہ کے محتاج نہیں ہیں۔

کارلائل کے ہاں نتیجۂ تفکیر محترم اور قابل اعتبار ہے اور اس کے خیال میں الحاد و تفکیر دونوں ایک قلب میں جمع نہیں ہوسکتے۔ رہا اخلاص سو وہ اس کے نزدیک ہر کام کے لئے شرط اول اور بمنزلہ اصل و بنیاد ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے۔

"ممکن ہے بت پرستی کا مفہوم ہم یوں بآسانی سمجھ سکیں کہ سب سے پہلے ہم اس امر کو تسلیم کریں کہ بت پرستی بھی قدیم زمانے میں اپنے حاملین کی نگاہ میں مذہب صحیح اور دین برحق کا حکم رکھتی تھی۔ ساتھ ہی ہم بطور اصول موضوعہ اس بات کا بھی یقین کرلیں کہ ان لوگوں کا بت پرستی پر کامل ایمان و یقین تھا اور ان کے دماغوں پر نہ تو غفلت و نسیان چھایا ہوا تھا اور نہ یہ دیوانے یا نیم خوابیدہ تھے، بلکہ ہماری طرح صحیح العقل، سلیم الحواس اور زندہ و بیدار تھے۔ اُن کے چہرے مہرے بھی ہمیں سے ملتے جلتے تھے اور ہماری ہی طرح انھیں بھی اللہ ہی نے پیدا کیا تھا۔ غرضیکہ وہ ہر طرح ہمارے مشابہ و مماثل تھے۔ آخر میں ہمیں اس امر کا بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم ان کے زمانے میں پیدا ہوتے تو ہم بھی اُن تمام ان چیزوں پر ایمان لاتے جن پر وہ ایمان لائے اور اُن کے اور ہمارے عقیدے میں سرمو بھی فرق و اختلاف نہ ہوتا"

کارلائل کی رائے کا خلاصہ و ماحصل یہ ہے کہ ہر مذہب میں حق کا ایک عنصر موجود ہے اور ثنویت ایک شاعرانہ حسین تخیل اور کون و وجود اور اس کے مظاہر کے متعلق انسان کے شعور و وجدان کی حسی اور رمزی تمثیل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دنیا کا ہر مذہب اسی رمز و تمثیل کا مرقع ہے۔ فرق صرف مشاعر و افکار یا حواس و آرا میں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم میں اور بت پرستوں میں فرق و اختلاف جوہری و معنوی نہیں بلکہ صوری و لفظی ہے کیونکہ ہم میں سے بھی ہر فرد اللہ کی قدرت و ملکوت میں تدبر اور غور و فکر کو ایک گونہ عبادت و ریاضت سمجھتا ہے۔ اگر بت پوجنے والوں کی طرح ہم بھی کون وجود کے حسین خدوخال کے عاشق و شیدا ہوتے تو کیا بعید تھا کہ ہم بھی ہر چمکتے ہوئے تارے بلکہ ہر مسکراتے ہوئے پھول میں اللہ کی ذات

کا مشاہدہ کر سکتے۔

اجتہاد کے بارے میں غزالی کی رائے

کارلائل کہتا ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے عقیدہ ورائے میں مخلص ہے اُس وقت تک اُسے کافر نہیں کہا جا سکتا چاہے وہ عقیدہ کچھ بھی اور کسی نوع کا بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن غزالی کہتے ہیں کہ اجتہاد کی ایک خاص اور معیّن حد ہے اور گناہ اور خطا دونوں باہم لازم وملزوم ہیں تو گویا ہر گناہ گار غلط رو اور ہر غلط رو گناہگار ہے جس کا دامن گناہ سے پاک ہے اس کا دامن غلطی سے بھی پاک ہے۔ وہ امور جو نظر و فکر کے محتاج ہیں اُن کی غزالی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ظنّی اور قطعی۔ چونکہ ظنیات میں غلطی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس لئے ان میں گناہ کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قطعیات کی ان کے ہاں تین قسمیں ہیں کلامیہ، اصولیہ اور فقہیہ۔ کلامیہ سے مراد عقلیاتِ صرفہ ہیں اور چونکہ ان میں حق واحد اور متعین ہے اس لئے جس کا ہاتھ حق کے دامن تک نہ پہنچ سکا وہ عاصی و گنہگار ہے۔ حدوثِ عالم، اثباتِ محدِث، محدِث کے صفات واجبہ یا جائزہ یا مستحیلہ، بعثتِ رُسل، معجزات کی وجہ سے ان کی تصدیق و تائید، جوازِ رویت، خلق اعمال، ارادۂ کائنات غرضیکہ تمام وہ مسائل جن کے بارے میں ہم میں اور معتزلہ و خوارج اور روافض و مبتدعہ میں نزاع و اختلاف ہے وہ سب اسی قسم کے تحت داخل ہیں ان مسائل میں غزالی کے نزدیک حق واحد و متعین ہے جو حق تک رسائی حاصل نہ کر سکا وہ گنہگار ہے خطاوار ہے، اگر اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لانے سے عاجز و قاصر رہا تو کافر ہے۔ اگر اُن امور کے سمجھنے میں غلطی کی جو اللہ اور اُس کے رسول کی معرفت میں مانع نہیں ہیں مثلاً مسئلہ رویت، خلق اعمال، ارادۂ کائنات تو وہ گنہگار، غلط رو اور مبتدع ہوگا۔ گناہگار اس وجہ سے کہ اُس نے حق کی راہ گم کر دی۔ غلط رو اس وجہ سے کہ حق یقین کو نہ پا سکا، مبتدع اس وجہ سے کہ سلف کے مشہور مذہب سے اُس نے انحراف کیا لیکن ان تینوں حالتوں میں اُس پر کافر کا اطلاق کسی صورت جائز نہیں۔ اصولیہ سے مراد اجماع، قیاس

اور خبر واحد کی حجیّت ہے، چونکہ ان مسائل کے ادلّہ و براہین نہایت واضح و قطعی اور یقینی ہیں۔ لہٰذا ان کی خلاف ورزی کرنے والا خاطی اور گناہگار ہوگا۔ فقہی مسائل بعض ایسے ہیں جن کا انکار موجب کفر ہے اور بعض ایسے جن کا جحود و انکار مستلزم گناہ ہے۔ مثلاً تحریم خمر و سرقہ اور وجوب صلوٰۃ وصوم کا انکار کفر ہے اور وہ فقہی مسائل جن پر کامل اجماع و اتفاق ہو چکا ہے ان کا انکار گناہ و خطا ہے۔

گذشتہ مسئلے کی تحقیق

اخلاقی حکم و فیصلے میں اصل و بنیاد یہ ہے کہ عامل کی غرض اور نیت کی پڑتال کی جائے اگر وہ خیر ہے تو عمل بھی خیر اور اگر وہ شر ہے تو عمل بھی شر۔ تو گویا وہ عمل جس سے مراد خیر ہے چاہے فی نفسہٖ مضر ہی کیوں نہ ہو پھر بھی خیر ہے اور جس سے مراد شر ہے چاہے وہ فی حد ذاتہٖ نافع و مفید ہی کیوں نہ ہو پھر بھی شر ہے۔ انسان سے مطلوب صرف یہ ہے کہ وہ ہر عمل کے اقدام سے قبل غور و فکر، سوچ بچار اور چھان بین سے کام لے تاکہ عمل کے مضر و مفید دونوں پہلوؤں کا اسے علم ہو جائے۔ جب کسی نے اس بحث و تحقیق میں کمال غور و فکر سے کام لے لیا تو اب اس کی مسئولیت اور ذمہ داری ختم ہو گئی اور وہ حسن جزا کا اہل و مستحق قرار پا گیا۔

مسلم علماء نے اس باب میں جتنا کچھ لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ و تتبع سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حق وصواب کا سر رشتہ ان کے ہاتھ نہیں آ سکا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انھوں نے اخلاقی اور قضائی نقطہ نگاہ دونوں کو باہم خلط ملط کر دیا۔ حالانکہ ان کا فرض تھا کہ ان دونوں پہلوؤں کو الگ الگ رکھتے۔ مثلاً جو شخص خطاءً و سہواً کسی مسلمان کو قتل کر ڈالتا ہے وہ عدالت و قضا کی نظر میں مجرم ہے لیکن اخلاق کی نگاہ میں وہ بالکل بے قصور اور بری ہے۔ بلاشبہ شرع نے قضاء پر جو اعتماد کیا ہے وہ صحیح اور درست ہے۔ کیوں کہ جرائم کے استیصال اور بیخ کنی کی تنہا یہی ایک صورت ہے۔ اگر قاضی ہر اس شخص کو معاف کرتا چلا جائے۔ جو کہے کہ مجھ سے یہ گناہ بھول چوک سے ہوا ہے تو یقیناً بے شمار مجرم سزا سے بچ جائیں گے۔

اس بات کی بڑی دلیل کہ شرعی نقطہ نگاہ خالصتاً قضائی نقطہ نگاہ ہے یہ ہے کہ شرع نے مقلد کے ایمان کو صحیح اور درست قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایمان کے بارے میں تقلید کیا سود مند ہو سکتی ہے؟ باجوری جوہرہ[1] کے حاشیے میں کہتے ہیں:

"مقلد کے ایمان کے بارے میں اختلاف، اخروی احکام کی رو سے ہے۔ دنیوی احکام کے اعتبار سے اُس کا مجرد اقرار ہی کافی ہے لہذا جس شخص نے ایمان کا اقرار کر لیا اُس پر تمام اسلامی قوانین واحکام جاری ہوں گے اور اُسے کافر کہنا کسی صورت روا نہیں۔ الّا یہ کہ اُس کے ایمان کے دامن پر کفر کی نجاست وآلودگی پائی جائے مثلاً بتوں کو سجدہ وغیرہ۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نجات کا مدار اعمال وظواہر میں شرع کے اتباع پر نہیں بلکہ شرع کے ساتھ ایمان لانے پر ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ایمان اور چیز ہے اور ظواہر اعمال اور چیز۔

خطا اور عناد

غزالی کا فرض تھا کہ وہ اُس شخص میں جو عقلیات میں غور و فکر کرنے کے باوجود حق تک نہیں پہنچ سکا اور اُس شخص میں جس نے ضد اور عناد سے کام لیا دونوں میں فرق کرتے کیوں کہ فریقِ حق وصواب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ میں سے جس شخص نے نیک نیتی سے تسلی وتشفی حاصل کرنے کی خاطر شرع اسلامی میں غور و فکر اور مطالعہ وتدبر سے کام لیا۔ لیکن اس بحث وتفتیش کے باوجود بھی اُس کی تسلی نہ ہوئی مگر اُس پر بھی اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے عام عقائد کی مخالفت نہیں کی تو وہ آخرت میں ضرور ناجی اور سرخرو ہوگا۔ اگر غزالی اس طریق کار سے کام لیتے تو ابن سینا اور فارابی کو کافر کبھی نہ کہتے ہاں اِلّا یہ کہ انھیں کسی صورت اس امر کا علم اور یقین ہو جاتا کہ ان دونوں نے قصداً ضد یا ہٹ دھرمی سے کام لیا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے غزالی کے عصر و دور کے لوگ فلاسفہ کے عقائد کے بارے میں شک کے مزمن ومہلک مرض کا شکار تھے اور فلاسفہ کو مسلمان کہنا انھیں ایک دقیقہ اور ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ تھا۔

---

[1] ص ۳۲

تقریباً تین برس ہوئے کہ اس موضوع پر جناب محترم شیخ دجوی اور میرے مابین ایک طویل بحث چھڑ گئی اُن کا دعویٰ تھا کہ کسی کے کفر کے لیے اُس کی لاعلمی اور جہالت ہی کافی ہے۔ میں کہتا تھا کہ جب تک کسی کے عناد اور ضد کا یقین نہ ہو جائے اُسے کافر نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ عرصہ بعد مجھے پتہ چلا کہ جاحظ کی بھی بعینہٖ یہی رائے تھی چنانچہ غزالی مستصفےٰ میں اس سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہود، نصاریٰ اور دہریہ میں سے کوئی ملتِ اسلام کا مخالف اگر اپنے اعتقاد کے خلاف عمداً اور عناد سے کام لے تو وہ گناہگار رہے۔ اگر اس نے اسلام کی تعلیمات میں غور و فکر کیا لیکن حق کے پانے سے عاجز و قاصر رہا تو معذور رہے۔ اگر ان تعلیمات میں اس نے اس لئے غور نہیں کیا کہ وجوب نظر و تدبر کا اس کو سرے سے علم ہی نہ تھا تو بھی وہ معذور و مجبور ہے۔ آخرت میں عذاب و سزا صرف اُن کو دی جائے گی جو عمداً اور ہٹ دھرمی سے کام لے، کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا چونکہ یہ لوگ حق تک پہنچنے سے عاجز رہے اور جب ان پر معرفتِ حق کا دروازہ نہ کھلا تو اللہ کے خوف سے یہ اپنے قدیم عقائد و نظریات پر ہی قائم و ثابت قدم رہے۔"

ابن حاجب جاحظ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ:۔

"مجتہد سے چاہے خطا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ گناہگار نہیں ہاں البتہ اُس کے ساتھ برتاؤ کفار ہی کا کیا جائے گا۔ بخلاف معاند کے کہ وہ ہر حال میں گناہگار رہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاحظ باوجودیکہ مجتہد کو آثم قرار نہیں دیتے لیکن اس پر بھی اُس کے ساتھ سلوک اور برتاؤ کفار ہی کا تجویز کرتے ہیں۔ یہ بعینہٖ تضائی نقطۂ نگاہ ہے جس کا میں نے ابھی ابھی تذکرہ کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ زمانے میں اس رائے و مشرب کے مؤیدین و انصار بہت تھے مثال کے طور پر فصول[1] البدائع میں ہے:۔

"یہ جو بعضِ سلف سے منقول ہے کہ مسائل کلامیہ مثلاً خلقِ قرآن، نفی رویت، خلق افعال وغیرہ

---

[1] ج ۲ ص ۴۲۴

میں ہر مجتہد مصیب ہے تو اس کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ وہ گنہگار نہیں ہے معذور ہے لیکن یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس کی رائے حق ہے اور وہ اللہ کے ہاں ماجور و مثاب ہے۔[1]

ارشاد الفحول[2] میں ہے:۔

"مسئلہ رویت، خلق قرآن، موحدین کی کچھ عرصے کے بعد جہنم سے خلاصی و نجات وغیرہ تو اس میں حق واحد اور متعین ہے جس نے اس کو پالیا اس نے حق کو جا لیا جو اسے نہ پا سکا وہ محروم ہے کافر ہے۔ اس نظریے کے قائلین کے سرخیل حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کے متبعین میں سے بعض نے اس رائے کے ظاہر مفہوم کو لیا اور بعض نے کفر کو کفرانِ نعمت پر حمل کیا۔

ابنِ حاجب مختصر میں عنبری سے نقل کرتے ہیں کہ ہر مجتہد مصیب ہے ابن دقیق العید کہتے ہیں:

"عنبری اور جاحظ سے جو رائے منقول ہے اگر اس سے مراد یہ ہے کہ ہر مجتہد نفس الامر اور واقع میں مصیب ہے تو یہ غلط اور باطل ہے اگر مراد یہ ہے کہ جس شخص نے پوری محنت و قوت صرف کی اور اصولیات میں اس نے کوئی تقصیر اور کوتاہی نہیں کی تو وہ معذور غیر معاقب ہے تو یہ بات درست ہے کیوں کہ تحقیقِ حق کے لئے انتہائی جد و جہد اور محنت و سعی کے بعد بھی اگر کہا جائے کہ وہ معذّب و معاقب ہے تو تکلیف بما لا یطاق لازم آئے گی۔"[2]

ترجیح بلا مرجح

غزالی فیصل التفرقہ میں کہتے ہیں:۔

"گذشتہ امم و اقوام کو گو کچھ مدت یا کچھ دیر کے لئے جہنم کے سامنے لایا جائے گا تاکہ ان پر جہنمی ہونے کا اطلاق ہو سکے لیکن آخر کار اللہ سبحانہ و تعالیٰ انہیں اپنی رحمت و عنایت سے معاف کر دیں گے۔ اکثر نصاریٰ روم و ترک بھی بخش دیے جائیں گے۔ کیونکہ ان میں سے بعض تک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی پہنچا ہی نہیں اور بعض تک اگر پہنچا بھی ہے تو اس قدر خرافات و اباطیل کے ساتھ ملا ہوا کہ صحیح نظر و فکر کا موجب و باعث کسی صورت نہیں ہو سکتا۔"

---

[1] ص ۱۴۲ [2] شوکانی ص ۲۴۲

کتاب الصحبة میں کہتے ہیں :۔

"ثواب وعقاب صرف اختیاری افعال پر ہوگا اضطراری پر نہیں"

ہم غزالی سے پوچھتے ہیں کہ گزشتہ امم واقوام کو اللہ کی رحمت وعنایت کیوں شامل ہوگی ؟ کیا صرف اسی لئے نہیں کہ وہ معذور ہیں ؟ آپ نے اُن نصاریٰ روم وترک کی بخشش کا فتویٰ ہی کیوں دیا جن تک دعوتِ اسلام یا تو پہنچی ہی نہیں یا اگر پہنچی ہے تو محرّف ومبدّل ہوکر ؟ کیا اسی لئے نہیں کہ وہ معذور ہیں ؟ آپ نے یہ کیوں کہا کہ جزا وسزا صرف اُن اعمال وافعال پر ہوگی جنھیں انسان اپنے ارادہ واختیار سے انجام دے ؟ کیا محض اسی لئے نہیں کہ اُن اعمال پر سزا دینا جن کے ارتکاب کے لئے کوئی شخص مجبور ہوگیا تھا یا کسی دوسرے نے مجبور کر دیا تھا ظلم ہے۔ زیادتی اور ناانصافی ہے ؟

جب معاملہ یہی ہے اور متقدمین کی رائے بھی یہی تھی تو فرمایئے ہم اُس شخص کو کافر کیسے کہہ سکتے ہیں جسے وجوبِ نظر وفکر کا یا تو علم ہی نہ تھا یا علم تھا لیکن بحث ونظر اور تحقیق وتفتیش کے باوجود بھی اُس کی تسلی نہ ہوئی ؟ جو شخص فقہی مسائل میں اجتہاد کے بعد صحیح نتائج کا استنباط نہ کرسکے اگر اُسے آپ گنہگار نہیں کہتے تو جو شخص کلامی مسائل میں اجتہاد کے بعد صحیح وصالح نتائج تک نہ پہنچ سکے اُسے آپ گنہگار اور کافر کیوں کہتے ہیں ؟ کیا معذوریت میں تمام مفکرین برابر نہیں ہیں ؟ اگر نہیں ہیں تو کیا یہی وہ ترجیحِ بلا مرجح نہیں ہے جو آپ کے ہاں کسی صورت بھی جائز نہیں ؟

بے قصور لوگوں پر ظلم وزیادتی

مجھے جاحظ کا یہ قول پڑھ کر کہ معذور لوگوں کے ساتھ کفار کا برتاؤ کیا جائے نہایت تعجب ہوا کیوں کہ اُس کے ہاں یہود ونصاریٰ اور دہریہ میں سے کوئی مخالفِ ملتِ اسلام اگر غور وفکر کرنے کے بعد بھی حق تک نہ پہنچ سکے تو وہ معذور وغیر گنہگار رہے۔ اگر غور وفکر سے اس نے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُسے اُس کے وجوب ولزوم کا سرے سے علم ہی نہ تھا تو بھی

وہ معذور رہے۔ آخرت میں سزا فقط اُسی شخص کو دی جائے گی جو ضد و عناد سے کام لے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر جاحظ کا یہی مذہب و مشرب ہے تو پھر وہ معذورین کے ساتھ کفار کے سے سلوک اور برتاؤ کی تلقین کیوں کرتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ اللہ کے ہاں ناجی و سرخرو ہیں۔ کیا اُس خدا کی نسبت ہم زیادہ غیور ہیں جس نے انسانوں کو صرف انھیں امور و اعمال کا مکلف قرار دیا ہے جو اُن کی طاقت اور بساط میں ہوں۔

میں جانتا ہوں اگر جاحظ زندہ ہوتا اور اُس سے یہ سوال کیا جاتا تو جواب میں وہ یقیناً یہی کہتا کہ اس سے دین کے مخالفین کی تقلیل اور کمی مقصود ہے اور واقع میں یہ جواب ہے بھی معقول اور درست لیکن اس بات کا خاص لحاظ و خیال رکھنا چاہیے کہ یہ ہمارے اُس قول کی تائید ہے جس میں ہم نے کہا ہے کہ علمائے اسلام نے ان مسائل پر اخلاقی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ قضائی نقطہ نظر سے غور کیا ہے حالانکہ ان کا فرض تھا کہ وہ قضاء اور اخلاق دونوں میں دقیق فرق کو سمجھتے۔ مثلاً یہ امر واضح ہے کہ اگر کوئی شخص سہواً کسی کو قتل کر ڈالے تو وہ عدالت و قضا کی نظر میں مجرم و قصوروار ہے لیکن اخلاقی زاویۂ نظر سے اپنی ذات کے سامنے بلکہ اللہ اور واقع و حقیقت کے سامنے بھی بالکل بری اور بے قصور رہے۔

مدعیانِ علم دین ممکن ہے کہ کہیں اس قسم کی موشگافیوں سے شرع متعارف و آشنا نہیں ہے لہٰذا میں آپ کو اس امر پر متنبہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں شرعی پہلو سے نہیں بلکہ فلسفی پہلو سے گفتگو کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہوں گا کہ اگر شرع ان کے قول کے مطابق اس قسم کی باریکیوں سے آشنا نہیں ہے تو اُسے آشنا ہونا چاہیئے تھا اور ان امور کے لئے شرع کو ضرور کچھ حدود و قیود مقرر کرنے چاہیئے تھے کیوں کہ ایک معذور و مجبور ہر معنی میں بے قصور ہے۔ اور بری و بے قصور کو قتل کرنا حقیقت میں بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی زیادتی و نا انصافی ہے۔

غزالی اور سپینوزا (SPINOZA)

سپینوزا امسٹردام میں ۱۶۳۲ء میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ چونکہ اس نے یہودیت کی تعلیم میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا اس لئے اپنے ہم مذہبوں کے ہاتھوں اُسے طرح طرح کے آلام و شدائد کا سامنا کرنا پڑا جب انھوں نے اس کے قتل کی سازش کی تو یہ لاہائی میں خلوت و عزلت کی زندگی اختیار کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ٹلسکوپ اور میکروسکوپ کے شیشے صاف کرتا اور اس کے مقابلے میں جو اُجرت ملتی اُس سے قوت لایموت کا بندوبست کرتا احباب نے کئی مرتبہ اُس کی مالی اعانت و امداد کرنا چاہی لیکن حمیت و شرافت کے خلاف سمجھ کر اُس نے ہر مرتبہ اس امداد کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہیڈلبرگ یونیورسٹی میں فلسفے کی تدریس کی اُسے پیش کش کی گئی لیکن آزادی و استقلال کے پیش نظر اُس نے یہ پابندی بھی گوارا نہ کی اور ہمیشہ درا ویش و فقرا کی پُر قناعت زندگی پر صبر و اکتفا کیا۔ جب سینے کے ایک شدید مرض میں مبتلا ہوا تو نہایت ہمت و تحمل کے ساتھ اس مرض و تکلیف کو برداشت کیا اور کوئی حرف شکایت کبھی زبان پر نہ لایا۔ آخر ۱۶۷۷ء میں جب کہ ہر طرف اس کی تکفیر کا بازار گرم تھا رحلت و انتقال کیا

سپینوزا کی اہم ترین تالیف (TRAITE THEOLOGICO-POLITIQUE) جس میں اُس نے کتاب مقدس کو حریت فکر اور نقد و جرح کا موضوع بنایا ہے اُس کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھی۔ دوسری تالیف (ETHIQUE) اس کی موت کے بعد لوگوں کے سامنے آئی۔ اس کتاب میں اُس نے ماوراء الطبیعیات، نفس اور اہواء و شہوات کے بارے میں اپنے قیمتی آراء کو کمال آزادی و حریت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

سپینوزا مذہب حلول (وحدت الوجود) کا سختی سے علمبردار ہے اُس کی رائے میں خدا سب کچھ اور سب کچھ خدا ہے تو گویا اس نقطے پر سپینوزا اور غزالی باہم مختلف ہیں، کیونکہ غزالی کی رائے میں اللہ کا وجود عالم کے وجود سے الگ اور اللہ اس تمام کائنات کا والی و مدبر ہے

سپینوزا کی رائے میں خدا اور عالم دونوں وجوداً متحد ہیں اور خدا ہر ذرّے ہر دانے، ہر تنکے ہر جانور، غرض کہ کائنات کے ہر مظہر میں حالّ اور جاری وساری ہے۔ انسان خواہ اپنے آپ کو کتنا ہی آزاد و فاعلِ مختار کیوں نہ سمجھے لیکن واقع میں ایسا نہیں ہے۔ گو اس کی آنکھیں کھلی ہیں لیکن وہ سو رہا ہے خواب دیکھ رہا ہے۔

سپینوزا کا یہی عقیدہ تھا جس کی بنا پر علمائے دین نے اُس کے خلاف ایک قیامت برپا کر دی اور اُس پر کفر و زندقہ کا فتویٰ لگایا۔ ڈاکٹر راپیرٹ کہتا ہے :-

"سپینوزا کفر و الحاد سے کوسوں دور تھا، واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت و الفت اُس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی اور فطرت کے لبالب جام سے اُس نے مئے الوہیت کو اس کثرت سے نوش کیا کہ آخر اُسے کسی بات کا بھی ہوش نہ رہا اور جدھر نگاہ کی اللہ ہی اللہ نظر آیا۔"

سپینوزا کی طرف سے یہ معذرت بعینہٖ ایسی ہے جیسی بسطامی، حلاج اور دوسرے قائلینِ وحدت الوجود کی طرف سے مسلمان علماء معذرت کیا کرتے ہیں۔

سپینوزا کی رائے میں اخلاق کی غرض و غایت طبیعتِ انسانی کی تعمیر و تکمیل ہے اور ہر وہ علم جو اس مقصد تک پہنچانے کے لئے مدد و معاون نہ ہو وہ واقع میں بیکار اور عبث ہے، تو گویا غزالی اور سپینوزا اس آخری بات پر متحد ہیں یعنی ہر وہ علم جو سعادت تک نہ پہنچا سکے وہ حقیر و ناقابلِ اعتنا ہے لیکن غایت کے اعتبار سے دونوں کا نقطۂ نظر الگ الگ ہے۔ کیونکہ غزالی کے ہاں اخلاق کی غرض و غایت فقط اخروی اور ابدی سعادت و نجات تک پہنچانا ہے۔

باوجودیکہ سپینوزا کی ساری جد و جہد اس امر کے لئے وقف ہے کہ فطرتِ انسانی کو کمال و عروج تک پہنچایا جائے لیکن اُس کی رائے میں نقص و کمال اور خیر و شر میں تمیز اور پرکھ امورِ اعتباریہ میں سے ہے کیوں کہ یہ تمیز، عبارت ہے اُس صورت سے جس کا ہم مختلف اشیا کے مابین تقابل و موازنہ سے اخذ و انتزاع کرتے ہیں۔ غزالی کی رائے میں خیر وہ ہے جس کا اللہ نے امر کیا ہے، شر وہ ہے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔ سپینوزا کی رائے میں خیر وہ ہے جو

نافع و مفید ہے۔ شر وہ ہے جو مضر و غیر مفید ہے۔ یا بالفاظِ دیگر خیر وہ ہے جو ہماری قوت میں اضافہ کرتی اور اسے عمل کے لئے آمادہ و تیار کرتی ہے۔ شر وہ ہے جو اس قوت کو کمزور کرتی اور اس کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے تو نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خیر انسان کے گلے میں خوشی و مسرت کے پھولوں کے ہار ڈالتی اور شر انسان کو غم و اندوہ کے کانٹوں کے بستر پر لٹاتی اور کروٹیں بدلواتی ہے۔

ابھی اتنی بات کہنا اور باقی ہے کہ سپینوزا کی رائے میں سعادتِ کلی کا سارا راز عقل کی تربیت اور اکمال میں مضمر ہے۔ کیوں کہ ہمارا وجودِ صحیح اور وجودِ حق، واقع میں عقل ہی سے عبارت ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے سعادتِ حقیقی، طمانیتِ نفس کا نام ہے جو اللہ کے علم و معرفت سے وجود و ظہور میں آتی ہے تو گویا جہالت صرف اس لئے بری ہے کہ جاہل کو ہمیشہ غم و حزن اور قلق و اضطراب کا شکار رکھتی ہے۔ علم و حکمت اس لئے قابلِ ستائش ہیں کہ عالم و حکیم کو خوشی و مسرت اور امن و سکون سے ہم کنار بناتے ہیں۔ اس آخری شق میں سپینوزا غزالی کے ساتھ پورا پورا متفق ہے۔

غزالی اور سپینوزا میں واضح ترین فرق، شخصیتِ انسان کے وجود و عدم اور اس کی مسئولیت کے نفی و اثبات میں ہے اور یہ بات منطقی اعتبار سے ہے بھی ظاہر کیوں کہ سپینوزا کی رائے میں جب عالم خدا اور خدا عالم ہے تو انسان کی شخصیت و انفراد اور اس کی مسئولیت کا کوئی معنی ہی نہیں لیکن غزالی کی رائے میں چوں کہ انسان کی شخصیت اللہ کے وجود سے مختلف اور جدا ہے، اس لئے وہ اس امر کی صلاحیت رکھتا ہے کہ بعض اعمال پر اسے جزا یا سزا دی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے نزدیک انسان کی شخصیت اس قدر ذلیل و حقیر اور اندھی ہے کہ اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔

---

(۷)

غزالی اور جسندی (GASSENDI)

جسندی ۱۵۹۲ء میں جنوبی فرانس میں بردونس نامی مقام میں پیدا ہوا۔ کچھ عرصے تک بلاغت اور فلسفے کی تحصیل میں مشغول رہا۔ آخر مذہبی پیشوا ہو کر ہالینڈ چلا گیا۔ جہاں اُس نے طبیعیات، فلکیات اور علم تشریح کا گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۶۴۵ء میں گورنمنٹ کالج پیرس میں ریاضیات کا پروفیسر مقرر ہوا اور یہیں ۱۶۵۵ء میں انتقال کیا۔

جسندی کا سب سے بڑا قابل ذکر کارنامہ فلسفہ ابیقور المتوفی سنہ ۲۷۰ ق م کی طرف سے دفاع ہے۔ ابیقور کی رائے میں اخلاق کی غرض وغایت سعادت ذاتی ہے، تو گویا فضیلت اس لئے فضیلت ہے کہ یہ لذت تک پہنچاتی ہے۔ رذیلت اس لئے رذیلت ہے کہ دکھ اور الم کا موجب بنتی ہے جب تک لذائذ یا آلام کی طرف کسی عمل کو منسوب نہ کیا جائے وہ فی نفسہٖ کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتا۔ ابیقور نے اپنے مذہب کی طرف سے اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ دفاع کیا کہ اہل دانش وبینش نے اُسے ہمیشہ وقعت وعزت کی نگاہوں سے دیکھا، اس کی رائے تھی کہ پائدار اور دوامی لذائذ کی خاطر وقتی آلام ومصائب کو برداشت کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں بعض مشقت طلب فضائل کی تحلیل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بظاہر یہ فضائل نہایت صبر آزما معلوم ہوتے ہیں لیکن فی الواقع نہایت راحت رساں اور رنج والم سے بمراحل دور ہیں کیونکہ کسی فضیلت وخوبی کے حصول کے وقت جو مسرت ہوتی ہے وہ اُن آلام ومحن پر ترجیح رکھتی ہے، جو اس کی راہ میں برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اسی طرح کسی رذیلت کے ترک کرنے میں وقتی طور پر جو دکھ یا تکلیف ہوتی ہے وہ اُس دکھ اور درد کے مقابلے میں حقیر وہیچ ہے جو منکرات کے ارتکاب کی وجہ سے کسی شخص کو پہنچتا ہے۔

لوگوں نے ابیقور کے مذہب کو غلط سمجھا انھوں نے خیال کیا کہ یہ فقط لذت ومسرت کا داعی ونقیب ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر جس شخص کو لاابالی یا البیلا پایا اُس کا نام ابیقوری رکھ دیا

آخر جنیدی نے آکر اس کی تعلیمات کو زندہ کیا اور اس کے مذہب و مشرب کو ترقی و فروغ دیا جنید ہی نے اپنے عصر و دور پر بہت گہرا نقش و اثر چھوڑا۔ آخر یہی کیا کم ہے کہ مولیبر جیسی عظیم المرتبت شخصیت اس کے تلامذہ و مستفیدین میں ہے۔

جنیدی کی طرح غزالی نے بھی لذت سے بحث کی ہے لیکن دونوں میں بہت بڑا فرق ہے کیوں کہ جنیدی کی رائے میں لذت، انسان کے منجملہ مقاصد کے ایک بڑا مقصد ہے لیکن غزالی کی رائے میں انسان کی منجملہ صفات کے ایک صفت ہے۔ مثلاً آنکھ، کان اور عضو تناسل وغیرہ سب کی ایک ایک لذت ہے اور ان لذتوں کے بغیر زندگی کی کوئی قیمت اور کوئی معنی ہی نہیں لیکن بہر حال میں یہ امر اشد ضروری ہے کہ یہ لذات عقل اور شرع کے حدود و قیود میں رہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ شرعی اور عقلی حدود ہیں کیا؟ سو انہیں ہر شخص بآسانی سمجھ اور جان سکتا ہے۔ جنیدی کے ہاں لذت کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یا اس کے بعد، دکھ اور الم کا کوئی خوف اور کوئی کھٹکا نہ ہو۔ غزالی اور جنیدی میں مختلف فیہ مسئلہ حقیقتاً یہی ہے کیوں کہ غزالی کی نگاہ میں گو زنا دنیوی ضرر و نقصان سے بالکل خالی ہے لیکن وہ زانی کو جہنم میں پہنچا کر چھوڑے گا۔

(۸)

غزالی اور مالبرانچ (MALEBRANCHE)

مالبرانچ ۱۶۳۸ء میں پیرس میں پیدا ہوا کامل پچاس برس تک مذہبی پیشوا رہا۔ زندگی بھر اس کے پیش نظر یہی ایک مقصد رہا کہ مذہب اور فلسفے میں کوئی صورت تطبیق کی پیدا کی جائے آخر ایک طویل مرض کے بعد ۱۷۱۵ء میں انتقال کیا۔

اس کی اہم ترین تالیفات TRAITE 'DE MORALE اور RECHERCHE DE LAVER TE ہیں۔ مالبرانچ ڈیکارٹ اور اس کے فلسفے کا عاشق ہے۔ جو لوگ حریت فکر اور آزادی رائے کے مفرط حد تک قائل ہیں ان سب کا سرگروہ و سرخیل ہے۔ اس کے ہاں مسلم قاعدہ یہ ہے کہ ان

قضایا کے علاوہ جو ایسی حد تک ہمارے سامنے واضح ہو جائیں کہ ہمارے لئے اُن کے قبول و تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ رہے، دوسری کسی چیز کو ہم تسلیم نہیں کر سکتے ورنہ عقل اور ضمیر دونوں کے سامنے مسئول و جواب دہ ہوں گے

مالبرانچ کے ہاں اخلاقی قاعدہ یہ ہے کہ جب تک ہم کسی خیر سے بغیر ندامت اور پشیمانی کے محبت نہ کرنے پر قادر رہیں اُس وقت تک کسی خیر سے پوری محبت کرنا معقول اور متصور ہی نہیں ہے۔ یہاں غزالی اور مالبرانچ ایک گونہ متفق نظر آتے ہیں کیوں کہ جس طرح غزالی کی رائے میں بجز اللہ کی ذات کے کسی سے محبت مطلقہ جائز نہیں کیوں کہ فقط اللہ کی ذات ہی ایسی ہے جس کی کوئی نظیر نہ وجود میں ہے نہ امکان میں اسی طرح مالبرانچ کہتا ہے کہ محبت مطلقہ و تامہ بجز اللہ کی ذات کے اور کسی سے ضروری نہیں۔

حواس کے احکام کے ناقابلِ اعتبار اور ناقابلِ یقین ہونے میں بھی مالبرانچ غزالی کے ساتھ متفق ہے کیوں کہ اُس نے دیکھا کہ فاصلے کے قُرب و بُعد کی وجہ سے بعض اوقات نگاہ کا فیصلہ بدل جاتا ہے مزید برآں مالبرانچ وحدتِ زمانی میں بھی شک و شبہ کا اظہار کرتا ہے وہ کہتا ہے آخر یہ کیا بات ہے کہ خوشی اور مسرت کا پورا اور مکمل دن غم و حزن کے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ مختصر معلوم ہوتا ہے۔

مردِ مومن کے تخیل میں بھی غزالی اور مالبرانچ متفق ہیں۔ مثلاً غزالی کہتے ہیں کہ جس شخص نے خودی کا راز پالیا وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا اور اُس پر موت اور عدم کی پرچھائیں بھی کبھی نہیں پڑ سکتی۔ مالبرانچ کہتا ہے کہ مردِ مؤمن وہ ہے۔ جو بقدر استحقاق، سعادت کا طالب ہو اور عدل الٰہی کی طرف سے اُسے جتنا کچھ بخشا جائے اُس پر قانع و راضی ہو۔

لذت کی تقدیر و تحدید کے بارے میں غزالی اور مالبرانچ کی آراء مختلف ہیں۔ غزالی کی رائے میں لذت ایک خاص حد تک خیر ہے اور اس سے آگے شر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مالبرانچ کی رائے میں لذت ہمیشہ خیر ہے اگرچہ اس سے تمتع دائماً مفید نہیں ہوتا کیونکہ یہ بعض اوقات

ہمیں اللہ سے دور کر دیتی ہے۔ الم کے بارے میں بھی دونوں کے نقطۂ نگاہ مختلف ہیں۔ مالبرانچ کے ہاں الم چاہے بالفعل شر ہو لیکن بہت ممکن ہے کہ فی الواقع خیر ہو (غرض اور مقصود اس سے تحمل اور برداشت کی خوبی بیان کرنا ہے) غزالی نے الم کے بیان کے لئے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا یہ الگ بات ہے کہ اللہ کی راہ میں جو مصیبت و آفت آئے وہ اُسے ہر وقت بہ خندہ پیشانی جھیلنے کے لئے آمادہ و تیار رہیں۔

اس مختصر سے موازنے کے بعد میں آپ سے عرض کروں گا کہ جدید فلاسفہ کی جن آراء کا مطالعہ ناگزیر اور ضروری ہے اُن کے مقابلے میں یہ باب صرف قطرۂ از دریا کا حکم رکھتا ہے لہذا میں امید کرتا ہوں کہ جن باتوں کو میں نامکمل اور ادھورا چھوڑ رہا ہوں اُنھیں آپ مکمل کر دیں گے۔ واللہ بالتوفیق کفیل۔
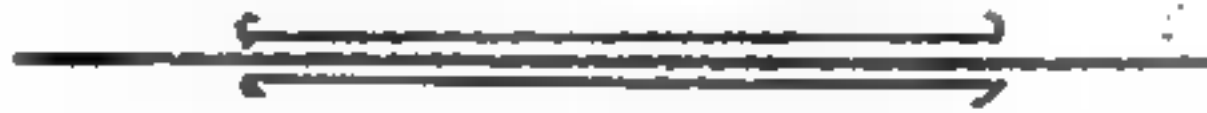
چودھواں باب

غزالی کے متعلق جدید علما کی آراء

اس کتاب کا جو نسخہ میں نے جامعہ مصریہ کے سامنے پیش کیا اُس میں یہ باب موجود نہ تھا۔ امتحان سے فراغت کے بعد جی میں آیا کہ مختلف ادوار میں غزالی کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے اس باب کا مزید اضافہ کر دوں تاکہ تاریخی سلسلہ مکمل اور پورا ہو جائے۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ غزالی کے بارے میں علماء اپنی اپنی آراء کو جرأت و صراحت کے ساتھ بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس باب میں عذر ان کا یہ ہے کہ غزالی کی مدح و توصیف کے علاوہ عوام اور کچھ سننا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے مصنفین کی طرح جہاں غزالی میں کچھ خوبیاں موجود ہیں وہاں کچھ عیوب اور خامیاں بھی ہیں لیکن علماء کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ غزالی کے عیوب پر انگلی رکھتے ہوئے کانپتے ہیں کہ کہیں لوگوں کے تمسخر و استہزار کا نشانہ نہ بنیں۔

غزالی پر تنقید کے سلسلے میں میں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ غزالی کے متعلق جدید علما میں سے اُن کے موافقین و مخالفین کی آراء کو کمال دیانت و امانت

کے ساتھ بلاکم وکاست بیان کردیا جائے۔ جناب محترم محمد بک جاد المولی اور حضرت استاذ عبدلوہاب نجار کے علاوہ باقی سب حضرات کی آراء میں نے ان کے ساتھ مکالمہ وگفتگو کے ذریعہ جمع کی ہیں۔ مذکورۃ الصدر دو بزرگوں کے علاوہ میں نے کسی میں بھی اس امر کی جرأت وہمت نہ پائی کہ غزالی کے بارے میں اپنی رائے تحریری طور پر میرے حوالے کرسکے اور سچ یہ ہے کہ یہ حضرات اس باب میں ایک گونہ ہیں بھی معذور ومجبور کیونکہ امتحان کے بعد میرے خلاف جو قیامت برپا ہوئی اس سے سب لوگوں کو اس بات کا یقین آگیا کہ حریتِ فکر اور آزادی واستقلال رائے سے زیادہ مصر میں اور کوئی چیز مظلوم ومقہور نہیں۔

(۱)

ڈاکٹر منصور فہمی کی رائے

ڈاکٹر منصور فہمی جامعہ مصریہ میں فلسفے کے استاذ ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی عظیم شخصیت نوادرِ روزگار میں سے ہے۔ بعض مخصوص نظریات کی وجہ سے انھیں شدید سے شدید تر مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جب ان کے متعلق مصر میں مشہور رہا کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (العیاذ باللہ) حبِّ شہوات کا عیب لگایا ہے تو عوام کے مطالبے سے مجبور ہو کر ۱۹۱۳ء میں یونیورسٹی نے انھیں ملازمت سے الگ کردیا۔ سعد پاشا زغلول نے محسوس کیا کہ ایسی جامع وعظیم المرتبت شخصیت سے جامعہ کا محروم ہوجانا حقیقت میں بہت بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ چنانچہ ایک روز انھوں نے مشورۃً ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ آئندہ جمعہ کی نماز ازہر میں پڑھیں تاکہ آپ کے مخالفین کی زبانیں بند ہوجائیں اور میں دوبارہ آپ کو جامعہ مصریہ میں لانے کے لئے زمین ہموار کرسکوں اور آپ درس وتدریس کے منقطع سلسلے کو پھر سے جوڑ سکیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی حمیت وغیرت نے اس بات کو گوارا نہ کیا اور انھوں نے صاف کہا کہ میرے ایمان کے لئے تنہا اللہ کی شہادت کافی ہے، میں اس پر علماء کی مہریں لگوانے کا ہرگز خواہشمند نہیں ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے سعد پاشا کا شکریہ ادا کیا اور

ان کے مشورہ و نصیحت کے ماننے سے معذرت کا اظہار کیا اور کئی برس تک جامعہ سے الگ تھلگ رہنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں نہایت سرخرو اور سربلند ہو کر پھر دوبارہ جامعہ میں تشریف لائے
ڈاکٹر منصور صاحب نے چونکہ پیرس یونیورسٹی سے غزالی پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے لہٰذا اس باب میں اُن کی رائے دوسروں کے نسبت زیادہ وزنی اور زیادہ قیمتی ہے ڈاکٹر صاحب موصوف نہ تو غزالی کے مویدین میں ہیں اور نہ مخالفین میں۔ غزالی نے علم و حکمت کی جو بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں اُن کے لئے غزالی کے مداح ہیں اور اس باب میں اُن سے جو لغزشیں ہوئی ہیں اُن سے درگذر اور اغماض کے قائل ہیں کیوں کہ اُس عصر کے دوسرے علمار کی طرح غزالی نے بھی اکثر و بیشتر حافظے ہی پر اعتماد کیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ حافظے سے کلام میں تناقص اور اضطراب کا ہونا ایک لازمی اور لابدی امر ہے۔

(۲)
شیخ علی عبدالرزاق کی رائے

اُستاذ محترم شیخ علی عبدالرزاق موجودہ علمار میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ آج سے تقریباً بارہ برس قبل ہم نے اِن سے ادب و بیان پڑھا تھا۔ علم بیان میں ان کے امالی ان کی فوق العادۃ قابلیت و تبحر پر شاہد ہیں۔ اگر تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھتے تو یقیناً ایک نادر المثال حیثیت اختیار کر سکتے تھے۔

انھوں نے غزالی کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کی طرف سے دفاع کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ان کی رائے ہے کہ غزالی نے عالمِ اسلامی میں ایک نئی علمی اور فکری حرکت کی بنیاد و اساس رکھی۔ رہی اس حرکت کی قدر و قیمت سو اس باب میں لوگوں کی آرار مختلف ہیں کوئی اسے مفید سمجھتا ہے اور کوئی مضر۔ وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ۔

۳
شیخ یوسف دجوی کی رائے

استاذِ محترم شیخ یوسف دجوی مجلسِ کبارِ علماء کے ایک ممتاز رکن ہیں ازہر اور دوسرے دینی مدارس میں ان کا اثر و نفوذ مسلم ہے۔ موجودہ عہد کے اکثر علماء ان کے تلامذہ و خوشہ چین ہیں ان کی شخصیت و حیثیتِ علمی کا ان کی تصنیفات سے اندازہ کرنا درست نہیں ہے کیوں کہ اول تو ان کی تصنیفات ہیں ہی بہت کم اور پھر جتنی ہیں اُن میں کوئی رُوح اور کوئی جان نظر نہیں آتی چونکہ تدوین و تالیف میں ان کا طریق کار ہمیشہ یہ رہا ہے کہ عوام اور جمہور کے لئے قابل فہم چیزوں ہی کو صرف مرتب کیا جائے اِس لئے ان کی تمام تالیفات علمی پائے سے بہت گری ہوئی ہیں۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ کی تفسیر میں جس براعتِ اسلوب سے کام لے کر انھوں نے ایک مختصر سا رسالہ لکھا تھا اُسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے بعد میں اس اُسلوب کو بالکل ترک کر دیا اور محض ترغیب و ترہیب کے اُس اندازِ کہن پر قناعت کر کے بیٹھ گئے جسے پڑھ کر بے اختیار غزالی کی احیاء یاد آجاتی ہے۔

شیخ یوسف دجوی کو اس زمانے میں غزالی کا خلیفہ و جانشین سمجھنا چاہیے۔ قدرت، اخلاص قوتِ نفوذ، فلسفہ و حکمت کی تحقیر و توہین، عقل کی حد بندی، غرضیکہ غزالی کی تمام صفات و خصائص ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

(۴)
استاذِ محترم جاد المولیٰ بک کی رائے

جناب جاد المولیٰ کی شخصیت عجائب روزگار میں سے ہے سنہ ۱۹۰۷ء میں دار العلوم سے فارغ التحصیل ہوئے سعد پاشا زغلول نے اپنی وزارتِ معارف کے زمانے میں جن طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مصر سے باہر بھیجا تھا ان میں ایک جاد المولیٰ بھی تھے چنانچہ یہ کامل تین برس تک رِڈنگ کے یونیورسٹی کالج میں تعلیم حاصل کرتے رہے سنہ ۱۹۱۰ء کے اوائل

میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں ادبِ عربی کے معین الاستاذ مقرر ہوئے ۱۹۱۳ء کے اواخر میں مصر واپس تشریف لائے اور وزارت امور عامہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۹۱۶ء میں دیوان عالی کی ملازمت اختیار کی اور ۱۹۲۲ء تک نہایت خلوص و دیانت سے شاہی خاندان کی خدمت میں مصروف رہے۔ آخر وزارتِ معارفِ عمومی میں مفتش کے عہدے پر فائز ہوئے۔

میرے امتحان کے لیے جامعہ مصریہ نے استاذ عبدہٗ خیر الدین کے ساتھ انھیں بھی بلایا تھا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ جناب موصوف غزالی کی حمایت میں میرے خلاف آگ بگولہ ہو رہے تھے جن جن امور میں میں نے غزالی پر کڑی تنقید اور نکتہ چینی کی تھی اُن میں سے ہر ایک کے سلسلے میں مجھ سے مفصل بحث و مناقشہ کیا۔ امتحان کے بعد مجھے خیال آیا کہ غزالی کے باب میں ان سے نئے سرے سے گفتگو ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اس مقصد سے میں ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا کمالِ شفقت و رافت سے پیش آئے اور ۱۹۱۸ء میں غزالی پر جو لیکچر انھوں نے دیے تھے وہ سب مجھے دکھائے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ وہ جدید و قدیم اکثر فلاسفہ پر غزالی کو ترجیح دیتے ہیں۔

جناب جاد المولیٰ بک کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کو تصوف سے بے حد نفع و فائدہ پہنچا اور اس افادیت میں سب سے بڑا حصہ غزالی کا ہے۔ اس دعویٰ پر دلائل پیش کرتے ہوئے انھوں نے اُستاذ غراوی بک کی کتاب الغرائز کا حوالہ دیا جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"صوفی اور معلّم کی حیثیت یکساں ہے جس طرح ایک معلّم کا فرض ہے کہ متعلّم کی ناپسندیدہ غرائز کا استیصال کرے اور پسندیدہ غرائز کو نافع و مفید پہلوؤں کی طرف راجع کرے اسی طرح ایک صوفی کا اولین فرض ہے کہ وہ مریدوں کی حرکات پر شدت سے نگاہ رکھے کیوں کہ تصوف نام ہے ریاضت و مجاہدۂ نفس کا۔"

باوجودیکہ غزالی کی ساری عمر تصوف کی خدمت و چاکری میں بسر ہوئی لیکن تعجب ہے

کہ جناب جاوداں کو مجددین کے زمرے میں شمار کرتے ہیں، میں نے اُن سے دریافت کیا کہ غزالی کی اس تجدید کا معنی کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ اسلامی افکار و نظریات کی سرگرمی اور ذہنی سے نشر و اشاعت جنھیں اُنھوں نے حق اور صحیح سمجھا اور جنھیں فلسفے کا ہاتھ اُس زمانے میں فنا کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا۔

(۵)

شیخ عبدالعزیز جاویش کی رائے

شیخ عبدالعزیز جاویش اس زمانے میں ایک قائد و امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلامی ممالک میں سے کوئی ملک کم ہی ایسا ہو گا جس تک اُن کا نام نہ پہنچا ہو۔ فلسفہ و تشریع میں ان کے ابحاث و مقالات لاجواب ہیں۔ جلا وطنی کے مصائب جھیلنے کی وجہ سے انھیں مختلف امم و اقوام کے طبائع و رجحانات سے بخوبی واقفیت ہو گئی ہے۔ گذشتہ جنگ عمومی میں انگریز انھیں اپنا بدترین دشمن سمجھتے اور انھیں ایک خطرناک اور دہشت انگیز انسان کہتے تھے۔

شیخ جاویش غزالی کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں، وہ غزالی کی قوت و متانت کا لوہا تو مانتے ہیں لیکن اس بات سے بہت متعجب ہوتے ہیں کہ غزالی جب فن حدیث سے بالکل جاہل اور بے خبر تھے تو انھیں لوگ مجتہد مطلق کا مرتبہ و مقام کیسے دیتے ہیں۔ غزالی کی تنہا اس ایک خامی نے ان کی تمام قیمت و شخصیت اور عمومیت و افادیت پر پانی پھیر دیا ہے۔ ساتھ ہی شیخ موصوف کہتے ہیں کہ غزالی کے نظریات باہم متناقض و متعارض ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی آراء کی تجدید و تنویع انتہائی مشکل ہے۔ بعض اوقات وہ ایک ہی کتاب میں مختلف قسم کی باتیں لکھ جاتے ہیں۔ اُن کی تصنیفات میں ایک بھی ایسا قول نہیں ملے گا جسے ایک مرتبہ رد کرنے کے بعد دوسری جگہ اُسی کو ثابت نہ کیا ہو۔

---

(۶)

کونت دی جالارزا

کونت دی جالارزا کامل چھ برس تک جامعہ مصریہ میں فلسفے کے استاذ رہے لطافت و عمدگی اخلاق میں اپنی نظیر آپ ہیں فلسفے میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں لیکن اندازِ تحریر نہایت گنجلک اور پیچیدہ ہے بعید نہیں کہ اس کا باعث عربی زبان سے اجنبیت اور بیگانگی ہو۔

کونت دی جالارزا غزالی کے انتہائی مؤید و مداح ہیں اور انھیں مسلم فلاسفہ کے روحِ رواں سمجھتے ہیں صرف غزالی کی ایک ادا ایسی ہے جو انھیں بھی نہیں بھاتی اور وہ ہے خود علوم کے تمام سرچشموں سے سیرابی کے باوجود دوسروں کو ان سے سیراب نہ ہونے کی نصیحت وتلقین۔ کونت موصوف کا خیال ہے کہ اس قدغن کی وجہ سے جہاں غزالی نے بہت سے نااہل لوگوں کو علم سے مایوس کر دیا وہاں اس کی بدولت بہت سے اہل لوگوں پر بھی علم کا دروازہ بند کر دیا لیکن بہرکیف غزالی کے خلوص پر وہ کامل ایمان ویقین رکھتے ہیں۔

(۷)

ڈاکٹر عنانی کی رائے

ڈاکٹر عنانی موجودہ عصر کے کبارِ علماء میں سے ہیں۔ تقریباً دس برس تک جرمنی میں مقیم رہ کر فلسفے کا گہرا اور عمیق مطالعہ کیا۔ آج کل جامعہ مصریہ میں پروفیسر ہیں۔

اسلامی فکر و تخیل کے ارتقائی پہلو کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب غزالی کے متعلق ایک خاص نظریہ اور ایک خاص رائے رکھتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ ابتداء میں فکرِ اسلامی کا سارا مدار وحی پر تھا۔ اس کے بعد عقل نے اس بہانے راہ پائی کہ میں وحی کا موضح ومفسر اور ترجمان ہوں لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے آزادی واستقلال کا علم بلند کر دیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر غزالی ضبط نہ کر سکے اور خم ٹھونک کر اس کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور فلاسفہ سے اس شدت کے ساتھ نبرد آزما ہوئے کہ ان کے چھکے چھڑا دئے اور مشرق میں ان کا نام ونشان

تک باقی نہ رکھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فلسفے نے بھی دستِ ستیزہ بپائے گریز کو ترجیح دی اور بھاگ کر اعتزال کے دامن میں جا پناہ لی جہاں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُس کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔

ڈاکٹر عثمانی کا خیال ہے کہ غزالی نے فلاسفہ سے جنگ کا آغاز رائے عامہ کی تقلید و اتباع سے کیا تھا لیکن آگے چل کر یہی اُن کا پختہ نظریہ ہو گیا اور انھوں نے اپنے آپ کو عقل کے لئے سرتاپا جنگ اور مبادی روحیہ کے لئے سرتاپا صلح کے قالب میں ڈھال لیا۔ ڈاکٹر صاحب ابن تیمیہ کی اس رائے سے بھی متفق نہیں ہیں کہ غزالی آخر میں پھر ظاہر شرع کی طرف عود کر آئے تھے کیونکہ تصوف کا جو رنگ اُن پر چڑھ چکا تھا اُس کا کسی صورت بھی اترنا ناممکن بلکہ محال تھا، ہاں البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ غزالی کے بعض نظریات یقیناً ایسے تھے جنھیں وہ لوگوں سے چھپاتے اور کسی کے سامنے ظاہر نہ کرتے تھے۔

(۸)

شیخ عبدالوہاب نجار کی رائے

شیخ عبدالوہاب نجار کا وجود مغتنماتِ روزگار میں سے ہے۔ جدید و قدیم تمام علوم پر ان کی نگاہ تقریباً حاوی ہے۔ روحِ عرب و اسلام کو اُن سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ غزالی کی تالیفات کا انھوں نے بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ احیاء العلوم کے بعض مقامات پر انھوں نے بہت مفید حواشی لکھے ہیں جنھیں ہم نے بھی کہیں کہیں فٹ نوٹ میں درج کیا ہے۔ غزالی کے بارے میں اُن کی رائے حاصل کرنے کے لئے جب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا کہ غزالی نے اکثر اوقات میں موسیقی و غناء کی تحریم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور تم نے اس پر تنقید کی ہے افسوس ہے کہ میں اُس پر کوئی نوٹ نہ لکھ سکا۔ شیخ موصوف کا خیال ہے کہ جب کوئی موجبِ تحریم موجود نہ ہو تو غزالی کی رائے درست ہے کہ اس حالت میں غناء کو مباح ہی قرار دیا جائے کیونکہ گانے کا پیشہ بہرحال پیٹ پالنے کا ایک بہانہ ہے بالخصوص

جب موسیقار کے لئے اور کوئی چارۂ کار نہ رہے۔

غزالی کے بارے میں شیخ نجار کی رائے نہایت معتدل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بحیثیت مجموعی غزالی کی شخصیت بے نظیر اور بے مثال ہے۔ ان کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کہ ان کی آرار باہم تناقص ہیں مبالغہ سے خالی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ غزالی نے ہر چیز پر مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالی ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر مصنف کے سن وسال کے تغیر و اختلاف کو بھی اس کی آرار کے تغیر میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ البتہ غزالی کو صوفیہ کے مشرب کی متابعت و پیروی میں جو والہانہ غلو ہے اُسے شیخ نجار بہ نظر استحسان نہیں دیکھتے مثلاً غزالی کہتے ہیں کہ اگر کوئی درویش حالت وجد میں اپنے کپڑوں کو ایسا چور چور پھاڑ ڈالے کہ ان سے دوسرے کپڑوں کو پیوند لگائے جا سکیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں شیخ نجار کہتے ہیں کہ ایسا درویش دو حالتوں سے خالی نہیں یا حالت سکر میں ہے یا حالتِ صحو میں اگر حالتِ سکر میں ہے تو معذور ہے اور حکم شرعی سے خارج، اگر حالت صحو میں ہے تو اس کی یہ حرکت دیوانگی اور جنون کی شعر ہے کیوں کہ کپڑوں کو ایسے خاص طریق سے پھاڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پھر ہم ان کے ٹکڑوں سے دوسرے لباس کو پیوند لگاتے پھریں یہ صاف اسراف ہے، اتلاف ہے۔

(۹)
شیخ حسین والی کی رائے

شیخ حسین والی مشاہیر وکبار علما میں سے ہیں۔ وضاحت وحسن بیان ان کی تصنیفات کا خاصۂ لازمہ ہے۔ بالخصوص کتاب التوحید جو ابھی چند برس ہوئے شائع ہوئی ہے۔ اگر انتظامی مشغولیتیں ان کے سلسلہ تصنیف میں حارج ومانع نہ ہوتیں تو علم اصول، توحید اور اخلاق میں متقدمین کی آرار کو ان سے بہتر کوئی شخص قلمبند نہیں کر سکتا تھا۔

شیخ حسین والی غزالی کے پرجوش مؤیدین میں ہیں۔ ان کے متصوفانہ نقطہ نظر کی طرف سے بھی وہ بڑی سختی سے دفاع کرتے ہیں کیوں کہ شیخ موصوف کی رائے میں تصوف بھی اصولِ

اسلامی کے حدود سے خارج نہیں ہے۔ احیاء میں جو کہیں کہیں بظاہر کچھ مبالغہ و غلو نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غزالی جن مقاصد کی طرف داعی ہیں انھیں سامع و قاری کے ذہن و دماغ میں پوری طرح راسخ و جاگزیں کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ غزالی کی تالیفات کا مقصد کسی خاص جماعت و گروہ کو خطاب کرنا نہیں بلکہ ان کا خطاب تمام اصناف خلق کو عام ہے یہ اور بات ہے کہ ہر گروہ بقدر استعداد و بساط اُن کی تالیفات سے متمتع و بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ ضعیف احادیث کے وارد کرنے میں بھی یہ غزالی کو معذور سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اپنے زاویۂ نگاہ کو ثابت کرنے کے لئے جس قسم کی احادیث سامنے آئیں غزالی انھیں برابر درج کرتے چلے گئے۔ غزالی جیسے دیانت و امانت اور خلوص و للّٰہیت کے پیکر مجسم کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انھوں نے جان بوجھ کر ضعیف احادیث کو کتابوں میں درج کر دیا ہے عقل اور قیاس دونوں سے بعید ہے۔

(۱۰)

شیخ عبدالباقی سرور کی رائے

شیخ عبدالباقی سرور ان افاضل و جامع معقول و منقول علماء میں سے ہیں جنھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق تالیف "ماضی الاسلام وحاضرہ" جو جریدۂ انوکار میں شائع ہوئی ہے اس عصر کی چوٹی کی کتابوں میں سے ہے۔ کوئی کم ہی ایسی نئی کتاب شائع ہوئی ہوگی جو ان کی نگاہ سے نہ گذری ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علمی اور فکری حرکت پر ان کی نگاہ بہت غائر اور وسیع ہے۔ سیاست، فلسفہ اور اجتماع کے عالم میں جو نت نئے نظریے وجود میں آتے رہتے ہیں اُن سے بخوبی واقف و آشنا ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے مذہب اور وطن کے بارے میں نہایت پر حمیت اور غیور ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ عمدہ اخلاق و عادات کا ایک زندہ نمونہ و مثال ہیں۔

شیخ عبدالباقی کی رائے ہے کہ غزالی کا کوئی متعین مشرب نہیں جس نظریے کی طرف سے

دفاع مقصود ہو اُسی نوع کا وہ ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آرا میں بظاہر ایک تناقض اور تباین نظر آتا ہے۔ مذہب پر فلسفے کے حملے کو دیکھ کر انھوں نے معتزلہ، اشعریہ اور کرامیہ غرضیکہ تمام گروہوں سے علمی اور فکری اسلحہ مستعار لے کر فلاسفہ کا مقابلہ کیا ہے۔ شیخ صاحب کی رائے ہے کہ غزالی کی کتب میں تصوف کا حصہ عوام کے لئے نہیں بلکہ متصوفین کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ آخری ایام عمر میں وہ کتاب و سنت کے مطالعہ کی طرف عود و رجوع کر آئے تھے۔ چنانچہ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ جب اُن کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینے پر رکھی تھی کسی خاص مشرب و رائے کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ و مخصوص نہ کرنا غزالی میں عیب کی نہیں بلکہ خوبی و ہنر کی بات ہے۔ کیونکہ تنہا اسی ایک خوبی کی بدولت انھوں نے اپنے زمانے کے تمام مذاہب و مشارب میں جو قوت و غلبہ کے عناصر ہو سکتے تھے انھیں اپنی ذات میں جمع کر لیا تھا۔ شیخ عبدالباقی کی رائے ہے کہ جن مذہبی تقالید کی گراں باری سے حریت فکر کے کاندھے عاجز آ جاتے ہیں اُن سے نجات کی یہی ایک صورت ہے اور مختلف عقول کی محنت اور جد وجہد کے نتائج و ثمرات سے متمتع و بہرہ اندوز ہونے کی بھی یہی ایک تدبیر ہے۔

(۱۱)
شیخ احمد امین کی رائے

سادہ و بے تکلف الفاظ میں شیخ احمد امین کی سب سے بڑی خوبی و تعریف یہ ہے کہ اُن کا وجود ملک و قوم کے لئے نہایت مفید و سودمند ہے ان کی مصنفہ کتب و رسائل میں ایسی آرا کی کمی نہیں جو طالب و مستفید کے دل و دماغ کو روشن کریں اور ان میں زندگی کا بیج بوتی ہیں مجلس تالیف و ترجمہ میں ان کی حسن کارکردگی سے صاف عیاں ہے کہ وہ علم کے بغیر اپنی قوم کی زندگی کا کوئی معنی و مفہوم ہی نہیں سمجھتے مصر میں آج جو علمی اور فکری رونق و چہل پہل نظر آتی ہے اُس کی تخلیق میں بڑا حصہ اسی مجلس کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

موجودہ نسل پر اس مجلس کے ارکان کا کرم و احسان نہایت عظیم اور قابلِ صد قدر ہے۔

شیخ احمد امین کی رائے ہے کہ غزالی نے لوگوں کی نگاہوں کو فلسفے سے ہٹا کر کتاب و سنت پر مرکوز کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ صوفیہ اور تصوف کا نام روشن کرنے اور لوگوں میں انہیں مقبول بنانے میں بھی بڑا ہاتھ غزالی کا ہے۔ عوام کی ترغیب و ترہیب کے لئے انہوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ واقعی نہایت موثر و کارگر ہے لیکن ساتھ ہی ہماری اس رائے سے بھی متفق ہیں کہ غزالی نے شکوک و شبہات کے مرض سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی عمدہ علاج تجویز نہیں کیا۔ علم اخلاق میں اُن کے نظریات موجودہ زمانے میں کسی صورت مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جدید تہذیب و تمدن تنازع للبقا کا طالب ہے اور غزالی ہر شخص کو عافیت و سلامتی کے کوچے کی سیر کرانا چاہتے ہیں۔

اسلام اور اخلاق

حاسد اور بداندیش لوگوں نے میرے متعلق مشہور کر رکھا ہے کہ میں کہتا ہوں اسلام کو اخلاق سے زیادہ اپنے زورِ بازو اور قوتِ شمشیر پر ناز ہے۔ اگر مصر میں اصلی اور جعلی، کھرے اور کھوٹے کی نقد و تمیز اور پرکھ کا ملکہ مفقود نہ ہوتا تو اتنے بڑے جھوٹ کو اس سرزمین میں کبھی ایسا بڑا قبول و فروغ حاصل نہ ہوتا، یہ دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا لیکن کسی کی طرف سے اس پر قبولیت کا دروازہ وا نہ ہوتا۔ بھلا اس بات کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے کہ مجھ جیسا شخص جس نے زندگی کے کامل پندرہ برس ازہر میں بسر کیے ہوں وہ جامعہ مصریہ میں عوام کے سامنے اس حکم و فیصلہ کی جرأت کر سکتا ہے کہ مذہب اسلام کو اخلاق سے کوئی لگاؤ اور کوئی تعلق ہی نہیں آخر میں اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ اگر میں یہ بات کہوں گا تو ازہر کے طلبہ اور اساتذہ کے وہ تشونِ قاہرہ جو میرے انٹرویو کے دن جامعہ مصریہ میں موجود تھے میرے دفاع و مقابلہ اور ردّ و ابطال پر تل جائیں گے

لیجئے اب میں ساری حقیقت حال و واقعہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں تاکہ آپ خود اندازہ

کر سکیں کہ افترا پردازوں نے میری اصلی اور صحیح باتوں کو کس طرح توڑ مروڑ اور مسخ کرکے لوگوں میں میرے خلاف پروپیگنڈا کیا۔

میں نے اپنی کتاب میں ایک مقام پر کہا ہے کہ :-

"غزالی نے توکل کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ واقع میں رہبانیت، لوگوں سے قطع علائق، آہستہ آہستہ بھوک اور پیاس کی خوگری اور موت و ہلاکت کو بھی من جملہ نعمتوں کے ایک نعمت قرار دینے کی طرف دعوتِ صریح ہے۔"

اس پر حضراتِ ممتحنین نے کہا کہ غزالی کی تحریروں سے اس کا ثبوت پیش کیجئے۔ میں نے فوراً غزالی کا یہ قول اُن کے سامنے رکھا۔

"اگر تم اس شخص کے متعلق میری رائے دریافت کرو جو شہروں اور آبادیوں میں رہ کر بھی اپنی روزی کمانے کے لئے ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا کہ آیا اُس کا یہ فعل حرام ہے یا مباح ہے یا مستحب تو یاد رکھو اُس کا یہ فعل حرام کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ زادِ راہ کے بغیر دشوار گذار جنگلوں اور صحراؤں کا سفر اگرچہ ایک گونہ موت و ہلاکت کی طرف قدم بڑھانے کے مرادف ہو کر بھی حرام نہیں ہے تو ایسے شخص کا رزق کمانے سے کنارہ کشی کرنا جو انسانوں ہی کی آبادیوں میں موجود رہے موت و ہلاکت کے مرادف یا با الفاظِ دیگر ممنوع و حرام کیسے ہو سکتا ہے۔ بلکہ بعید نہیں کہ سعی و طلب کے بغیر ہی رزق اُس تک برابر پہنچتا رہے اور فرض کیجئے کہ رزق کے آنے میں کچھ دیر یا تاخیر ہو جائے تو وہ اس اثنا میں صبر کر سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص گھر کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہے کہ اُس تک کسی کی رسائی ہی ممکن نہ ہو تو یقیناً یہ رویہ حرام ہے۔ اگر کوئی شخص گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا رہے اور عبادت و ریاضت سے کوئی تعرض و اعتنا ہی نہ کرے تو اُس کے لئے مناسب اور بہتر یہی ہے کہ روزی کی تلاش و جستجو میں گھر سے باہر نکلے لیکن فرض کیجئے کہ بے کار رہنے کے باوجود باہر نہیں نکلتا تو بھی اُس کا یہ فعل اس وقت تک حرام نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بھوک سے نڈھال اور لاچار ہو کر جاں بلب نہ ہو جائے

کیوں کہ اس حالت میں گھر سے نکلنا محنت و مزدوری کرنا یا کسی سے کچھ مانگنا اُس پر فرض اور ضروری ہو جاتا ہے۔"

میں اس امر کے اعتراف میں کوئی مضائقہ اور باک محسوس نہیں کرتا کہ میں نے اس مقام میں غزالی پر بہت کڑی اور تلخ تنقید کی ہے۔ اور گھر سے سفر کے لئے نکلتے وقت متوکل کے جو آداب انھوں نے بیان کئے ہیں میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے اُن کا مذاق اُڑایا ہے مثلاً مسافر کو وہ تلقین کرتے ہیں کہ سفر میں جاتے وقت گھر میں کوئی ایسی چیز نہ چھوڑے جس کے چوری ہو جانے کا کھٹکا ہو۔ جب اُس کی کوئی چیز چوری ہو جائے تو اُسے بجائے ملول ہونے کے اُلٹا خوش ہونا چاہئے اور چور کو بد دعا نہیں دینی چاہئے۔ اگر اُس نے جزع فزع کی یا چور کو بُرا بھلا کہا تو اُس کا جذبہ توکل باطل ہو جائے گا۔" آخر میں اُسے نصیحت کرتے ہیں کہ

"تمہیں چور کی اس حرکت پر اس لئے مغموم ہونا چاہئے کہ اُس نے اپنی ذات کو اللہ کے قہر و عذاب کے لئے پیش کیا ہے اور اپنے معاملہ میں اس لئے خوش ہونا چاہئے کہ اللہ نے تمہیں ظالم نہیں بنایا بلکہ مظلوم بنایا ہے۔"

ان مردہ و بے جان اور کہنہ و فرسودہ آداب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ معلوم نہیں غزالی کو یہ بات کیوں نہ سوجھی کہ وہ مسافر کو نصیحت کریں کہ گھر سے جاتے وقت مکان کے باہر ایک تختی لٹکا جائے جس پر جلی اور واضح حروف میں لکھا ہو کہ

"جو شخص اس گھر سے کچھ چرائے گا وہ بجائے مجرم و گنہگار ہونے کے معصوم و بے تقصیر بلکہ ماجور و مثاب ہوگا کیونکہ اُس نے صاحب خانہ کو ایک بہت بڑی نیکی کا موقعہ دیا ہوگا۔"

میری یہ بات سن کر تمام علماء مارے غصے کے جل بھن گئے۔ شیخ لبان نے کہا کہ:-

"دین اسلامی چونکہ مجموعۂ اخلاق کا نام ہے اس لئے غزالی کی اس تلقین میں کوئی عیب اور کوئی قباحت نہیں"

میں نے کہا کہ دین اسلامی مجموعۂ اخلاق ہونے سے پہلے فتح و غلبہ اور جبر و قوت کا دین ہے، نیز یہ کہاں کا معیارِ اخلاق ہے کہ کوئی شخص سفر کو جاتے وقت چوری کے کھٹکے سے ایک سوئی بھی

گھر میں چھوڑ کر نہ جائے۔ آپ ہی بتایئے کہ میں نے کچھ غلط کہا؟

معلوم ہوتا ہے کہ حضراتِ علما، مذہب اسلام کو مذہب فتح و غلبہ کہنے سے غالباً ہچکچاتے اس لئے ہیں کہ اُن کے ہاں فتح و غلبہ سے مراد ظلم و تخریب اور شکست و ریخت ہے۔ حالاں کہ حاشا و کلا ایسا نہیں۔ اے گروہ علما! چاہے تمہیں پسند ہو چاہے ناپسند لیکن واقعہ یہی ہے کہ مذہب اسلام دین فتح و غلبہ ہے۔ دین فتح و نصرت ہے۔ ہاں اس سے انکار نہیں کہ اس فتح و ظفر کے لئے دین حنیف نے کچھ شروط و آداب بھی مقرر کئے ہیں جن کا ہر حال میں پاس و لحاظ رکھنا انتہائی لازمی و ضروری ہے۔ تم فتح کے نام سے چڑتے اس لئے ہو کہ غیر مسلموں نے تمہارے ذہن و دماغ میں یہ زہر بھر دیا ہے کہ اسلام قناعت اور کم سے کم تر پر رضامندی و اکتفاء اور صبر و شکر کا داعی و معلم ہے لیکن یاد رکھو یہ فاش غلطی ہے کیونکہ تمام مذاہب میں سے تنہا اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ترک دنیا اور گمنامی و خمول کا جانی دشمن ہے اور اپنے پیروؤں کو اس امر کی شدت سے تلقین کرتا ہے کہ وہ قوت و غلبہ سے سارے کرۂ ارضی پر چھا جائیں اور یہ تعلیم کوئی مذموم نہیں بلکہ قابلِ قدر و قابلِ تعریف ہے۔ تاریخ کے صفحات ایسی قوم کے ذکر و بیان سے خالی ہیں جس نے قوت و زورمندی کے باوجود زندگی کے بارے میں اپنے نظریات و مقاصد کو محدود و تنگ کر دیا ہو۔ البتہ تاریخ میں ایسی اقوام کا ذکر موجود ہے جن کو تنگ حوصلگی اور تنگ نگاہی کی پاداش میں زمانے کے ہاتھ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا۔

تم یقیناً کہو گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے مجاہدین کو دوسرے مذاہب کے پیشواؤں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے برعکس ان کے ساتھ شفقت و رأفت اور نرمی و حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ اس سے کہیں اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ اسلام کو فتح و غلبہ سے کوئی تعلق اور کوئی لگاؤ ہی نہیں بلکہ اس سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنی فتوحات کا آغاز خونریزی و سفاکی اور

لوگوں کی نفرت وحقارت سے کرنا نہیں چاہتا اور اگر تم غور کرو تو ان ضعفائے کفار کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین بھی فی الواقعہ بہت بڑی مصلحت وتدبیر پر مبنی ہے۔ اسلام کی کامیابی کا سارا راز ہی اس میں مضمر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کمالِ حکمت و موعظت کے ساتھ اللہ کی راہ کی طرف دعوت دی۔

یہ جو میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ مذہب اسلام مذہبِ فتح وغلبہ ہے، مذہب فتح وتسخیر ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج دوبارہ دنیا میں تشریف لاتے تو تمہاری ذلت وخواری کو دیکھ کر اپنے دامن کو آنسوؤں سے تر بتر کر لیتے اور علماء کو وہ شدید سزائیں دیتے کہ جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور بچوں کے بال سفید ہو جاتے ، اے غلط نگر واے غلط کار و! کیا تم خیال کرتے ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ کا معنی ومفہوم خدانخواستہ یہ ہے کہ وہ ہم میں اُن مردہ وبے جان وبے روح آداب کو رائج کرنا چاہتے تھے جن کی طرف سے غزالی اور ان کی طرح کے دوسرے لوگوں نے صبر، توکل اور گمنامی کے ابواب میں دفاع کیا اور موجودہ دور کے علماء نے بھی نہایت ڈھٹائی اور بے دلی سے کام لے کر انہیں کی تقلید واتباع پر اپنا سارا زور اور ساری قوت صرف کر دی۔

مجھے توکل کی خوبی سے انکار نہیں بلکہ انکار ہے اُس کے قرار دادہ مزعومہ معنی ومفہوم سے کیا تم سمجھتے ہو کہ توکل نام ہے من جملہ منغصات کے ذلت وموت کو بھی ایک غنیمت ونعمت سمجھنے کا؟ یاد رکھو ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ توکل نام ہے اللہ کے بھروسے اور اعتماد پر شدائد کے طوفانوں میں مردانہ وار گھس جانے کا وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ صبر بھی یقیناً ایک فضیلت ہے لیکن کاہے پر؟ ظلم وستم اور ذلت ورسوائی کے سہنے پر؟ نہیں نہیں بلکہ جہاد فی اللہ کی راہ میں شدائد ومصائب اور رنج ومحن پر، گمنامی بھی ایک خوبی ہے لیکن انہی معنی میں کہ تم کام کیے جاؤ اور نام ونمود سے کوئی غرض نہ رکھو۔ غزالی کا یہ کہنا کہ بعض علماء کے حلقۂ درس

ہیں جب تین سے زائد طلبہ جمع ہو جاتے تو وہ درس نہ دیتے اور اُٹھ کر چلے جاتے تاکہ شہرت نہ ہو یہی
سے بچ کر گمنامی کے گوشۂ سلامتی میں پناہ لیں تو یاد رکھو کہ یہ ایک منفی تدبیر ہے، اپنے فرض سے فرار
ہے وظیفۂ منصبی سے اغماض ہے۔ اخلاق جیسے حسین اور عمدہ امور سے ایسی باتوں کو کیا تعلق؟ کیا سرکار؟
تعجب کی بات ہے کہ علماء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے زہد و قناعت کی
مثالیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں لیکن شاید انہیں اس بات کا علم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم اور آپ کے خلفاء کا زہد و ترک دنیا ایک وقتی ضرورت و مصلحت کے تحت تھا۔ آج ہم اپنی آنکھوں
سے دیکھ رہے ہیں کہ عوام اُن قائدین و رؤسائے حکومت کو نہایت نفرت و حقارت کی نگاہوں
سے دیکھتے ہیں جنھوں نے اپنے گرد سونے چاندی اور دولت و تمول کا ایک حصار قائم کر لیا ہے
بعید نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی نکتۂ مصلحت کی بنا پر دولت و ثروت سے کنارہ کشی
کی ہو۔ فرض کیجیے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوتے جس کی سیاست
کی باگ ڈور کسی دوسرے شخص کے ہاتھ میں ہوتی تو یقیناً آپ بھی اپنے مال اور جائداد کو بڑھانے
کے لیے تمام ممکن اور جائز تدبیریں سوچتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ایک سے
زائد ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ دنیا کو نہایت عزت و محبت کی نگاہ سے
دیکھتے تھے۔ اگر میری اس بات کا یقین نہ آئے تو قرآن کریم کی اس آیت کریمہ پر نگاہ کیجیے۔ رَبَّنَا آتِنَا
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اگر دنیا ایسی ہی حقیر و بے مایہ چیز تھی تو
کہنا چاہیے تھا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَتَيْنِ یا حَسَنَات دنیا کی عزت و جلالت
شان کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اس کو آخرت کے ساتھ مساوی و ہم پلہ
قرار دیا گیا ہے۔
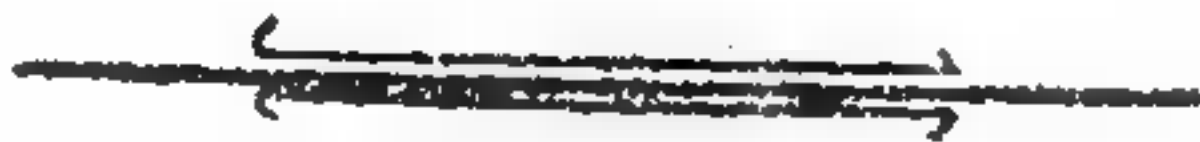
خاتمہ کتاب

غزالی کے تصورِ اخلاق کو اس بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد اب میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اگر چاہیں تو میری اس تنقید کی صحت و قوت کو پرکھنے کے لئے احیاء العلوم کتاب المیزان، کتاب المنہاج، کتاب المستصفیٰ یا اُن کے علاوہ دوسرے اُن ماخذ و مصادر کی طرف رجوع فرمائیں جن کو میں نے فہرست مراجع میں بیان کیا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ بعض مقامات میں غزالی پر تنقید کے وقت میرا لب و لہجہ نہایت شدید اور تلخ ہو گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں اس امر کی بھی بجا طور پر توقع رکھوں گا کہ غزالی کی جن خوبیوں کو میں منظر عام پر لایا ہوں انھیں بھی آپ خاص طور پر نگاہ میں رکھیں گے جن لوگوں نے اس کتاب کے بعض مقامات کی وجہ سے میری مذمت و مخالفت پر کمر باندھ لی ہے انھیں بھی میں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ مجھے اُن کے رد و قبول کی ایک حبہ بھر بھی پرواہ نہیں میرا نصب العین صرف ایک ہے اور وہ ہے لوگوں کی خاطر نہیں بلکہ اللہ کی خاطر علم و ادب اور تاریخ کی خدمت و جاکری۔

میں اس بات کا ذکر بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ اساتذہ نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ جن مسائل کی وجہ سے لوگ میری دشمنی و مخالفت پر کمربستہ ہوئے ہیں انھیں کتاب سے حذف و خارج کر دوں لیکن افسوس ہے کہ میں اُن کی نصیحت و مشورہ پر عمل نہیں کر سکا۔ البتہ جن مسائل کا ابہام اور اجمال غلط فہمی کا موجب ہو سکتا تھا اُن کو میں نے اور واضح و مفصّل کر دیا ہے۔ لہٰذا مجلس امتحان پر اب کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ سارے امور کے لئے اب مسئول و جوابدہ صرف میری ذات اور تنہا میری ہی ذات ہے۔

آخر میں میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ علم اور مذہب کی جو میں نے بے لوث اور بے لاگ خدمت کی ہے اس کے حسنِ صلہ و جزا سے مجھے نوازے۔ انسانوں سے کسی مزد و صلہ یا مدح و ستائش کا میں ہرگز طلبگار نہیں کیوں کہ ان کی تو مٹی اور خمیر میں کفرانِ نعمت اور احسان فراموشی کے اجزا شریک ہیں رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا، رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔

مراجع

اس کتاب کے مصادر دو طرح کے ہیں. عربی اور فرانسیسی. عربی مصادر میں سب سے اہم خود غزالی کی مندرجہ ذیل تصنیفات ہیں۔

(۱) احیاء العلوم
(۲) منہاج العابدین
(۳) الاربعین فی اصول الدین
(۴) میزان العمل
(۵) جواہر القرآن
(۶) الادب فی الدین
(۷) مشکاۃ الانوار
(۸) نصیحتہ الملوک
(۹) المنقذ من الضلال
(۱۰) الجام العوام
(۱۱) خلاصۃ التصانیف
(۱۲) رسالۃ الطیر
(۱۳) کیمیائے سعادت
(۱۴) مکاشفۃ القلوب
(۱۵) قواعد الطریق العشرۃ
(۱۶) الاملاء علی ما اشکل من الاحیاء
(۱۷) الکشف والتبیین
(۱۸) القسطاس المستقیم
(۱۹) مقاصد الفلاسفہ
(۲۰) التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ
(۲۱) الدرۃ الفاخرۃ
(۲۲) المستصفیٰ فی الاصول

مصورة

الامارات اللاتينية في سورية

(بعد)

الحروب الصليبية الاولى

رسمه الشيخ محمد فخر الدين المدرس بمدرسة المعلمين الناصرية

شام میں پہلی صلیبی جنگوں کے بعد لاتینی نشانات